ناول

عزیز احمد

گُریز

ترتیب و تہذیب

ارتضیٰ کریم

عزیز احمد

گریز

(ناول)

ترتیب وتہذیب

ارتضیٰ کریم

تقسیم کار

موڈرن پبلشنگ ہاؤس، A-9، گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی

کتاب : گریز (ناول) از عزیز احمد

ترتیب، تہذیب : ارتضیٰ کریم

ناشر : ارتضیٰ کریم

اشاعت : 2015

قیمت : 350/- روپے

مطبع : ایچ۔ ایس۔ آفسیٹ پرنٹرس، نئی دہلی

تعداد : پانچ سو (500)

GUREZ(Novel) BY AZIZ AHMAD

ISBN 978-81-8042-302-4

YEAR: 2015

RS:350/-

Edited by :

IRTEZA KARIM

Department of Urdu

University of Delhi

Delhi-110007

تقسیم کار:

موڈرن پبلشنگ ہاؤس، A-9 گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی

MODERN PUBLISHING HOUSE

9-A, GOLA MARKET DARYAGUNJ, NEW DELHI-110002

استادِ محترم!

پروفیسر قمر رئیس (مرحوم) کے نام!!

آپ بہت یاد آتے ہیں!

ترتیب

ارتضیٰ کریم

گریز: ناول یا سفرنامہ ناول؟

عزیز احمد نے جب ناول نگاری شروع کی (ہوس: ۱۹۳۲) تو اس وقت تک اردو ناول پر ترسٹھ سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور ان سے پیشتر کم از کم پندرہ ناول نگاروں کے ناول منظر عام پر آ چکے تھے۔ گریز (۱۹۴۳) تک آتے آتے اردو ناول کے سفر میں دس بارہ سال کا مزید اضافہ ہو جاتا ہے اور کچھ اور ناول نگار عزیز احمد کے شریک سفر ہو جاتے ہیں مگر ان میں سے زیادہ تر کی حیثیت تاریخی ہے۔ عزیز احمد کی ادبی حیثیت اور فن ناول نگاری میں ان کی انفرادیت، نیز حیثیتِ واقعی کے لیے ضروری ہے کہ عزیز احمد کے عہد تک کے ناول کے منظر نامے پر ایک سرسری نگاہ ہی ڈال لی جائے۔

مقام شکر ہے کہ ہم اس بات پر متفق ہیں کہ اردو کا پہلا ناول (مراۃ العروس) نذیر احمد نے (۱۸۶۹ میں) لکھا، اس پر بحث ہو سکتی ہے کہ یہ اور ان کے دوسرے ناول زیادہ تر اصلاحی یا اخلاقی درس دیتے ہیں یا نہیں، لیکن بہر حال یہ داستانی اور تمثیلی قصوں سے ذرا الگ ایک نیا ذائقہ ضرور فراہم کر رہے تھے اور رجعۃ الاسلام یا ابن الوقت جیسے کرداروں کے حوالے سے سماج اور شخص کے تضادات کو چھونے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کی زیادہ واضح صورت رتن ناتھ سرشار کے فسانۂ آزاد (۱۸۸۰ء میں پہلی بار کتابی شکل میں شائع ہوئی) میں خوجی اور آزاد کے احوال واقعی سے سامنے آتی ہے مگر فن سے ناواقفیت نے اسے مکمل ناول نہ بننے دیا۔ قمر رئیس نے بجا لکھا ہے کہ:

"سرشار کے ناولوں میں ارضیت اور ایک طرح کی واقعیت کے باوجود عصری زندگی کے حقائق کا وہ گہرا شعور نہیں ملتا جو نذیر احمد کے ناولوں میں نظر آتا ہے۔ سرشار کی نفسیاتی بصیرت بھی نذیر احمد سے کم تر ہے۔ وہ انبوہ کو انسان پر، خارج کو باطن پر، تخیلی جولانی کو فکری گہرائی پر، سرخوشی و سرشاری کو ہوش مندانہ متانت پر، روانی کو ٹھہراؤ اور تفصیل و وضاحت کو ایجاز و اختصار پر ترجیح دیتے ہیں۔۔۔"

ناول نگاری کے منظر نامے پر سرشار کے بعد عبدالحلیم شرر کا نام نظر آتا ہے، انہوں نے نذیر احمد اور سرشار سے منفرد ایک الگ راہ نکالی جسے تاریخی ناول نگاری کا نام دیا جا سکتا ہے — اگر چہ ان کے ناول بھی فن ناول نگاری کے ساتھ کما حقہ انصاف نہیں کرتے لیکن جس زمانے میں شرر نے ناول لکھے، اس عہد کو سامنے رکھیے اور فن ناول نگاری کے سرمایے پر بھی نگاہ کیجئے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے بہر حال اردو ناول کو ایک قدم ہی سہی، آگے کی طرف بڑھانے میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قمر رئیس نے شرر کے ناولوں کے حوالے سے یہ رائے قائم کرنے کے باوجود کہ "اس زمانے میں مولانا شررؔ نے تاریخی ناول لکھ کر نہ تو تاریخ کے ساتھ انصاف کیا اور نہ فن ناول نگاری کے ساتھ" یہ اعتراف بھی کیا کہ:

"اسلام کی بڑھتی ہوئی قوت کے خلاف باطنیہ فرقے کی سازشوں کو مولانا نے جس وقت اور بصیرت کے ساتھ دیکھا اور پیش کیا ہے، وہ ان کے تاریخی شعور اور فنی مہارت کا سب سے دل کش نمونہ ہے۔ مولانا شرر نے اپنے ناولوں میں تکنیک کے بعض تجربے بھی کیے۔ انہوں نے قصہ پر زور دے کر ناول کو دلچسپ اور مقبول بنایا اور شاید یہی ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔"

ان کے بعد منشی سجاد حسین، سجاد حسین کسمنڈوی، محمد علی طبیب، قاضی سرفراز حسین عزمی، مرزا محمد سعید، راشد الخیری جیسے ناول نگاروں کی ایک بڑی تعداد سامنے آتی ہے — مگر مرزا محمد ہادی رسوا کا قد ان سب میں نمایاں اور نکلتا ہوا نظر آتا ہے — غالباً اس کی وجہ یہ رہی ہے کہ مرزا رسوا اپنے پیش رووں میں سب سے زیادہ "ناول کے فن" کی فہم رکھتے تھے۔ ذات شریف (۱۹۲۱) کے دیباچے کے یہ خیالات بھی پتہ دیتے ہیں:

قصہ کہانیوں کے لکھنے والے بھی ایک قسم کے مورخ ہوتے ہیں بلکہ ان کی لکھی ہوئی تاریخ یعنی ان

کا لکھا پورا واقعہ، اس واقعہ نویسی سے جسے تاریخ کہتے ہیں ایک حیثیت سے زیادہ قابل لحاظ اور قدر کے لائق ہے۔ اس لیے کہ ناول نویسی خاص کر شخصیتوں کے اخلاقی یا تمدنی حالات سے بحث کیا کرتے ہیں ممکن ہے کہ ایک شخص کی سیرت میں باعتبار کسی خصوصیت کے کوئی مادہ یا قوت حد اعتدال سے کم یا زیادہ ہو۔ لہٰذا اس شخص واحد کے واقعات اور حالات میں عمومیت نہیں۔"

ناول کے فن کا یہی شعور ان کے ناولوں بالخصوص امراؤ جان ادا کی کامیابی کی دلیل ہے۔ انہوں نے کئی ناول لکھے مگر "امراؤ جان" نے مرزا رسوا اور اردو ناول ہر دو کو ایک شناخت دی۔

پریم چند اپنے پہلے ناول اسرار معابد (۱۹۰۵ / ۱۹۰۳) سے لے کر گئودان (۱۹۳۶) تک اردو کو کئی اہم ناول دے چکے تھے۔ ان کے بیشتر ناولوں میں ہندوستانی تہذیب اور ثقافت کی جیتی جاگتی تصویریں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں اور یہی حقیقت پسندی ان کا طرۂ امتیاز ہے ـــ فنی اعتبار سے بھی، زبان اور اسلوب کے حوالے سے بھی نیز تکنیک اور موضوع کے تعلق سے بھی ان کی ناول نگاری تجربے کے منازل سے بھی گزرتی ہے اور اردو میں ناول نگاری کی روایت کو استحکام بھی بخشتی ہے۔ یوسف سرمست نے بجا لکھا ہے کہ:

> "پریم چند اردو ناول میں ایک عہد کی حیثیت رکھتے ہیں، کیونکہ وہ سارے رجحانات جو ابتدائی بیسویں صدی سے ۱۹۳۶ تک اردو ناول میں رہے وہ کم و بیش کسی نہ کسی صورت میں پریم چند کی ناول نگاری میں نمایاں ہوتے رہے ہیں۔ اس طرح ان کی ناول نگاری ایک پورے عہد کی عکاسی کرتی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ پریم چند کی ناول نگاری اپنے عہد کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی حالات سے راست طور پر وابستہ رہی ہے۔"

اس کا اندازہ عہد پریم چند کے اردو ناولوں پر سرسری نگاہ سے ہی ہو جاتا ہے۔ جن میں موضوعات کا تنوع، تکنیک کے تجربے اور ہیئت کی تبدیلیاں واضح طور پر نظر آتی ہیں۔ یہاں محض چند ناول نگار اور ناولوں کا ذکر ہی کافی ہوگا۔

پریم چند کی ادبی اور تخلیقی زندگی کو اگر بیسویں صدی کی اول کم و بیش چار دہائیوں پر پھیلا کر دیکھیں تو اس عہد کے آخری سرے پر قاضی عبدالغفار اپنے ناول "لیلیٰ کے خطوط (۱۹۳۲)؛ مجنوں کی

ڈائری (۱۹۳۴)؛ کے ساتھ کھڑے نظر آتے ہیں تو مجنوں گورکھپوری اپنے کئی ناول سوگوار شباب؛ سراب؛ باز گشت؛ گردش؛ صید زبوں اور سرنوشت ۱۹۲۴ سے ۱۹۳۲ کے دوران پیش کر چکے تھے ـــ عظیم بیگ چغتائی نے ناول میں مزاحیہ اسلوب کے سہارے سماج کی بے ترتیبی کو پیش کیا تو فیاض علی کے ناولوں "شمیم" اور "انور" نے رومانیت کو ہوا دی۔ اسی زمانے میں ل۔ احمد کی بھی ایک کوشش "فسانۂ محبت" (۱۹۳۵) کے نام سے صنف ناول میں اضافہ کرتی نظر آتی ہے۔ اس دور میں محمد مہدی تسکین، سدرشن، اوپندر ناتھ اشک کے ناول بھی سامنے آتے ہیں۔ عجیب اتفاق ہے کہ ۱۹۳۶ میں پریم چند کا انتقال ہوتا ہے اور یہی سال ترقی پسند تحریک کے باضابطہ آغاز کا بھی ہے ـــ اس تحریک کا سب سے بڑا کارنامہ "حقیقت پسندی" کے رجحان کو فروغ دینا ہے۔ اس رجحان کے نام پر بھی بہت سے موضوعات ناول میں در آئے اور چونکہ حقیقت نگاری کسی حد تک اردو ناول کے لیے روح کی حیثیت رکھتی ہے اس لیے اس باعث صنف ناول اور حقیقت نگاری دونوں کا بھلا ہوا۔ ۱۹۳۶ سے لے کر آزادیٔ ہندوستان (۱۹۴۷) تک کا عہد، جب ادب میں ترقی پسند خیالات کا چرچا عام تھا اور ادب میں مغربی علوم و افکار کے باعث نئے نئے موضوعات اور نئی تکنیک کا در آنا فطری بات تھی۔ ایسے میں سجاد ظہیر کا ناول "لندن کی ایک رات" (۱۹۳۸) ناول میں ایک نئے ذائقے اور تجربے کا پتہ دیتا ہے ـــ عصمت چغتائی ۱۹۴۰ میں ضدی جیسا ناول پیش کرتی ہیں ـــ اور کرشن چندر ۱۹۴۳ میں "شکست" کے ذریعے اردو ناول نگاری میں اپنا اندراج کرا چکے تھے۔

مذکورہ بالا گفتگو کا مقصد صرف یہ ہے کہ عزیز احمد سے قبل کی اردو ناول نگاری کا اجمالی منظر نامہ سامنے آ سکے اور ہم یہ دیکھ سکیں کہ عزیز احمد نے جب ناول نگاری شروع کی یا گریز (۱۹۴۳) تک آتے اردو ناول نگاری کا جو فن انہیں وراثت میں ملا، اس کی صورت حال کیا تھی؟ کہا جا سکتا ہے کہ عزیز احمد کو وراثت میں اردو کے دو بڑے ناول نگار اور ان کی روایت ملی تھی، یعنی مرزا رسوا اور پریم چند، امراؤ جان اور گئودان اور ان سب کے ساتھ اردو ناول کے سات دہوں کا پورا تشکیلی دور۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ عزیز احمد نے ان نقوش پا سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی یا انہیں مٹانے کی ـــ یا انہوں نے ان "نقش پا" میں "دشت امکاں" کی تلاش کی۔

اردو ناول کے مذکورہ بالا پس منظر کی روشنی میں عزیز احمد کی ناول نگاری پر گفتگو آسان ہو جاتی

ہے۔ عزیز احمد نے یوں تو چھ ناول لکھے لیکن "گریز" (۱۹۴۳) اور "ایسی بلندی ایسی پستی" (۱۹۴۷) کو زیادہ مقبولیت بھی ملی۔

گریز — ناول کے حوالے سے عزیز احمد کے تخلیقی سفر کا تیسرا پڑاؤ ہے۔ پہلا ناول ہوس، ۱۹۳۲ میں، دوسرا ناول "مرمر اور خون ۱۹۳۴ میں اور گریز ۱۹۴۳ میں شائع ہوا۔ پہلے اور دوسرے ناول کے درمیان دو سال کا فرق ہے تو دوسرے اور تیسرے ناول میں کم و بیش دس بارہ سال کا زمانی فرق ہے۔ دس بارہ سال کی اس مدت میں ظاہر ہے عزیز احمد کے مطالعے، مشاہدے اور تجربے میں بھی وسعت آئی ہوگی اور ناول کے فنی تقاضے پر بھی عزیز احمد کی گرفت مضبوط ہوئی ہوگی۔ اس کا واضح ثبوت "مرمر اور خون" اور "گریز" کی پیش کش ہے۔

گریز — کل چار حصوں اور پندرہ ابواب پر مشتمل ناول ہے۔

پہلے حصے میں چار، دوسرے میں چھ، تیسرے میں چار اور آخری یعنی چوتھے حصے میں ایک باب ہے۔ ان ابواب کے مختلف عنوان ہیں۔ مثلاً:

پہلا حصہ اس طرح ہے:

پہلا باب: بخار، دوسرا باب: نعیم کی ڈائری کے کچھ اوراق،

تیسرا باب: ایشیا، افریقہ، یورپ، چوتھا باب: عادل

دوسرا حصہ ان ابواب پر مشتمل ہے:

پانچواں باب: گل سرخ، چھٹا باب: انتظار

ساتواں باب: عشق کی تقسیم آٹھواں باب: انتخاب،

نواں باب: امریکہ کا ایک طیارہ، دسواں باب: گریز

تیسرے حصے کے ابواب یوں ہیں:

گیارہواں باب: نوروز، بارہواں باب: رقابت

تیرہواں باب: تاج پوشی، چودھواں باب: آوارہ گردی

چوتھے حصے میں محض دو ابواب ہیں:

پندرہواں باب: "نقش ناز بت طناز، بہ آغوش رقیب" کے عنوان سے ہے۔

اور سولہویں باب کا عنوان: "کوہکن گرسنہ مزدور طرب گاہ رقیب" ہے۔

یہ غالب کی مشہور منقبت ؎

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے، اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

کے درمیان سے لیا گیا ایک مصرعہ ہے۔ جو یوں مکمل ہوتا ہے ؎

کوہ کن، گرسنہ مزدور طرب گاہ رقیب
بے ستوں، آئینہ خواب گران شیریں

گریز دراصل صنف "قصیدہ" کے اجزائے ترکیبی میں سے ایک "جز" ہے۔ جس کے ذریعے قصیدہ گو یا شاعر اپنے ممدوح کی تعریف اور توصیف کے لئے ماحول بناتا ہے اسی لئے گریز کے بعد قصیدے کے اجزائے ترکیبی میں "مدح" اور پھر "حسن طلب" کا مرحلہ آتا ہے۔

نعیم — پورے ناول میں انہیں اجزائے ترکیبی سے گزرتا نظر آتا ہے۔ تشبیب، گریز، مدح اور پھر حسن طلب۔ نعیم کی زندگی میں بلقیس ہوں یا ایلس، میری پاول یا دوسرے کردار، ان کی محبت پہلے تشبیب کی منزل سے گزرتی ہے، پھر بوجوہ "گریز" کی صورت آتی ہے — مگر جلد ہی "نعیم" مدح کے بعد حسن طلب کر بیٹھتا ہے جسے گریز کے بعض ناقدین نے عزیز احمد کے یہاں غالب جنسی رجحان کا نام بھی دیا ہے۔ درج ذیل اقتباس کی روشنی میں آپ بھی کچھ رائے قائم کر سکتے ہیں:

"اس کی قمیص کا ایک بٹن کھل گیا تھا، گردن کے نیچے سینے کی ذرا سی جھلک نظر آئی۔ معلوم ہوتا تھا، بدن کا سارا خون کھینچ کر میرے سر میں پہنچ گیا۔" (ص ۲۵)

☆

میں گیا تو دیکھا مسز چند بستر پر شال سے ڈھکی ہوئی پڑی تھی اور وہ بھی تقریباً مدہوش تھی۔ راجا نے
اس طرح سے لڑکھڑاتے ہوئے کہا: یہ کیا شرارت ہے، تم سے اس وقت آنے کو کس نے کہا تھا۔
میں سمجھا چند ہے۔ میں نے دروازہ کھولا کہ آ اپنی جورو کو دیکھ۔ کل اسے پچاس پاؤنڈ دیئے تھے۔
میں اکیلا بے وقوف ہوں، نہیں تو اس جہاز پر کون سا ہندوستانی لڑکا ہے جس نے اسے چھوا نہ ہو،
کسی نے ایک پیسہ خرچ نہیں کیا۔ میں بے وقوف ہوں، بے وقوف!" (ص ۴۶)

☆

سامنے سے ایک نوجوان ٹھگی سی عورت گذری جس کے بال خشک اور گھونگھریالے تھے۔ نعیم
اس کولاسورس میں بیٹھے بیٹھے تین چار بار سڑک پر اِدھر اُدھر گذرتے دیکھ چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ
رنڈی نہیں ہے کیونکہ ایک بار نعیم کو وہ "کوپول" میں ملی تھی۔ اس نے خود ہی "کماں" کہہ کے نعیم کو
مخاطب کیا تھا۔ نعیم اسے سینما لے گیا اور جب اس کے لئے بھی ٹکٹ خریدنے لگا تو اسے تعجب ہوا۔
سینما میں نعیم نے دست درازی کی تو وہ اسے ٹکٹ کی قیمت سمجھ کے خاموش رہی اور باہر نکل کے
اس نے نعیم کو بتایا تھا کہ وہ پناہ گزین یہودن ہے اور برسلاؤ کی رہنے والی ہے۔ اس نے پھر ملنے
کا وعدہ کیا تھا اور نہیں ملی۔۔۔" (ص:۶۵)

☆

"۔۔۔ اس کے بائیں ہاتھ پر ہروشا بیٹھا تھا اور اب اس نے اچھی طرح محسوس کیا کہ اس کی
دائیں ٹانگ سے چوبیس پچیس سال کی ایک گداز جسم کی عورت کی ٹانگ برابر مس کر رہی
تھی۔۔۔ یہ دیکھ کر اس کی ہمسایہ عورت نے "موسیو" کہہ کے سانڈوچوں کا لفافہ اس کے آگے
بڑھایا۔۔۔ غالباً سانڈوچ لے لینے کی نامحسوس خواہش اس لئے پیدا ہوئی کہ اس طرح اس
عورت سے بات چیت کرنے کا موقع ملے گا یا کم سے کم اس سے نامحسوس ربط اور تعلق بڑھ جائے
گا۔ اس کی ران تو نعیم کی ران سے مس کر رہی تھی اور اگر وہ سانڈوچ لینے سے انکار کر دیتا تو اس
عورت سے ایک طرح کا نفسیاتی بعد پیدا ہو جاتا۔"

☆

"اگلے دن "سرکل آنگلو فرانسیز" نے ناچ اور رات کے کھانے کا انتظام کیا تھا۔ ہروشا
برطانوی تھا نہ برطانوی رعایا اور نہ فرانسیسی، اس ناچ میں مدعو نہ تھا۔ نعیم شاید نہ جاتا۔
لیکن ایک امریکن لڑکی ایلس جو اس کے ساتھ فرانسیسی سیکھ رہی تھی کہہ چکی تھی کہ وہ
شریک ہوگی۔ اس کے علاوہ "گل سرخ" کے وہاں آنے کی بھی اُمید تھی۔

ناچ میں فرانسیسی بہت کم تھے۔ تین فرانسیسی لڑکیاں بڑی خوبصورت تھیں۔ مگر وہ اپنے
ساتھی فرانسیسی لڑکوں کے ساتھ ناچ سے زیادہ کود پھاند اور کشتی میں مصروف رہیں۔
انگریزوں ہی کی تعداد زیادہ تھی۔ کچھ امریکن تھے۔ نعیم نے تقریباً ہر ناچ اپنی امریکی
دوست کے ساتھ ناچا۔ اسی کے ساتھ ناچ کے وقفے میں پھل اور کیک کھائے اور کافی
پی۔

لیکن ایک ناچ ایسا بھی تھا جس میں جو چاہتا دوسرے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اس
کے ساتھ ناچنے والی کو چھین لیتا۔ لال بالوں والا اسکاچستانی لڑکا جس سے نظر ملا کے
اُستانی نے یہ سمجھایا تھا کہ کوارے لاتاں میں زیادہ تر اجنبی لیتے ہیں، برابر "گل
سرخ" میری پاول کا پیچھا کر رہا تھا مگر اور بھی کئی لڑکے بار بار اس سے میری کو چھین
رہے تھے۔ اس نے ایک بار نعیم سے اس کی امریکن دوست ایلس کو چھینا، اس کا بدلہ
لینے کے لئے نعیم نے "گل سرخ" کو اس سے چھینا۔ نہ صرف چھینا بلکہ "گل سرخ"
سے کہا بھی کہ میں آپ سے ایک زمانے سے ملنا چاہتا تھا۔ اپنا تعارف کرایا۔ اتنے
میں وہ چھن گئی۔ نعیم کو پھر اپنی ایلس مل گئی۔ جب وہ دوبارہ چھنی تو اس نے سرخ بالوں
والے اسکاچستانی سے گل سرخ کو پھر چھینا اور محض اسکاچستانی کو جلانے کے لئے جو
پیچھے کسی اور کے ساتھ ناچتا آ رہا تھا کہا: "آپ سے پھر ملنے کی کوئی صورت ہو سکتی
ہے؟"

میری نے کہا۔ "ضرور!"

اس نے کہا۔ ''میں آنسق تیوت میں چائے پیا کرتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں وہاں سے بہتر چائے پیرس میں اور کہیں نہیں ملتی، اگر آپ کو کل فرصت ہو تو پانچ بجے میرے ساتھ چائے پئیں۔'' اتنے میں سرخ بالوں والے وحشی اسکاچستانی نے اس کے شانے کو ٹہوکا دے کے پھر گل سرخ کو چھین لیا۔

لیکن چھنتے ہوئے میری نے کہا۔ ''ضرور!''

اس کے بعد نعیم ایلس ہی کے ساتھ ناچتا رہا۔ ناچ کے خاتمہ پر اس کو ساتھ لے کے مولاں روژ گیا۔ وہاں سے واپس آتے ہوئے ٹیکسی میں خوب بوس و کنار ہوا۔ مگر جب ایلس نے ضد کی کہ وہ سیدھی اپنے بورڈنگ ہاؤس جائے گی تو نعیم اس کو وہاں پہنچا کے، پیچ و تاب کھاتا ہوا، اکیلا اپنے کمرے کو واپس لوٹا۔''

☆

۔۔۔''زمین دوز ریلوے کے اسٹیشن کی سرنگ میں نعیم نے ایلس کا ایک طویل بوسہ لیا۔ اس کے ہونٹ خشک اور گرم تھے۔'' (ص ۸۴)

☆

۔۔۔''ہر نئے مکتب میں پہلا دن بڑا قیمتی ہوتا ہے۔ اس دن اگر کسی ہم جماعت لڑکی کو گانٹھ لیا جائے تو کام مقابلتاً آسان ہو جاتا ہے۔۔۔ اس دوستی کی بنیاد محض یہ امر تھا کہ دونوں کا تعلق متضاد جنسوں سے تھا۔۔۔ تیسرے چوتھے روز ہی بوس و کنار شروع ہو گیا تھا۔۔۔ جب بوس و کنار کے سلسلے کی وجہ سے اجنبیت مٹنے لگی تو وہ نعیم ہی کو خرچ کرنے دیتی۔۔۔ جنسی تعلقات بھی تکمیل کو نہ پہنچ سکے۔ بوس و کنار میں اسے شروع سے انکار نہ تھا لیکن نعیم کی دست درازی دیکھ بھال سے آگے بڑھنے نہ پاتی۔ دو ایک بار جب نعیم نے حد سے تجاوز کرنا چاہا تو وہ اس قدر بگڑ گئی کہ نعیم کو ہٹ جانا پڑا۔''

☆

اس جنسی تشنگی کی وجہ سے نعیم بہت بے چین ہو جاتا۔ بعض وقت وہ یہ بھی چاہتا کہ ایلس کا پیچھا چھوڑ دے اور کوئی اور ایسی لڑکی تلاش کرے جس میں اس کی مدعا برآری آسان ہو۔۔۔۔'' (ص ۸۳)

☆

''۔۔۔ میری پاول سے تنہا ملنے کا ہر موقع اسی طرح نکل جاتا۔ اس لئے نعیم کے لئے اس کی کشش بڑھتی ہی گئی۔ شان نارسائی ہی سے عشق پیدا ہوتا ہے لیکن نعیم کو اپنے جذبات کا کوئی اندازہ نہ تھا کہ یہ محض خواہش ہے یا شوق ہے یا شوق فضول ہے یا انس ہے یا محبت ہے۔ عشق تو یہ ہرگز نہ تھا۔''

☆

''شام کو ہلڈا اگارٹ اپنی بڑی بہن فریڈا اگارٹ کے ساتھ آئی۔ فریڈا اپنی بہن سے بالکل مختلف تھی۔ چھریرا سا بدن، ہلڈا سے زیادہ خاموش، لیکن اس کی آنکھیں مردوں کو اور جنسی سرور کو ڈھونڈتی ہوتیں۔ ہلڈا کے مقابلے میں وہ بہت متمدن معلوم ہوتی تھی اور اس کے کپڑے بھی اس کی خوش مذاقی کے گواہ تھے۔ ان دونوں لڑکیوں نے نعیم کو ہوف برائے ہاوز کی سیر کرائی۔۔۔''

''۔۔۔ نعیم ایک آدھ بار ہلڈا کے ساتھ اور دو تین بار فریڈا کے ساتھ ناچا۔۔ ہلڈا نے دوسرے دن میوزیم ساتھ چلنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن معلوم نہیں دونوں بہنوں نے آپس میں کیا طے کیا تھا کہ بجائے ہلڈا کے فریڈا آئی۔ دن کی روشنی میں اس کا حسن اسی سال نعیم کو ذرا بھی اچھا نہیں معلوم ہوا۔ یہ رات کی بیئر کا نتیجہ ہوگا کہ وہ اس وقت اتنی بھلی اور ''گرم'' معلوم ہو رہی تھی۔۔۔۔ نعیم نے اس (فریڈا) کا منہ اپنی طرف پھیر کے اور آہستہ سے اسے اپنی طرف کھینچ کے اس کے ہونٹوں کا بوسہ لیا جن پر بارش کے قطروں کا مزہ بے نمک سا معلوم ہوا۔ فریڈا نے اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے کہا۔ ''شرارت مت کرو۔ سڑک کی روشنی میں نہیں۔'' (ص ۱۷۲)

☆

چند قدم پیچھے ہٹ کے ایک اندھیری سی گلی میں نعیم نے فریڈ اگارٹ کو پھر لپٹا لیا۔ پانی اسی طرح برس رہا تھا مسلسل اور آہستہ آہستہ۔ اس نے برساتی کے اندر فریڈ اگارٹ کی چھاتیوں پر ہاتھ ڈالا، انہیں سہلایا۔ پھر بوسے لئے اور اسے گوبیلے اشٹراسا اپنی پاس سیان کو چلنے کو کہا۔ فریڈا نے کہا "بہت دیر ہوگئی ہے۔" ایک دو اور بوسوں کے بعد اس نے کہا۔ "اب جاؤ نہیں تو پانی میں زکام ہو جائے گا۔"

☆

"برتھا موقع پا کر ہاتھ پکڑ کے نعیم کو ایک طرف لے گئی۔ "کیا میں وہ دعوت اب بھی قبول کر سکتی ہوں جو تم نے کل دی تھی؟ میں تمہارے فلیٹ میں آ کے ٹھہر سکتی ہوں؟" "بے شک۔ ضرور۔ خوشی سے"۔ اور رات کی اُمید سے نعیم نے اپنے بدن میں خون کی گرمی محسوس کی۔ وان مانن نے میرے ساتھ بڑا کمینہ پن کیا۔ مجھ سے کھانے کے اور کمرے کے کرائے کے پانچ شلنگ لئے اور پھر رات کو۔۔۔۔۔ رات کو میں اپنے آپ کو بچا نہ سکی۔ آخر یہودی ہے نا؟"

☆

اپنے فلیٹ میں پہنچ کے اس نے دو گلاسوں میں کیانتی بھری۔ وقت بے وقت کیانتی سے خاطر کرنا اس کی عادت ثانیہ بن چکی تھی۔ ایک گلاس اس نے برتھا کو دیا۔ برتھا کو پھر اپنی گود میں کھینچ کے بٹھایا۔ برتھا کے پستان بڑے بڑے تھے اور نرم نہیں تھے۔

برتھا نیم دراز حالت میں اس کی گود میں لیٹی ہوئی تھی اور اس کا سنہرے بالوں سے بھرا ہوا سر نعیم کے شانے کا سہارا لگائے ہوئے بڑا خوبصورت معلوم ہوتا تھا۔ نعیم نے اس کا بوسہ لینا چاہا تو اس نے اپنے لب اوپر اُٹھا لئے۔ نعیم نے اسی حالت میں اسے اور اچھی طرح اپنی آغوش کی گرفت میں لے کے اور اس کے سینے پر پنجہ گاڑ کے اس کا بوسہ لیا۔ نعیم کے دانت اس کے دانتوں سے ٹکرائے اور وہ نعیم کی زبان کو چوسنے لگی۔ ٹیل اوور کے نیچے وہ ریشمی زیر جامہ پہنے تھی۔

بے دردی سے، گویا میری کا انتقام لینے کے لئے نعیم نے اپنے دانتوں سے اس کے ہونٹوں کو کاٹا۔

لیکن برتھا اس کو انتقام کہاں سمجھ رہی تھی۔ اس کے نزدیک تو یہ استوائی جوش محبت تھا۔ برتھا کا تنفس تیز اور گرم ہوتا جا رہا تھا۔"

☆

"تم اس کے قائل ہو کہ مرد اور عورت میں ایسی دوستی بھی ممکن ہے جس میں جنسی تعلق نہ ہو؟"

"ممکن ہے ایسا ہوتا ہو۔ نعیم نے کہا: مگر میرے خیال میں جنسی تعلق کے بغیر مرد اور عورت کی زندگی میں کوئی لطف نہیں۔ غیر محسوس طور پر تو جنس کا احساس موجود ہی رہتا ہے۔"

☆

"نعیم نے برتھا کے ہونٹوں کا بوسہ لے کے ان میں ایک سگریٹ پکڑا دیا اور پھر سگریٹ جلا کے اپنے لئے بھی سگریٹ سلگایا۔ خود فرش پر برتھا کے پیروں کے پاس بیٹھ گیا اور اپنا بایاں ہاتھ بڑھا کے اس کے گداز سفید جسم کو آہستہ آہستہ سہلانے لگا۔

"نعیم ڈارلنگ!" برتھا نے اس طرح کہا گویا کچھ سوچ رہی ہو۔

"مجھے ذرا خوف معلوم ہونے لگا ہے۔ اگر مجھے کوئی سانولا سا بچہ ہو جائے تو کیا کروں گی؟"

"پیاری تمہاری مرضی کے خلاف تو میں کچھ کر ہی نہیں کرسکتا۔" نعیم نے کہا۔

"آج میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔ مگر کل اگر کوئی اور مقام مجھے مل جاتا تو اچھا تھا۔ کسی ہوٹل میں، کسی بورڈنگ ہاؤس میں، یا کسی سہیلی کے یہاں۔"

نعیم کو یک لخت یاد آ گیا۔ اس نے کہا "کل مجھ سے دو ہندوستانی لڑکیوں سے ملاقات ہوئی تھی۔ تم بھی انہیں جانتی ہو؟ کوکب زماں اور خورشید زماں۔ وہ بھی پیرس میں راج کمار کے ناچ میں آئی تھیں۔"

"ہاں۔ ہاں"

"نہیں۔۔۔ تمہارے ساتھ ایک ہی کمرے میں رہ کے تو میں اپنی طبیعت پر قابو نہیں رکھ سکتی۔"

☆

"نعیم نے اس کی پیشانی کو چومنا چاہا۔ مگر سرکشی کر کے اس کے لب نعیم کے سامنے آ گئے۔ سرخ نوجوان لب۔ نعیم کی سراسیمگی پر مارگرٹ کی نوجوان آنکھیں شوخی سے مسکرانے لگیں اور اس کے لب نعیم کے اور قریب آ گئے۔ اس قدر قریب کہ ایک لحظہ کے اندر دونوں کے لب ایک طلسمی قوت سے ایک دوسرے کے لبوں سے پیوست ہو گئے۔ لحظہ بھر کے بعد نعیم نے محسوس کیا کہ مارگرٹ اس کی آغوش میں ہے۔ اس کے سینے کے مقابل مارگرٹ کا جواں سال سینہ تھا اور مارگرٹ کی گرم گرم سانس اس نے اپنے چہرے پر محسوس کی۔"

دفعتاً اس نے اپنے آپ کو چھڑا لیا۔ "مارگرٹ! معاف کرنا۔ تم میرے دوست کی بہن ہو۔ تمہارا جسم میرے لئے مقدس ہے۔"

"مگر کیوں۔ کیا تمہارے ملک میں دوستوں کی بہنیں حرام ہوتی ہیں؟"

"لیکن مجھ پر اعتبار کر کے کراکسلے نے تمہیں یہاں بھیجا ہے۔"

"تمہاری ایسی باتوں پر تو مجھے غصہ آتا ہے۔ گویا میں بچہ ہوں اور اپنے بھائی کی ولایت میں ہوں۔"

"تم خفا کیوں ہوتی ہو، مگر مارگرٹ تمہیں کہیں نقصان نہ پہنچ جائے۔ ابھی تم بہت کم سن ہو۔"

"میں سترہ سال کی ہوں۔ معاف کرنا میں نہیں سمجھتی تھی کہ جسمانی حیثیت سے میں اتنی قابل نفرت ہوں۔ شب بخیر۔"

اس کا ہاتھ پکڑ کے نعیم نے کہا۔ "مارگرٹ! بے وقوفی کی باتیں نہ کرو۔ تم انتہا درجے کی خوبصورت ہو۔ اگر تم کراکسلے کی بہن نہ ہوتیں تو میں اپنے آپ کو بہت خوش قسمت تصور کرتا۔"

"اچھا خیر۔ خدا حافظ۔"

وہ اپنے پلنگ پر جا کے لیٹ رہی۔ نعیم نے اسے احتیاط سے کمبل اڑھایا اور شب بخیر کہہ کے اس کا ہاتھ دبایا۔ پھر اپنے پلنگ کے قریب آ کے روشنی گل کی۔

آدھے گھنٹے کے قریب کروٹیں بدلتے بدلتے گزر گئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ نعیم کے سارے جسم میں کسی نے خون کے بجائے جلتا ہوا سیسہ پگھلا کے بہا دیا ہے۔ اس کی کنپٹیاں خون کی گرمی سے پھٹی جا رہی تھیں۔

بالآخر اس سے نہ رہا گیا۔ وہ اٹھا۔ اندھیرے میں آہستہ آہستہ وہ مارگرٹ کے پلنگ کی طرف بڑھا اور جھک کے مارگرٹ کی طرف دیکھنے لگا۔ اندھیرے میں بھی اس نے دیکھا کہ مارگرٹ کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اور وہ سانس روکے اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔ خوف سے؟ حیرت سے؟ کشش سے؟ اس نے آہستہ سے کہا "مارگرٹ!"

مارگرٹ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ دیوار کی طرف کھسک گئی اور نعیم کے لئے جگہ کر دی۔ نعیم بلانکٹ کے اندر آ گیا۔ بے تابی سے اس نے مارگرٹ کا بوسہ لیا۔ اس نے اپنے جسم کو مارگرٹ کے جسم سے لپٹتے محسوس کیا۔ مارگرٹ کے پستان چھوٹی اور فولادی سخت ناشپاتیوں کے سے تھے۔ اس کا ہاتھ ادھر ادھر پھرتا رہا اور تھوڑی دیر کے بعد اس نے اپنے جسم پر بھی مارگرٹ کی انگلیوں اور لانبے نوکدار ناخنوں کی سرسراہٹ محسوس کی۔

اور جب مارگرٹ کا سانس زور زور سے چل رہا تھا تو اس نے کہا۔ "مارگرٹ ہم دونوں بوس و کنار سے آگے نہیں بڑھیں گے۔ میں تمہارا کنوار پن اگر تم سے چھینوں گا تو ہمیشہ میرا دل مجھے ملامت کرے گا کہ میں نے جیمز اور میری کا بدلہ تم سے لیا۔"

مارگرٹ نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خود بھی شاید حد سے زیادہ نہ بڑھنا چاہتی تھی۔ انگریز لڑکی ہمیشہ ڈرتی ہے کہ کہیں سانولا بچہ پیدا ہوا تو کیا ہوگا؟

اسی طرح ایک دوسرے کی آغوش میں رات گزر گئی اور صبح کی روشنی میں نعیم نے

مارگرٹ کا عریاں جسم دیکھا جو کسی یونانی مجسمے کی طرح خوبصورت تھا۔ رات بھر کے ضبط سے نعیم کے اعصاب بالکل جواب دے چکے تھے مگر اسے اس کی خوشی تھی کہ وہ اس امتحان سے کامیاب گذر چکا۔ اب اسے کراکسلے سے یا اپنے ضمیر سے شرمانے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

☆

ان اقتباسات کو ان کے سیاق وسباق کی روشنی میں دیکھنے سے بہت صاف طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ نعیم کس کردار اور ذہن کا مالک ہے۔ نیز حیدرآباد کے ماحول میں پلی بڑھی بلقیس ہو یا مغربی لڑکیاں، عورتیں، ایلس، برتھا، فریڈا گارٹ اور ہلڈا گارٹ وغیرہ وغیرہ — حتیٰ کہ نعیم کے دوست کی بہن مارگرٹ۔

پہلے وہ ان کے قصیدے پڑھتا ہے یا مدح کرتا ہے پھر حسن طلب بعد ازاں گریز کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ دراصل اس کے یہاں ایک طرح کا احساس کمتری ہے جو اسے ایک خاص حد سے آگے جانے نہیں دیتا، ایک آئی سی ایس آفسر کے یہاں اس طرح کی عدم خود اعتمادی اصلاً اس کے بچپن کی دین ہے جس سے وہ 'تمام تر تعلیم' عہدے اور ترقی کے باوجود نکل نہیں سکا ہے — ایلس سے اپنی تمام تر محبت کے باوجود اسے یہ شک کھائے جاتا ہے کہ وہ کنواری ہے یا نہیں — یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''۔۔۔نعیم نے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کے ایلس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور ایلس کی انگلیوں کی جوابی گرفت کی۔''

۔۔۔ایلس! مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے۔

ایلس کے چہرے پر محبت کی ہلکی ہلکی سنجیدگی برس رہی تھی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اور تم؟ تم محض میرا خیال کرتی ہو۔

''نہیں۔ اس سے بہت زیادہ نعیم۔ مجھے بھی تم سے لگاؤ ہو گیا ہے۔۔۔ صرف لگاؤ؟

تشبیب اور مدح کی اور شدید صورت اگلی عبارت میں یوں سامنے آتی ہے:

''۔۔۔نعیم نے مجنونانہ جوش سے اس کے جسم کو اپنی آغوش میں لیا اور اس طرح جیسے کوئی ہارتا ہوا فریق آخری مدافعت کرے۔ اس نے کہا ''میں تمہارے لئے زندگی بھر انتظار کرنے کو تیار ہوں مگر میری پیاری، میری جان۔ نسبت ہو جانے میں کیا ہرج ہے۔ مجھے اطمینان تو ہو جائے گا۔

دونوں کے لب ملے۔ نعیم ان لبوں کو اب تک ہزاروں بار چوم چکا تھا، چوس چکا تھا، لیکن آج ان میں وہ نرمی تھی، وہ گداز تھا، وہ لطافت تھی وہ سحر تھا کہ اسے معلوم ہوتا تھا کہ اس نے آج تک اس عورت کا بوسہ ہی نہیں لیا تھا، جو اب اس کی بیوی بننے والی تھی۔ گویا اس عورت کے ہونٹ دل کو تراش کے بنائے گئے ہیں اور ساتھ ہی ایلس کا جسم جو اس کی آغوش میں تھا اسے عزیز معلوم ہونے لگا۔ اتنا عزیز جس کی کوئی انتہا نہ تھی۔ یہ جسم گویا اب اس عورت کا جسم نہ تھا، یہ اسی کے رگ وپوست، اسی کے خون کا لطیف ترین حصہ تھا جس نے اس کے جسم سے الگ ہو کے اس عورت کی شکل اختیار کرلی تھی۔ اس مرتبہ جب اس کے ہاتھوں نے ایلس کے سخت سخت سینے کو چھوا، تو اس کے ہاتھ اس کی تحقیر سی نہیں کر رہے تھے۔ ان کا لمس انہیں پیار کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ ایلس کے پیلے پیلے بال بھی اس کے اپنے ہی جسم وجان کا ایک حصہ ہو گئے تھے۔ تو آربولون میں اس سہ پہر کو ایک جاندار، جسمی روحانی طور پر اس کے جسم وجان کا ایک حصہ بن گئی تھی۔ اب وہ دنیا میں تنہا نہیں تھا۔

اور وہ خواہش جو ایلس کی دوستی کے ساتھ ظہور میں آئی تھی، ایلس کے جسم، ایلس کے کنوارپن کو فتح کرنے کی خواہش، اب اس کا کہیں نام ونشان بھی نہ تھا۔ ایلس اب بھی کنواری ہی تھی۔ لیکن وہ احترام جو ایک عرصے سے آہستہ آہستہ نعیم کے دل میں پیدا ہو رہا تھا اس ایک لمحے میں جذبۂ پرستش بن گیا۔ اس کی محبوبہ، اس کی ہونے والی بیوی، کسی سے، یہاں تک کہ خود اس سے آلودہ نہیں ہوئی۔ مشرق کا تصور عصمت اسے ایلس کے اطراف اس وقت اس طرح چھایا ہوا نظر آرہا تھا جیسے ماہتاب کے گرد ہالہ۔

یکایک اس جنت کے دروازے پر ابلیس نے دستک دی۔ جنت سکون ہے، اور زندگی کی ہر اٹھتی ہوئی موج ابلیس۔ ایک رات کو جب نعیم ایلس کو اس کے

بورڈنگ ہاؤس چھوڑ کے واپس آیا تو ایک چھوٹے سے زہریلے سانپ نے اس
کے کان میں سرگوشی کی۔

کیا ایلس فی الحقیقت کنواری ہے؟

یا صرف میں بیوقوف بن رہا ہوں؟

اور اس کے جسم میں آہستہ آہستہ زہر پھیلتا گیا۔ رات بھر وہ کروٹیں بدلتا رہا۔ صبح ہوتے ہوتے
اس کی آنکھ لگی۔ مگر زہر چڑھتا گیا۔ چڑھتا گیا۔ دن چڑھنے لگا۔

دھوپ میں اس کا جسم اس کے دل سے اپنا حصہ مانگ رہا تھا۔

☆

مذکورہ بالا اقتباس میں کئی الفاظ اور جملوں کے ٹکڑے توجہ طلب ہیں جیسے ''ہلکی ہلکی سنجیدگی کی بارش''؛ ''مجھے بھی تم سے لگاؤ ہو گیا ہے صرف لگاؤ''؛ مجنونانہ جوش''؛ ''آخری مدافعت''؛ ''جنت کے دروازے پر ایلیس نے دستک دی''؛ ''کیا ایلس فی الحقیقت کنواری ہے؟ یا صرف میں بے وقوف بن رہا ہوں؟'' وغیرہ وغیرہ۔ نعیم کے معاملات اور گریز در گریز کی صورت حال سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لئے ''گریز'' کے دوسرے حصے کے ساتویں، آٹھویں اور نویں باب کا مطالعہ ضروری ہے۔

عزیز احمد نے ''گریز'' میں نعیم کے کردار کے اس پہلو کو غالباً اسی لئے روشن کیا ہے کہ ''گریز'' میں دلچسپی بھی پیدا ہو جائے اور ''تنازعہ'' بھی رہے کہ آخر عزیز احمد یعنی ناول نگار نعیم کے حوالے سے کس اخلاقی درس کی بات کر رہے ہیں یا کس تہذیب کی عکاسی چاہتے ہیں۔

یہ اور اس نوعیت کے کئی اقتباسات یہاں نقل کئے جا سکتے ہیں جن سے نعیم کی ''صورت گریز'' واضح ہوتی ہے لیکن اصلاً عزیز احمد نے گریز میں اپنے تاریخی مطالعے اور مشاہدے کو سفرنامہ کی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور بعض کردار مثلاً نعیم، ایلس، بلقیس اور میری پاول، گل سرخ، عاقل خاں کے حوالے سے اسے ناول بناتے نظر آتے ہیں اور اس کے لئے بخار، عادل، انتظار، گل سرخ، انتخاب جیسے جلی اور ضمنی عنوانات سجاتے ہیں مگر ''گریز'' ناول کی صف میں کھڑا ہونے سے پھر بھی گریز اختیار

کر لیتا ہے اور ایک دلچسپ سفرنامہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ گریز کا پہلا باب جس کا عنوان ''بخار'' ہے۔ جسے آپ عشق کا بخار بھی کہہ سکتے ہیں۔ نیز مشرقی تہذیب سے فرار کا بخار بھی تصور کر سکتے ہیں جس کے حوالے سے عزیز احمد نے حیدرآباد کی مسلم تہذیب اور ترقی کے نام پر بچی کچی شناخت کے معدوم ہونے کا بھی ذکر نہایت فنکاری سے کیا ہے۔ اس کی وضاحت کے لئے صرف دو اقتباس حاضر ہیں:

''جوں جوں بلقیس بڑھنے لگی خانم کا شوق بھی بڑھنے لگا کہ ان کی لڑکی کسی میم سے کم نہ ہو۔ انگریزی انگریزوں کی طرح بولے۔ انہی کی طرح رہے۔۔۔ عاقل خاں نے یہ تصفیہ کیا کہ ان کی لڑکی انگریزی پڑھے گی اور انگریزی بولے گی اور جب تک سن بلوغ کو نہ پہنچے (اس کے بعد دیکھا جائے گا) انگریزی کپڑے پہنے گی۔'' (ص ۱۰)

''خانم اور عاقل خاں کے بعض عزیزوں نے انہیں یہ سمجھانا چاہا کہ انگریزیت کی نقل اور چیز ہے اور انگریزوں کے ہنر سیکھنا دوسری بات ہے مگر جب بلقیس گھر آ کے پاپا اور ماما سے صاف صاف انگریزی میں پیاری پیاری باتیں کرتی تو انہیں یہ محسوس ہونے لگتا کہ ان کے جاہل عزیز ان سے جلتے ہیں اور اس کے بعد وہ یا تو اس قسم کے اعتراضات کا سخت جواب دیتے یا بے توجہی سے اس کان سنتے اور اس کان اڑا دیتے۔'' (ص ۱۱)

میرے نزدیک ''گریز'' ایک ناول نہیں سفرنامہ ناول ہے۔ ''گریز'' کے کم و بیش ہر باب کا آغاز اسے سفرنامہ سے قریب تر کرتا نظر آتا ہے اور اس طرح اس کے زیادہ تر حصے پر سفرنامے کا گمان ہوتا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ اگر میں اپنی بات کی تائید میں اقتباسات نقل کرتا ہوں تو مقالہ بوجھل ہو جاتا ہے لیکن ایسا کرنا ناگزیر بھی ہے چنانچہ میں طوالت کے خوف سے محض چند اقتباسات نقل کرتا ہوں اور بقیہ صفحات کے نمبر درج کر دیتا ہوں تاکہ قارئین مزید مطالعے کے لئے ''گریز'' کے ان صفحات سے رجوع کر کے کوئی فیصلہ لے سکیں۔ جن صفحات پر سفرنامے کا رنگ اور آہنگ، اسلوب اور ذائقہ موجود ہے وہ ص ۲۲، ۲۵، ۲۸، ۲۹، ۳۹، ۴۱، ۴۴، ۴۷، ۵۰، ۵۲، ۶۳ تا ۷۶، ۸۶، ۸۷، ۹۲ تا ۱۰۸، ۱۳۴ تا ۱۸۱، ۲۰۳ تا ۲۲۰ وغیرہ وغیرہ ہیں۔

اب یہ اقتباسات ملاحظہ فرمائیے:

"سویرے جو کل آنکھ میری کھلی تو پانی برس رہا تھا آج بھی پانی برس رہا تھا۔ متواتر تین دن سے گھٹا چھائی ہے۔ ارادہ کرتا ہوں کہ اٹھوں، تفریح کو جاؤں۔ پھر کاہلی سے یہ عذر کر کے ٹال دیتا ہوں کہ آج تو سڑک پر بہت زیادہ کیچڑ ہوگی۔ کچھ دیر تک اس طرح لیٹا رہا۔۔۔"

☆

"صبح کو بہت دیر میں آنکھ کھلی، مطلع صاف تھا۔ ہلکے ہلکے سفید بادلوں سے آفتاب کی روشنی چھن رہی تھی۔ چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ طاق پر ناشتہ رکھا تھا۔ چڑیاں آج بھی پراٹھے کا ذرا سا ٹکڑا نوچ کر کھا گئی تھیں۔

فرائڈ کے مجموعہ مضامین کو پڑھنا چاہا۔ ایک آدھ مضمون ختم کرنے پر طبیعت اکتا گئی۔ اس میں گیارہ بج گئے، بس سے جانا تھا بس اسٹینڈ گیا۔" (ص ۲۵)

☆

"۹ر ستمبر۔ بمبئی۔ صبح کو ناشتہ کر کے ہم سب اپنا اپنا اسباب باندھنے لگے۔ اس کے بعد ٹرام پر طامس کک اینڈ کو کے دفتر پہنچے۔ جہاز کے جانے میں صرف چند گھنٹے باقی تھے۔ لیکن برسر کے نام خط جو مجھے مل جانا چاہئے تھا وہ ابھی تک نہیں ملا تھا۔ مجھے غصہ آ رہا تھا۔ یہ میری ہی غلطی تھی کہ میں نے اطالوی جہاز سے جانے پر اصرار کیا۔ پی اینڈ او کے کسی جہاز سے جاتا تو کوئی جھگڑا نہ ہوتا۔ میرے تینوں ساتھی مطمئن تھے اور میری الجھن پر ہنس رہے تھے۔ اتنے میں ایک اور صاحب آئے اور انصاری ان سے بے تکلفی سے باتیں کرنے لگا۔ پھر مجھے بلایا۔ "نعیم!" میں ان صاحب سے ملنے کے لئے بڑھا۔ "نعیم آپ سے ملو۔ آپ بھی حیدرآباد سے تشریف لا رہے ہیں۔ آپ کا نام یونی ہے۔"

اس عجیب نام پر مجھے تعجب سا ہوا۔

میں نے پوچھا۔ "آپ بھی تشریف لے جا رہے ہیں۔"

یونی صاحب نے کہا۔ "نہیں میری بیوی جا رہی ہیں۔ انہیں جہاز تک پہنچانے کے لئے آیا ہوں۔"

"کونتے دی توسکا" جہاز کا نام کس قدر بھلا معلوم ہوتا تھا اور جہاز بھی بہت خوبصورت تھا۔ انصاری، نصیر اور ایوب کے ساتھ میں نے بھی جہاز کے مختلف حصوں کو دیکھنا شروع کیا اور اس کے بعد سب نے مناسب سمجھا کہ عرشے پر ٹھہر جائیں۔ پانچ دس منٹ میں جہاز چھوٹنے ہی والا تھا۔ سب مسافر عرشے پر تھے۔ دو تین سکھ اور ان کی بیویاں جن میں ایک خوبصورت تھی اور باقی بدصورت، کئی انگریز یا انگریز نما لوگ، ایک ہندوستانی نوجوان اور اس کے ساتھ ایک ساڑی پوش میم، اور بکثرت ہندوستانی، دو تین چینی یا شاید جاپانی اور انگریزوں کے مقابلے میں کسی قدر سانولے اطالوی۔ پایر پر کھڑے لوگ رومال ہلا رہے تھے۔"

بحیرۂ قلزم میں غروب آفتاب کا سماں بہت اچھا معلوم ہوا اور رات اس سے بھی زیادہ اچھی۔ اس وقت ہمارا جہاز حرمین شریفین کے بہت قریب سے گزر رہا ہوگا۔ چاند بادلوں میں چھپ چھپ کے نکل رہا تھا جو بحیرۂ قلزم پر شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں۔ دور کی ہلکی ہلکی خاموش موجوں پر چاندنی کی چمک عجب لطف دے رہی تھی۔ میں چاند کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس قدر مدہوش سا تھا کہ فاروقی صاحب میرے پاس آ کے کھڑے ہو گئے، تو مجھے معلوم بھی نہ ہو سکا۔ انہوں نے پوچھا۔ "بتائیے مولانا اشعار کی آمد آمد ہے یا وحی کی۔ یہ سارا خطۂ یرموک سے یمن تک اور یروان سے لے کر خلیج عدن تک انبیاء اور شعراء دونوں کو راس آتا رہا ہے۔

☆

"لیکن تیسرے پہر کوہ سینا نظر آیا۔ جہاز کوہ طور کے قریب سے گذر رہا تھا۔ میں نے فاروقی صاحب سے کہا۔ "حضرت موسیٰ کو دیدار نصیب ہوا بھی تو ان ریتلے، خشک پہاڑوں میں"۔ انہوں نے جواب میں کہا۔ "بصیرت چاہئے۔" میں ان ریتلی اور بنجر پہاڑیوں کو دیکھ رہا تھا جہاں بنی اسرائیل کے پیغمبر پیدا ہوئے اور تلقین کی۔ جہاں سے شام سے مصر جانے والے اور عرب سے مصر آنے والے قافلے گذرتے تھے اور مجھے ان پہاڑوں سے ایک طرح کی محبت معلوم ہوئی

جس کی عقلی توجیہہ نہیں کی جا سکتی۔ چھ بجے قریب ایک فلم دکھایا گیا جو اتنا غیر دلچسپ تھا کہ میں
باہر آ کے پھر ان پہاڑیوں اور سمندر کے جھاگ کو دیکھنے لگا۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی میں
ان پہاڑیوں کا رنگ نکھرا اور غروب سے پہلے سمندر کے جھاگ میں قوس قزح کے سے رنگ جھلکنے
لگے۔

''جب جہاز بندر سویز میں ٹھہرا تو کچھ مصری سپاہی اوپر چڑھ آئے۔ ہم لوگوں سے سگرٹوں کی
فرمائش کی۔ سویز کی روشنیاں بڑی خوبصورت معلوم ہو رہی تھیں۔ معلوم ہوا کہ طبی معائنہ ہونے
والا ہے۔ طبی معائنوں سے میں ہمیشہ گھبراتا ہوں۔ اگر چاندنی نہ ہوتی تو ایک مجھ ہی کو کیا سب کو
طبی معائنے کا انتظار بڑا کھلتا۔ ڈاکٹر کسی طرح آ ہی نہیں چکتا تھا۔ انتظار کی گھڑیاں کاٹنے کو اسی
مدراسی عیسائی لڑکے اور ایک سوستانی انجینئر نے ایک دوسرے کو مقابلے کی دعوت دی کہ کون زیادہ
شراب پیتا ہے۔ دونوں بار کے اسٹولوں پر بیٹھے اس بے تکلفی سے پی رہے تھے جیسے کوئی پانی پی
رہا ہو بلکہ جیسے گھڑوں میں پانی ڈالا جا رہا ہو۔ کچھ دیر یہ تماشا دیکھ کے میں پھر باہر عرشے پر آ گیا۔''

''لوگے ماجیورے۔ کیا دنیا میں اور بھی کوئی جھیل اتنی خوبصورت ہوگی۔ مگر اب تک میں نے کوئی
اور جھیل دیکھی ہی نہیں۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ یہ منظر دنیا کے حسین ترین مناظر میں سے ہے۔
ریل جھیل کے کنارے کنارے چلی جا رہی تھی اور افسوس یہ ہے کہ استریزا پر نہ اُتر سکا۔ مگر ریل
ہی سے اس کا منظر ایسا دلکش معلوم ہوتا تھا کہ بیان میں نہیں آ سکتا۔ ایک قلی نے آ کے کہا،
''بستورے استریزا اے بیلا۔'' چند نے اس کے معنی سمجھائے۔ ''استریزا خوبصورت ہے۔''
جزیرے بسے ہوئے اور آباد تھے۔ ایک موٹر بوٹ پر کچھ لوگ سوار تھے۔ انہوں نے چلتی ریل
کے مسافروں کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور مسافروں نے ان کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ یہ جانور جسے انسان
کہتے ہیں اپنی نوع کے اجنبیوں کو کتنا پسند کرتا ہے۔ اب ہم آلپ پہاڑیوں میں سے گزر رہے
تھے۔ ریل کبھی اوپر چڑھتی کبھی نیچے اترتی، کبھی سرنگوں میں سے ہو کر گزرتی، کبھی بلندی سے گہری
وادیاں نظر آتیں جن میں صنوبروں کے ہجوم میں کوئی چشمہ بہتا نظر آتا۔ کبھی اوپر برف پوش
چوٹیاں دکھائی دیتیں، اور نشیبوں پر خوبصورت مکانات اور جھونپڑے بنے تھے۔ وہ اس منظر پر
تراشے ہوئے جواہرات کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ ان پہاڑوں پر آبادیاں بھی تھیں۔ کاش

ریل ٹھہر جاتی اور ساری عمر یہیں سے گذرتی مگر کچھ دنوں کے بعد پہاڑ میں گھری ہوئی آبادی قید
خانہ معلوم ہونے لگتی ہوگی جیسے ہندوستان۔''

☆

''سمپلان کی سرنگ۔ چند نے کہا۔ یہ دنیا کی سب سے بڑی سرنگ ہے، اور جب اس سے نکل
کے ہم برگ پہنچے تو مسٹر اور مسز چندلوزان جانے والے ڈبہ میں چل دئے۔ ہماری ریل نے اوپر
چڑھنا شروع کیا۔ نیچے ایک وادی میں میلوں تک ایک ندی بہتی چلی گئی تھی جس کے کناروں پر
صنوبروں کی قطاریں تھیں۔ منظر اس بلندی سے عظیم الشان معلوم ہو رہا تھا۔ وادی کی آبادیاں
مختصر تھیں اور ایسی خوبصورت کہ آدمی انہیں دیکھ کے محو ہو جاتا ہے۔ اور ہماری گاڑی کو بڑے
بھاری بھرکم پُل ایک پہاڑ سے دوسرے پہاڑ تک، ایک سرنگ سے دوسری سرنگ تک پہنچا رہے
تھے۔

ہم اب بھی پہاڑوں میں گزر رہے تھے مگر اب رات ہو گئی تھی۔ ایک سوستانی ہم سفر نے ہم سے کہا
کہ اب ہم نیچے اتر رہے ہیں۔

برن پہنچے تو یہاں کی صفائی اور روشنی اطالیہ کے شہروں سے اس قدر زیادہ تھی کہ معلوم ہوا ہم یورپ
میں ہیں۔ مرچنڈانی کے سوستانی دوستوں کے ساتھ کھانا کھایا اور ہوٹل نارمنڈی میں ٹھہرے۔
جب ہم ہوٹل کے کمرے میں کھانا کھا رہے تھے تو تین انگریز لڑکیاں ہنستی ہوئی آئیں اور ایک
میز پر بیٹھ گئیں۔''

☆

''مدرسۂ علم آثار قدیمہ میں طالب علموں کی تعداد اچھی خاصی تھی۔ جب حیدرآباد میں یہ مدرسہ قائم
ہوا تو اس کا مقصد زیادہ تر یہ تھا کہ آثار قدیمہ کی تحقیق کے لئے نوجوانوں کو تیار کیا جائے لیکن بہت
جلد اس میں بہت سے شعبوں کا اضافہ ہو گیا۔ اس کا نام تو مدرسۂ علوم آثار قدیمہ ہی رہا۔ لیکن
یہاں تاریخ، فنون لطیفہ، تاریخ ثقافت، طبقات الارض اور بہت سے علم کی تعلیم دی جانے لگی۔''

یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب مدرسے کی عمارت بن رہی تھی۔ جس کو ایک قابل نقشہ نویس نے اس خوبی سے تیار کیا تھا کہ دکن کی ہزار ہا سال کی ثقافت کے تمام عناصر اس میں نمایاں تھے بیگم پیٹ اسٹیشن سے وہاں تک ریل کی چھوٹی سی پٹری ڈالی گئی تھی جس میں ہزار ہا ٹن سامان مٹی اور پتھر سب ہی آتا اور سینکڑوں مزدور کام کرتے تھے۔ جن طلبا کو وہاں منتقل ہونا تھا وہ اکثر اس نئی عمارت کو دیکھنے جایا کرتے تھے۔ قریب ہی ان کا بورڈنگ ہاؤس تھا۔

عادل بھی اسی مدرسے اور اقامت خانے میں تھا اور اچھا خاصا ہوشیار طالب علم سمجھا جاتا تھا۔ وہ اس امتحان کی تیاری کر رہا تھا جس کا اس مدرسے کے سوا ہندوستان میں کہیں وجود نہیں یعنی بیچلر آف آرکیالوجی۔ بورڈنگ ہاؤس میں شروع شروع میں تو اس کی اچھی گزری اور کچھ دن تو ایسے بھی آئے جب اس کی توقع تھی کہ اُسے عریف طعام مقرر کیا جائے گا۔ اس کی ظرافت کی داد بھی دی جاتی تھی۔

☆

''پنجاب میں۔'' کرنل ریمز نے کہا۔ ''پنجاب ہندوستان کے شمال مغرب میں ایک صوبہ ہے۔ میں بتاؤں اسے پنجاب کیوں کہتے ہیں۔ اردو اور پشتو میں پنج کہتے ہیں پانچ کو۔ آب کہتے ہیں ندی کو۔ اس صوبے میں پانچ ندیاں بہتی ہیں۔''

''کتنی دلچسپی کی بات ہے۔'' امریکن میزبان نے ہمت افزائی کرتے ہوئے کہا۔

پھر ایلس نے اسی طرح یک لخت سوال کیا۔ ''اور حیدرآباد کہاں ہے؟''

''کون سا ہائی ڈراباڈ؟'' کرنل ریمز نے پوچھا۔ ''ایک ہائی ڈراباڈ سندھ میں ہے اور ایک ڈکن میں۔ ڈکن پشتو میں ساؤتھ (جنوب) کو کہتے ہیں۔''

اس پُرمعلومات تصریح کے بعد ایلس کی ہمت نہ پڑی کہ وہ ہندوستان کے متعلق مزید جغرافیائی معلومات حاصل کرے۔

☆☆☆

یہ اقتباسات ظاہر کرتے ہیں کہ ''گریز'' کلی طور پر ''سفرنامہ'' اور جزوی اعتبار سے ''ناول'' کی صف میں کھڑا نظر آتا ہے مگر چودھواں باب جس کا عنوان ہی ''آوارہ گردی'' ہے اس کو مزید سفرنامے سے قریب کرتا ہے۔ یہ عبارت دیکھئے جہاں سے یہ باب شروع ہوتا ہے:

''یولی سیز نے پھر سفر کا پرچم کھولا۔ جادوگرنیوں کے جزیروں کا رُخ کیا اور متلاطم سمندروں میں اپنی کشتی بڑھاتا چلا گیا۔ ٹرائے کے ماحول سے گریز کرنے کے بعد سندباد جہازی کے بادبان پھر ہوا میں لہرائے۔ نئی اقدار کی تلاش کے لئے مارکو پولو کو پھر سیاحت کی تڑپ بےقرار کرنے لگی۔ یہ یورپ جو دیا سلائی کی طرح سلگ اٹھنے کو تھا ذرا دیکھا تو جائے کہ کیا۔ یہ کرا کسلے اور ہیروشا کا یورپ۔ یہ برتھا اکسل سن اور میری پاول کا یورپ۔ جس میں خواج بھی بن سکتی تھی، چٹان بھی، ابر بھی، طوفان بھی۔

وہلیوں کی شاہراہ بیوولف کی آزمائی ہوئی تھی۔ اس کے سوندتی ہوئی رانکنگ کشتیاں سر اٹھائے ہوئے کولمبس سے پہلے، نئی ساحلوں تک پہنچیں اس کا ساحل بڑا خوبصورت ہے۔ کہیں بھوری چٹانیں سمندر میں جزیرے اور جزیرہ نما اور خاکنائیں بناتیں، کبھی سمندر اندر گھس کے نہر یا جھیل یا دریا بن جاتا۔ زمین اور پانی کی ہزار ہا سال کی لڑائی سے اچھا نقشہ شاید ہی کہیں کھینچا گیا ہو۔

اور ناروے کے شہر بڑے خوبصورت ہیں۔ برگن۔۔۔۔ آغوش میں سمندر کے ساتھ ساتھ پھیلا ہوا ہے۔ اس کی عمارتوں کا حسن، اس کی عورتوں کا ہاتھی دانت کا سا رنگ اور سنہرے بال، اس کے مردوں کے دراز قد۔ پھر ناروے کا سفر، ناروے کے پہاڑ جیسے ریڑھ کی ہڈی ہر وادی میں ایک چھوٹی سی جھیل۔ پہاڑ بنجر بھورے، سرد ہیبت ناک اور خوبصورت۔''

☆

''بلجیم جسے ایک جنگ نے تباہ کر دیا تھا۔ انٹورپ یا آنورس۔ ایک دو سڑکوں کے سوا کچھ نہیں۔ لڑکیوں کے ہلکے زرد بال، ایک نائٹ کلب، ایک تھکی ماندی مزدور لڑکی نقلی فیشن ایبل سائے میں ناچتے ہوئے اس نے نعیم سے کہا جو خاموشی اور لاپروائی سے اس کے ساتھ ناچ رہا تھا۔ ''واہ مسیو! کیا شانِ استغنا ہے۔''

پھر ریل۔ اور عروس البلاد پیرس۔ بین الاقوامی نمائش۔ سین میں فواروں کی پھلجھڑیاں۔ ہر ملک کا نمائش خانہ۔ اس ملک کی سیاحت کے لئے ایک اشتہار۔ روس اور جرمنی کے نمائش خانے آمنے سامنے، بلند اور شاندار۔ روس کی نمائش گاہ پر ایک مرد اور ایک عورت درانتی اور ہتھوڑا لئے ہوئے۔ مقابل کے جرمن نمائش خانے پر جرمن عقاب ایک شانِ بے نیازی سے گردن موڑے ہوئے اور جرمن نمائش خانے کے اندر، گویا در و دیوار سے اُبلتی ہوئی فوجی موسیقی۔ بوڑھے یہودی نے تو کہا ہی تھا کہ "یہ دنیا سمندر کی تہہ میں جا بیٹھے گی۔"

☆

ڈاکٹر راجندر کے ساتھ سفر۔ وہ اپنی موٹر یورپ بھر پھرا کے ہندوستان لے جانا چاہتے تھے۔ پہلے دن پیرس سے شواسون۔ فوجی قبرستان اور الگزنڈر ڈوما کا مکان۔

صبح سے لے کے ڈیڑھ بجے تک بروسلز کی سیر۔ سوائے عجائب خانوں، تصویروں اور مجسموں کے اس شہر میں ہے ہی کیا۔ غلیظ سڑکیں، ناخوشگوار صورتیں اور لاریاں۔ پھر انٹورپ دلندیزی سرحد۔ ہالینڈ کے میدان، پانی، پھول، سڑکیں اور یورپ بھر میں سب سے زیادہ خوشنما مکانات، دلندیزی مناظر۔ ہوا سے چلنے والی چکیاں۔ سمندر پر پُل۔ ایشیائیوں سے کچھ کچھ تعصب۔ یوترخت اور جرمن سرحد۔

☆

دوسل روزف۔ بون۔ بیتہووون کی پیدائش گاہ۔ اور بون کا مشہور و معروف نظر، اواخر جولائی میں دریائے رہائن کا جوبن، کوبلنس، جہاں دو ندیاں ملتی ہیں، جہاں کا قلعہ رہائن کے تمام قلعوں کا سرتاج ہے اور جہاں کے کشتیوں کے پُل کے منظر کو آنکھ ایک بار دیکھ لے تو دل کبھی نہیں بھول سکتا۔ رات سینٹ گوا میں۔ پھر اسی لڑکی سے ملاقات جس نے اس سے پہلے سفر میں کراکسلے کے لئے پرانا جرمن گیت گایا تھا۔

ہائیڈل برگ۔ روزا۔ روزا کے ساتھ ہٹلر کی بنائی ہوئی ورزش گاہ پہاڑوں اور آہستہ خرام نیکر کے اس

پس منظر میں کتنی بھونڈی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن روزا کی کمر میں ہاتھ حائل کرکے، کسی پہاڑی راستے پر اسے اپنی طرف کھینچو تو اس کی گرم سانس میں اور پہاڑ کے صنوبروں کی ٹھنڈی سانس میں کتنا فرق معلوم ہوتا ہے۔

بادن بادن میں امیر مریضوں کا ہجوم۔ گھوڑوں پر خوبصورت فیشن ایبل لڑکیاں۔ ایک کا گھوڑا لڑکھڑایا تو نعیم نے مسکرا کے کہا۔ "اتاں سیاں (ہوشیار) مدموزیل۔" وہ مسکرا کے آگے بڑھ گئی۔

سیاہ جنگل۔ شوارتس والڈ۔ صنوبروں اور پہاڑی درختوں میں بل کھاتی ہوئی خطرناک موڑوں سے گذرتی ہوئی سڑک فرائی برگ کی یونیورسٹی میں تعطیلات کے کورس کے لئے انگریز طالب علموں کی کثرت۔ ٹی ٹی زی کے کنارے چائے۔ لڈوگس ہافن سے بوڈن زی کا نظارہ۔ یہ بڑی سی مچھروں سے بھری نیم خوبصورت جھیل، جہاں تین ملکوں کی سرحدیں ملتی تھیں۔ فریدرشس ہافن میں زیپلن کا کارخانہ۔ لنڈاؤ کی گلیاں، اُلم سے بھی زیادہ نم اور سرد۔

ہوہن شاوان کا قلعہ اور شی زی کے کنارے دوپہر کا کھانا۔ بویریا میں پہاڑوں سے میدان کی طرف اتار۔ میونشن سے پہلے اشتارن برگرزی جس کو نعیم محض اس لئے دیکھنا چاہتا تھا کہ ٹی ایس۔ ایلیٹ نے "خراب آباد" میں اس کا ذکر کیا ہے۔ کچھ لڑکیاں اس جھیل میں نہا رہی تھیں۔

میونشن۔ انگولڈ اشٹاٹ میں نیلی ڈینیوب کا رنگ مٹیالا ہے۔ نیورن برگ قرونِ وسطیٰ کی محفوظ یادگار۔ قرونِ وسطیٰ کے جیسے مکانات، کلیسا، اور بازار، نازی جرمنی کی رومانیت کا مرکز۔

رات۔ بارش۔ کہر۔ کہر سینٹ کی پر امنڈ امنڈ کر آتی تھی اور موٹر کی روشنی میں چمک اٹھتی۔ اس طرح واگنر کے مولود و مسکن بے رایت پہنچے۔

چھوٹا سا خوبصورت بویریائی قصبہ سڑک۔ مکان، سڑک، مجسمے سب بویریائی تمدن کی یادگار اور ان میں سب سے ممتاز واگنر کا مکان۔

ہٹلر کی بنائی ہوئی سڑکیں۔ رائشس آٹوبان۔ سینٹ کی سفید، عریض، مسطح فوجی سڑکیں، میدانوں، غیر دلچسپ منظروں سے گذرتی ہوئی۔ مگر آنے کی سڑک الگ، جانے کی الگ، ساتھ

ستر میل سے کم رفتار سے جانے میں کوئی لطف نہیں۔ ڈاکٹر راجندر، لائپزگ پہنچتے پہنچتے چور چور ہو گئے۔"

ان عبارات میں آخر کیا ہے کیا ان میں ناول کے ہیرو "نعیم" (اگر یہ واقعی ناول ہے) کے کردار پر کوئی روشنی پڑتی ہے یا اس کے ذریعے ہم اس کی کسی نفسیاتی گرہ کو کھولنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے ہرگز نہیں — ہاں یہ ضرور احساس ہوتا ہے کہ وہ ایک سیاح ہے اور اس کے مشاہدے میں جو مقامات اور اسماء آ رہی ہیں ان کا ذکر وہ ایک سفرنامہ نگار کی حیثیت دلچسپ پیرائے میں کرتا جا رہا ہے۔

پندرہویں باب کا آغاز بھی سفرنامہ کا اسلوب لئے ہوئے ہے۔ آپ ہی ملاحظہ فرمایئے:

"صبح سویرے جہاز بمبئی پہنچا۔ نیم برہنہ مزدور ساحل پر اور کشتیوں پر کوئلے سے دانت مانجھ رہے تھے اور ان کے منہ سے کوئلے کے رنگ کا پانی اس طرح نکل رہا تھا گویا ان کے جسم کی سیاہی جو جسم کے اندر بھی موجود ہے، بہہ بہہ کے باہر نکل رہی ہے۔ جہاز سے اترتے ہی چنگی کے محکمے نے کتابوں کی ایسی سخت جانچ پڑتال کی گویا نعیم سے زیادہ اسٹالن کا کوئی محرم راز نہ تھا۔ لفٹ بک کلب کی تمام کتابیں ضبط کر لیں، پھر آگے بڑھنے کی نوبت آئی۔ نعیم ایک آدھ دن بمبئی میں ٹھہرنا چاہتا تھا۔ ایک گھنی داڑھی والے کوچوان نے اپنی وکٹوریہ پیش کی اور کہا۔ "آپ بھی مسلمان ہیں۔ میں بھی مسلمان ہوں۔ صاحب میری گاڑی میں چلئے۔" "معلوم نہیں اسے نعیم کے مسلمان ہونے کا حال کیسے معلوم ہو گیا۔ نعیم نے پوچھا تو اس نے کہا۔ "مسلمان کی صورت کہیں چھپتی ہے؟" (ص ۲۳۵)

پھر ذرا اور آگے بڑھئے تو یہاں انداز تو خط کا ہے مگر سفر کی روداد سے خالی نہیں:

"تمہارا خط پڑھ کے مجھے بڑی مسرت ہوئی۔ یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ تمہاری ہمدردی سے میں بہت متاثر ہوا۔ مجھے علم ہے کہ تمہاری طرح اور بھی بہت سے انسان ہیں۔ جن کو اگر پورے حالات معلوم ہوں تو وہ بھی "وسط یورپ کے اس ملک سے جس کا ہم نے کبھی ذکر بھی سنا" (یہ دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کے ایک وزیر اعظم کے الفاظ ہیں)۔۔۔ ہمارے اس ملک سے

ہمدردی محسوس کریں گے۔ میں گذشتہ گرما میں پراگ میں بہت سے اجنبیوں سے ملا۔ سب ہمارے دوست تھے۔ سب نے اپنے اپنے ملکوں کی ہمدردی کا یقین دلایا۔ ہمارے سیاسی دوستوں نے بہت غلو سے اپنے وعدوں کی سچائی کے دعوے کئے۔۔۔ اور نتیجہ؟۔۔۔ نتیجہ تم نے دیکھ ہی لیا۔ لوہے کے ہتھیاروں والے ہمسائے جن کی اصلی جگہ باورچی خانے میں ہے۔ ہمارے ملک کے ٹکڑے کاٹ لے گئے اور کیا اچنبھا معلوم ہوتا ہے کہ اب ہمارے ان صدیوں کے دشمنوں نے ہمارے اپنے پولستانی بھائیوں اور لالچی ہنگرویوں کی طمع سے ہمیں بچانے کا ذمہ لیا ہے۔

لیکن ایک بات اور ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ زمانہ معاشی طبقوں کی جنگ کا زمانہ ہے۔۔۔ مگر نہیں میں اسے ضبط تحریر میں نہیں لا سکتا۔ یہاں کچھ ایسا دستور زباں بندی ہے۔ پھر کبھی ملے تو ترکی قہوے کی پیالیاں پیتے میں ہم اس مسئلے پر بحث کریں گے۔

میں ابھی تک وزارت خارجہ کے دفتر میں ہوں۔ مگر مستقبل کی بات کچھ نہیں کہہ سکتا۔ جرمن اثر زیادہ بڑھ گیا تو ممکن ہے مجھے قید کر لیا جائے۔ بہرحال ہمارے پورے ملک کے نظام میں بہت سی تبدیلیاں ہوں گی اور دفتر وزارت خارجہ کو محدود کر دیا جائے گا۔ ممکن ہے میں بھی تخفیف میں آ جاؤں۔ بہرحال میں اتنا زیادہ قنوطی بھی نہیں۔ ممکن ہے ایک دن میں ہندوستان آؤں اور باتا کے لئے سانپ پکڑوں۔"

ان اقتباسات کو پڑھتے جایئے اور اگر ان کو "گریز" کے متن سے الگ کر کے غور کیجئے تو یہ خیال ہی نہیں آئے گا کہ یہ کسی ناول کی عبارت ہے۔ عزیز احمد نے خط کے سہارے متعلقہ عہد پر اظہار خیال کیا ہے اور برائے بیت اسے نعیم سے جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ آپ خود ہی ملاحظہ فرمایئے:

مثلاً جدید شاعری۔ تمہیں اس مہینے کی ادبی خبریں سناؤں۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے نئے ڈرامے "خاندان کا اجتماع" کے متعلق نقادوں کی کج بحثی کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ اسکروٹنی میں ایک نقاد نے لکھا ہے کہ اس میں جتنے حصے اچھے ہیں، وہ ایلیٹ کی کسی ابتدائی نظم کی صدائے بازگشت

ہیں۔ گویا وہ اپنے ابتدائی تخیل کی یادوں میں رہنا چاہتا ہے اور پرانے فقرے اُلٹ پلٹ رہا ہے۔ میں نے بھی کم سے کم ایک نقص تو محسوس کیا ہے اور وہ یہ کہ مصرعے چست نہیں ہیں اور کچھ گھٹیا سے ہیں۔ معلوم نہیں۔ کتاب ہندوستان پہنچی اور تمہاری نظر سے گذری یا نہیں۔ لیکن مجھے تو یہ مشکل سے یقین آتا ہے کہ ایلیٹ جیسے کلاسیکی ماہر سخن نے یہ شعر لکھے ہیں۔

سینکڑوں کتابیں چھپ رہی ہیں۔ جن میں سب سے زیادہ قابل ذکر آرنلڈ ٹائن بی کی "مطالعہ تاریخ" ہے جس کی تین جلدیں پہلے شائع ہو چکی تھیں اور تین اب شائع ہو رہی ہیں۔ تحقیق اور مطالعے کا یہ شاہکار گذشتہ دس سال کی بہترین پیداوار ہے۔ باقی بہت سی کتابیں سیاسیات اور سیاسی حالات کے متعلق شائع ہوئی ہیں۔

براعظم کے متاثر حالات کے متعلق بہت سی "نامہ نگارانہ" قسم کی کتابیں چھپی ہیں۔ کوئی قابل ذکر ناول دیکھنے میں نہیں آیا۔ یوں شائع تو بہت سے ہوئے ہیں۔

ایک دوسرے فن میں حسب معمول بحث کا سلسلہ جاری ہے۔ اس مرتبہ اپسٹائن کے نئے مجسمے "آدم" کے متعلق۔ لیکن مجموعی طور پر اس کے متعلق یہ رائے قائم کی جا رہی ہے کہ اس مجسمے سے بڑی طاقت اور بصیرت کا اظہار ہوتا ہے۔ میں نے جب یہ مجسمہ پہلی بار دیکھا تو میری نظر جم نہیں سکی۔ کیونکہ اس ناقابل تعرض، اُمنڈتی ہوئی قوت اور اُبھرنے کی اس تمنا کا تاثر ہی مجھ پر کچھ اس طرح حاوی ہو گیا۔ یہ گویا انسان کے زمین سے اُٹھنے کی مثال ہے۔ اس سے پہلے کسی مجسمے نے مجھے اس طرح مرعوب اور متاثر نہیں کیا تھا۔

موسم۔۔۔ یہ گرمیاں کچھ عجیب سی ہیں۔ دم گھٹتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کئی بار گرج دار طوفان آئے اور جھڑیاں لگیں۔ جو لوگ چھٹیاں منا رہے ہیں ان کے لئے تو موسم تکلیف دہ ہے مگر گھاس رس دار ہے اور درخت خوب گھنے ہیں۔

سیاسی صورت حال پیچیدہ ہے۔۔۔ بہت زیادہ۔ تمہارے سر میں یہ خیال کہاں سے سما گیا کہ میونک کی شرمناک صورت حال کے بعد ہم بچ جائیں گے۔ ہاں یہ تو بتاؤ کہ تمہیں معلوم ہوا یا نہیں کہ ہیروشا کو جرمنوں نے قید کر لیا ہے۔ معلوم نہیں وہ زندہ بھی ہے یا ختم ہو چکا۔ دنیا بھر کی حالت ذلیل ہے۔ فرانس میں ولادیے ایک غیر سرکاری آمرانہ حکومت چلا رہا ہے۔ یہاں کا جو حال ہے سو ہے ہی۔ ترکی، اس جمہوری گلے میں نئے رنگروٹ بھیڑ کی طرح بھرتی ہوا ہے۔ پولینڈ میں بدترین قسم کی فوجی آمریت ابھی تک باقی ہے۔ لیکن بہرحال انہی ممالک کو اس زمانے کی سب سے بڑی بدنہاد طاقت سے مقابلہ کرنا ہے۔ دان تسگ کے معاملے میں ہٹلر اگر کوئی قدم نہ اٹھائے تو اس کے وقار کو اس ملک میں صدمہ پہنچے گا۔ جہاں وہ اگر برسر اقتدار رہنا چاہے تو اس صدمے کو برداشت نہیں کر سکے گا۔۔۔۔۔ یعنی جرمنی میں۔ اگر وہ قدم اٹھائے اور جمہوریتیں مقابلہ نہ کریں تو ہٹلر مرغ کی طرح بانگ دے گا اور جمہوریتوں کا وقار خاک میں مل جائے گا۔ اگر ہٹلر قدم اٹھائے اور جمہوریتیں مقابلہ کریں۔ تب تو ظاہر ہے کیا نتیجہ ہو گا۔۔۔۔ جنگ۔

چنانچہ ہر ایک اس کا منتظر ہے کہ کون اگلا قدم اٹھاتا ہے۔ مبصروں کا اندازہ ہے کہ غذا اور مزدوروں کی قلت کی وجہ سے آئندہ فصل کٹنے تک ہٹلر کوئی اقدام نہیں کرے گا۔۔۔ پھر؟

مجموعی طور پر سب یہی کہتے ہیں کہ ٹھہرو، دیکھو کیا ہوتا ہے۔ صورت حال کی نزاکت کا احساس برابر باقی ہے۔ حالانکہ اب یہ ایک مسلسل پستی کی طرح محسوس ہوتا ہے۔ سخت خوف کی صورت میں نہیں۔ حالات اس قدر تیزی سے بدل رہے ہیں کہ اس ہفتے تک کوئی نہیں کہہ سکتا، اگلے ہفتے میں کیا پیش آنے والا ہے۔"

سفر اور روداد سفر — معلومات اور محض معلومات — تاریخ، تہذیب اور ثقافت پر علمیت بھرا اظہار خیال، کیا کسی تحریر کو ناول بنانے کے لئے کافی ہیں؟؟ کیا کوئی ناول ہمیں محض "جاننے" (To Know) کی ترغیب دیتا ہے یا "جینے" کا سلیقہ بھی سکھاتا ہے؟ اس کا جواب یہی ہو گا کہ ناول، ناول ہے، فکشن کا حصہ ہے، یہاں حقیقت پر مجاز کا اور مجاز پر حقیقت کا التباس ہوتا ہے — یہاں محض

حقائق کا بیان کر دینا کافی نہیں ہوتا بلکہ حقیقت میں کچھ پوشیدہ ہونے کے امکانات پر بھی روشنی ڈالی جاتی ہے۔

عزیز احمد نے دراصل گریز کے پردے میں اپنی علمیت اور سفرنامے کو نعیم کے کردار کی صورت میں ناول کا شکل دینے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گریز نہ اچھا ناول بن سکا اور نہ بہتر سفرنامہ بلکہ اسے ایک ''سفرنامہ ناول'' کہا جا سکتا ہے۔ عزیز احمد نے خود اپنے ناول ''ایسی بلندی ایسی پستی'' کو تجزیاتی ناول کہا ہے اور محمد حسن عسکری اور سہیل بخاری اسے اجتماعی ناول کا نام دیتے ہیں۔ اسی طرح گریز بھی ناول کے بنے بنائے ''فنی چوکھٹے'' میں فٹ نہیں بیٹھتا — اسے ہم ایک ''سفرنامہ ناول'' کہہ سکتے ہیں۔

سفرنامہ ناول جیسی صنف اردو میں موجود ہے یا نہیں اس کی بابت میری رائے محفوظ ہے۔ باقی محققین اس کی طرف توجہ دے سکتے ہیں۔ میرے نزدیک جس تحریر میں سفرنامہ کا حصہ غالب ہو اور اس میں ناول کی سی دلچسپی بھی برقرار ہو، اسے سفرنامہ ناول کہا جا سکتا ہے چونکہ ناول کی طرح سفرنامہ میں بھی قاری کے حصے میں حیرانی آتی ہے اور وہ سفرنامہ نگار کی ذہنی اور جذباتی کیفیت سے بھی واقف ہوتا رہتا ہے۔

Interaction یعنی رابطہ سفرنامہ ناول کی بنیادی پہچان ہو سکتی ہے کیونکہ وہ یعنی سفرنامہ ناول نگار انسان سے، اشیاء سے، مقامات سے، تہذیب اور ثقافت سے مختلف سطحوں پر ارتباط پیدا کرتا رہتا ہے۔ محض ناول نگاری کی طرح بقول فارسٹر کسی شخص کی صرف داخلی زندگی کی عکاسی نہیں کرتا اور نہ یہ ڈلٹن مرے کے مطابق کردار کی جذباتی اور احساسی کیفیات کو پیش کرنے پر ترجیح دیتا ہے بلکہ وہ قاری کو کردار کی داخلی دنیا سے زیادہ سیاحانہ مزاج کو خوراک فراہم کرتا ہے۔

عزیز احمد نے گریز کے ذریعے اصلاً ہمیں یعنی قاری کو نعیم کی داخلی دنیا نہیں بلکہ اس کی نگاہوں سے خارجی دنیا کی سیر کرائی ہے۔ عبدالسلام صدیقی نے اپنی کتاب بیسویں صدی میں اردو ناول میں دبی زبان میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ:

آگ اور گریز کو دیکھ کر ایک احساس اور ہوتا ہے کہ ان کے بیانات میں کہیں کہیں

سفرنامے کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان دونوں ناولوں کے موضوع عزیز احمد کو ان مقامات کے سفر کے ذریعہ حاصل ہوئے۔ عزیز احمد نے اپنی معلومات سے کافی فائدہ اٹھایا ہے۔ اصل میں بنیادی چیز یہی معلومات ہیں۔ جنہیں مصنف نے ناول کا رنگ دے کر پیش کیا ہے۔۔۔۔

''۔۔۔۔(گریز کے) بیانات بالکل اس قسم کے ہیں جیسے سفرناموں میں ملتے ہیں۔ یہ حصے اچھی بیانیہ نثر کے نمونے ضرور پیش کرتے ہیں مگر ساتھ ہی ناول میں سفرنامے کا رنگ بھی پیش کر دیتے ہیں۔''

میں نے گریز کا کئی بار بالاستیعاب مطالعہ کیا اور ہر بار اسے خالص ناول کے بجائے سفرنامہ ناول کے نزدیک پایا۔ چونکہ اس میں ناول کے فنی تقاضے کم اور سفرنامے جیسی معلومات زیادہ ہیں — میرا یہ خیال میرے ذاتی مطالعے اور ناول کے فنی سروکار کی روشنی میں وجود میں آیا ہے — جس سے کسی کا متفق ہونا ضروری نہیں — لیکن اس پر بحث کی گنجائش موجود ہے۔

✓

پہلا حصہ

پہلا باب

بخار

صبح سویرے سے لے کر بارہ بجے تک دالان میں دھوپ رہتی۔ ایک در پر جوہی کی بیل تھی۔ اس حصے میں ذرا ٹھنڈک رہتی تھی۔ بیچ کے در سے آنے جانے کا راستہ تھا۔ اسی در کے سامنے دالان میں ایک میز اور ٹوٹی کرسیاں تھیں۔ میز پر کتابوں کا انبار رہتا اور آخری در کے مقابل پلنگ بچھا ہوا تھا۔ جس پر ایک موٹا سا گدا تھا اور اس کا بچھونا جو ایک دو تکیوں اور ایک کمبل پر مشتمل تھا۔ دن کو پلنگ پر بھی کتابیں پڑیں رہتیں۔

جس دن کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ فروری کے ان دنوں میں سے تھا جب حیدرآباد میں جاڑے (برائے نام ہی سہی) گرمی کے موسم میں بدلنے لگتے ہیں۔ دن بھر خفیف سی لیکن ناگوار گرمی تھی جس کی وجہ سے نعیم نے پڑھتے پڑھتے کئی بار دل میں کہا ''ابھی سے اس قدر گرمی شروع ہو گئی۔''

دوپہر کے کھانے کے بعد دھوپ بھی دالان سے جا چکی تھی۔ صرف دالان کے کھلے ہونے کی وجہ سے فضا میں گرمی کی سی تاثیر تھی۔ نعیم پڑھتے پڑھتے سو گیا اور ساڑھے تین بجے کے قریب اٹھا تو سر میں کسی قدر گرانی تھی۔ اس نے کپڑے بدلنے کا ارادہ کیا۔ دالان کے اندر ایک چھوٹی سی کوٹھری میں اس کے کپڑوں اور کتابوں کے صندوق تھے۔ اس نے سب قمیصوں کا جائزہ لیا۔ کوئی ٹھیک حالت میں نہ تھی۔

کسی کے کف پھٹ گئے تھے۔ کوئی کالر کے قریب کسی قدر پھٹی ہوئی تھی۔ غرض ان میں ایک قمیص کسی قدر بہتر حالت میں تھی، وہ نکالی۔ اس طرح ایک پاجامہ اور شیروانی انتخاب کی پھر کپڑے پہن کے وہ دالان میں آ کر بیٹھ گیا۔ بازار سے اس نے ایک آنے کی چائے کی پیالی منگوائی۔ بہت گاڑھی چائے، جس پر نصف انچ موٹی بالائی کی تہ تھی اور اس کے متعلق اکثر دوستوں کا نظریہ تھا کہ اس میں نشہ بھی ملا ہوتا ہے تا کہ جو لوگ اس چائے خانے کی چائے پیتے ہیں ہمیشہ پیتے رہیں۔ چائے کی پیالی کے ساتھ ہی ٹین کا ایک میلا سا چمچہ بھی چائے خانے سے آتا تھا۔ نعیم کو یہ چمچہ چائے سے زیادہ ناگوار تھا۔

اس نے چائے پینے کے بعد پائتابے پہنے جو بہت میلے تھے اور ان کی وجہ سے اس کے پیروں سے بو آتی تھی۔ جوتے پہنتے ہوئے اس نے دالان کی سرخ مٹی کو دیکھا جس پر کسی قسم کا فرش نہیں تھا اور اس سے گرد اڑ کر بہت مدت تک اس کے اس پلنگ اور بچھونے پر پڑتی رہی تھی۔

''خدا وہ دن لائے کہ مجھے اس دالان سے باہر کہیں اور رہنا نصیب ہو یا اس دالان کو فرش نصیب ہو۔''

دل میں کہا اور اس کے بعد وہ باہر چلا گیا۔

عابد شاپ سے اس نے قمیصوں کا کپڑا خریدا اور درزی کو دیا۔ اس احساس کے ساتھ کہ ممکن ہے مہینے میں پندرہ دن چائے ناغہ کرنا پڑے۔

سیمنٹ کی سڑکوں پر سے ہوتا ہوا وہ ایک گلی میں مڑا۔ جہاں نیچی نیچی دکانوں میں ٹین کا سامان، غلہ اور مٹھائیاں بکتی تھیں۔ اس کے آگے ایک سیندی خانہ تھا۔ جس کے سامنے سر شام ایک ہجوم رہتا تھا اور آگے دو تین پختہ مکانات تھے لیکن چھوٹے چھوٹے۔ ان میں دیسی عیسائی رہتے تھے۔ ان کی لڑکیاں کبھی گہرے نیلے یا گہرے آسمانی رنگ کی فراکیں پہن کے نکلتی تھیں اور نعیم ان کی طرف حسرت کی نظروں سے دیکھتا تھا۔ اس کے بعد کچھ کھلا ہوا حصہ تھا۔ کچھ اور دکانیں تھیں۔ بیچوں بیچ ایک نالی بہتی تھی دکاندار اور ان کے گاہک سڑک کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے والوں کو باہم گالیاں دیا کرتے۔ اس کے آگے کچھ کھلا ہوا میدان تھا جس میں بدبودار نالیاں بہتی تھیں اور پھر وہ محلہ آتا تھا جو جدید حیدرآباد کے اچھے محلوں میں شمار ہوتا ہے۔ یعنی صفدر نگر، یہاں سیمنٹ کی ایک سڑک تھی جس پر بند اور کھلی موٹروں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ پیدل چلنے والے سڑک کے کنارے اس حصے پر چلتے تھے جہاں سیمنٹ کی تہ

نہیں ہے۔

صفدر نگر میں نئی وضع کے بہت سے مکانات بنے تھے۔ مکانات کے متعلق حیدر آباد میں عجیب و غریب تجربے ہوئے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں۔ انہی نئے مکانوں میں سے ایک میں عاقل خاں رہتے تھے۔ ان کی بیوی خاندان بھر میں ''خانم'' کے نام سے مشہور تھیں۔ ان کے نام کے سوا اگر کسی اور چیز کو شہرت حاصل تھی تو ان کے حُسنِ اخلاق اور ظاہر داری کو، ان دونوں میں تمیز کرنا دشوار تھا۔

نعیم اپنے خیالات میں غرق چلا جا رہا تھا۔۔۔ جن میں صرف موٹروں کی آمد و رفت اور پاس سے گزر جانے کے باعث خلل واقع ہوتا تھا۔۔۔ بایاں شانہ دائیں شانے کے مقابل زیادہ جھکا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

عاقل خاں صاحب کے مکان میں پہنچ کر اس نے کھڑکیوں کی طرف دیکھا۔ کسی قدر خاموشی سی تھی۔ وہ درمیان کے ہال میں پہنچا جہاں ایک پُرانا صوفہ، چند بے ربط کرسیاں اور کچھ ایسا فرنیچر جس کا ڈرائنگ رُوم سے کوئی خاص تعلق نہیں تھا، بے ترتیبی سے پڑا تھا۔

یہاں بھی خاموشی تھی۔ وہ پردہ اٹھا کے اندر پہنچا جہاں ایک بہت وسیع دالان تھا اور دالان کے دونوں جانب دو بڑے بڑے کمرے، دالان میں بھی کوئی نہیں تھا۔۔۔ سیدھے ہاتھ کے کمرے میں ایک پلنگ کے پاس کرسی پر خانم بیٹھی تھیں۔ ایک تپائی پر کچھ دوائیں رکھی تھیں اور پلنگ پر ہلکی سی رضائی اوڑھے خانم کی لڑکی بلقیس لیٹی تھی۔

بلقیس کے بال ہلکے بھورے رنگ کے تھے جو ہندوستانی مسلمانوں میں کم ہی پائے جاتے ہیں۔ خانم کہا کرتی تھیں کہ ان کے بال بھی ہلکے بھورے تھے مگر ان کی ماں نے شاید کھوپرے یا کسی اور چیز کا تیل لگا لگا کر سیاہ کر دیے۔ بلقیس کا چہرہ گول تھا اور رنگ اس قدر صاف جیسے اینگلو انڈین لڑکیوں کا، اس کی عمر تیرہ برس کی تھی مگر اچھی خاصی بھرے بھرے جسم والی تھی۔ اس کی ہڈی چوڑی تھی۔ بچپن ہی سے یہ لڑکی جاذبِ توجہ تھی۔

لیکن بلقیس سے پہلے خانم کا تعارف ضروری ہے۔ خانم کی عمر اس وقت کوئی پینتیس سال ہوگی لیکن باوجود اس کے کہ تین بچوں کی ماں تھیں، ان کے چہرے پر حُسن کے آثار ویسے ہی باقی تھے۔ جہاں تک چہرے کی تراش کا تعلق ہے وہ بلقیس سے زیادہ خوبصورت تھیں۔ ہاں ان کا رنگ بلقیس سے دبتا ہوا تھا۔

بلقیس کا دہانہ اچھا نہیں تھا، خانم کا بہت خوبصورت تھا۔ ناک نقشہ میں بلقیس کو ماں کی میراث نہیں ملی تھی۔

نعیم نے پوچھا ''کیوں خیریت ہے۔ بلقیس کی طبیعت کیسی ہے؟''

خانم نے کہا ''اسے بخار آ گیا ہے۔ ڈاکٹر نے ٹائیفائڈ تشخیص کیا ہے۔''

نعیم نے تفصیلات پوچھیں، کب سے بخار ہے؟ کس کا علاج ہے؟ بہت فکر و تردّد کا اظہار کیا اور اس کے بعد تیمارداری کے لیے آمادگی ظاہر کی۔

اس دن سے وہ کالج سے چھٹی کے بعد سیدھا خانم کے یہاں آنے لگا اور تیمارداری کے سلسلہ سے جو خدمت اس کے سپرد کی جاتی اسے انجام دیتا۔

(۲)

ایک دن سہ پہر کے وقت بلقیس سو گئی تھی۔ خانم دالان میں تخت ہی پر لیٹے لیٹے اُونگھ رہی تھیں اور بے خیالی میں ان کے پیر گھٹنوں تک کھلے ہوئے تھے۔ نعیم ایک آرام دہ کرسی پر لیٹا ہوا پڑھ رہا تھا۔ اس کی نظر خانم کے پیروں پر پڑی۔ پھر خانم کے چہرے پر جو نیند میں اور بھی بھلا معلوم ہوتا تھا اور اس کے ذہن میں برنرڈ شا کے ان ڈراموں کا خیال آیا جن میں کم عمر نوجوان تیس سالہ عورتوں کے عشق میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اس کے بعد وہ خانم کی پوری زندگی کے متعلق سوچنے لگا۔ جو کچھ اس نے دوسرے سے سنا تھا، جو کچھ خود دیکھا تھا، ایک فلم کی طرح اس کی نظروں کے سامنے پھرنے لگا۔

خانم کے والد اورنگ آباد میں وکیل تھے۔ آج تک ان کا مکان وہاں ہے اور ان کا بیٹا وہاں ڈاکٹر ہے۔ خانم سے بڑی ان کی ایک اور بہن تھیں۔۔۔ خانم سے کوئی سات سال بڑی۔ ان کی شادی پندرہ سولہ سال کے سن میں ہو گئی تھی۔ خانم ابھی چھوٹی تھیں۔ جب خانم بڑی ہوئی تو گھر میں اکیلی تھیں۔ کیونکہ ان کی ماں گٹھیا میں مبتلا ہونے کے باعث صاحبِ فراش رہتیں اور ان کے والد دن کا وقت کچہری میں اور شام کا وقت کلب میں عہدہ داروں کی خوشامد میں گزارتے۔

نعیم نے سنا تھا کہ بچپن میں خانم بہت شوخ اور طرار تھیں اور یہ کوئی عجیب بات نہیں کیونکہ خانم کی شوخی اور ظرافت عمر بھر باقی رہی۔ اس لیے لوگ خانم سے مل کر خوش ہوتے تھے۔

خانم نے تھوڑا بہت پڑھنا لکھنا سیکھا تھا مگر اس زمانے میں عورتوں کے لکھنے پڑھنے کا رواج ذرا کم

ہی تھا۔ اختلاط میں یہ کمی اور زیادہ تھی۔ مگر خانم یوں بہت سمجھ دار تھیں۔

خانم کی دشمنوں سے نعیم نے خانم کے متعلق ایک قصہ سنا تھا۔

قصہ یہ تھا کہ خانم بالا خانے سے چلمن اُٹھا اُٹھا کے سڑک پر آنے جانے والوں پر کنکر پھینکا کرتی تھیں۔ ایک دن کوئی منچلا نوجوان ان کی اس ادا پر عاشق ہو گیا۔ خانم کی عمر کوئی پندرہ سال کی ہو گی۔ عاقل خاں سے خانم کی نسبت ہو چکی تھی۔ اس کمسنی اور الہڑ پن میں کہا جاتا ہے کہ انہیں ان ذمہ داریوں کا احساس نہ رہا جو ہندوستانی لڑکیوں کے لیے زندگی سے زیادہ اہم ہیں۔ منچلا نوجوان کسی نہ کسی ترکیب سے خانم کے کمرے میں پہنچا۔ معلوم نہیں اس عشق نے کیا مدارج طے کیے۔ مگر یہ ضرور مشہور ہے کہ خانم کے والد کو شبہ ہوا، وہ خانم کے کمرے میں پہنچے۔ خانم خود چراغ لے کر آگے بڑھیں کہ آیئے دیکھیے یہاں کوئی نہیں۔ کمرے کے بیچ میں پردہ بندھا تھا۔ پردے کے پیچھے کچھ آہٹ سی معلوم ہوئی اور خانم کے والد اس طرف لپکے لیکن اتنے میں فرش سے مٹھی بھر مٹی اٹھا کر خانم نے اپنے والد ماجد کی آنکھوں میں جھونکی اور منچلا عاشق یہ جا وہ جا۔

اس رات غالباً خانم کے والد اپنی صاحبزادی کے لیے اور اپنے لیے طرح طرح کی سزائے موت تجویز کرتے رہے۔ چلو بھر پانی سے لے کر تلوار اور طمنچے، پسی ہوئی کانچ اور زہر تک۔ اور خانم کی والدہ اپنا سر پیٹتی رہیں۔ خانم روتی رہیں۔ لیکن صبح کو خانم کے والد نے نہ اپنا کام تمام کیا اور نہ اپنی لڑکی کا۔ ہاں صاحبزادی کو شادی کے وقت تک قید رکھا اور شادی کی تاریخ جلد مقرر کرائی۔ ہر طرح کی کوشش کی کہ بدنامی اور زیادہ نہ ہو۔ پھر بھی ایسی خبریں کہیں چھپتی ہیں۔ قریب تھا کہ نسبت چھوٹ جائے مگر عاقل خاں کے والد وضع دار بزرگ تھے۔ انہوں نے اس قصہ کو بہتان قرار دیا اور عاقل خاں سے خانم کی شادی ہو گئی۔

شادی کی پہلی رات کو ممکن ہے عاقل خاں کو اس کا علم ہو جاتا کہ ان کی بیوی صاحبہ کنواری ہیں یا نہیں۔ مگر عاقل خاں اس زمانے میں کسی طرح اسم باسمٰی نہیں تھے اور شب عروسی کو ضرورت سے زیادہ بوکھلائے ہوئے تھے۔

اس لیے نہ انہوں نے یہ غور کرنے کی زحمت گوارا کی اور نہ انہیں اس کا ہوش تھا۔

یہ پورا قصہ نعیم نے متعدد بار سنا تھا۔ مگر اسے کبھی اس پر یقین نہیں آیا۔

شادی کے بعد خانم پر بہت سے بہتان باندھے گئے۔ مثلاً یہ کہ عاقل خاں کے بھائی فاضل خاں سے ان کے تعلقات ہیں۔ مگر نعیم کو یقین تھا کہ کم از کم یہ الزام تو بالکل جھوٹ ہے۔ کیونکہ اس نے بلقیس کی علالت ہی کے زمانے میں دوسرے کمرے سے خانم اور فاضل خاں کو باتیں کرتے سنا تھا۔ ان دونوں کو اس کی موجودگی کا علم نہیں تھا۔ باتیں ایک عورت کے متعلق تھیں جو فاضل خاں کی داشتہ تھی۔ فاضل خاں کے لہجے میں وہی تعظیم تھی جو دوسروں کے سامنے ہوتی تھی۔ طرز کلام اور نفسِ گفتگو سے نعیم کو یہ یقین ہو گیا کہ یہ الزام غلط ہے۔

مگر یوں خانم کافی شوخ و شنگ تھیں۔

(۳)

بلقیس خانم کی اولاد میں سب سے بڑی تھی۔ پہلے پہل تو خانم کو ذرا افسوس ہوا کہ کاش لڑکا پیدا ہوتا مگر بہت جلد یہ تمنا بھی پوری ہو گئی۔ دو تین سال کے بعد ایک صاحبزادے پیدا ہوئے اور دو تین سال کے بعد ایک اور۔ خانم کا افسوس بہت جلد اس وجہ سے بھی کم ہو گیا کہ جو کوئی بلقیس کو دیکھتا، کہتا ''کیسی پیاری لڑکی ہے''۔ بچپن میں اس کے بال اور بھی زیادہ ہلکے بھورے تھے اور رنگ بھی انگریزوں کا سا تھا۔ خانم اپنے دل میں کہتیں کہ بڑی ہو کر یہ لڑکی میموں سے زیادہ خوبصورت نکلے گی لیکن انہیں اس کا خیال بھی کبھی ضرور آتا کہ جب یہ لڑکی ہو گی تو وہ خود بوڑھی ہونے لگیں گی۔ مگر یہ سب مستقبل بعید کی باتیں تھیں اور اس زمانے میں تو خانم ماشاء اللہ جوان اور خوبصورت تھیں۔

جوں جوں بلقیس بڑھنے لگی خانم کا شوق بھی بڑھنے لگا کہ ان کی لڑکی کسی میم سے کم نہ ہو۔ انگریزی انگریزوں کی طرح بولے۔ انہی کی طرح رہے۔ خانم کے کچھ متمول عزیز حیدرآباد میں تھے اور ان کی لڑکیاں پردہ نہیں کرتی تھیں۔ یہاں تک کہ ان کی ایک لڑکی نے اپنے والدین کی مرضی کے خلاف بجائے اپنے بڑے چچیرے بھائی کے چھوٹے چچیرے بھائی سے شادی کی تھی۔ الغرض ان باتوں سے خانم نے، اور ان کی دلیلوں سے قائل ہو کے عاقل خاں نے یہ تصفیہ کیا کہ ان کی لڑکی انگریزی پڑھے گی اور انگریزی بولے گی۔ اور جب تک سن بلوغ کو پہنچے (اس کے بعد دیکھا جائے گا) انگریزی کپڑے پہنے گی۔

عاقل خاں بیچارے میٹرک فیل تھے۔ پہلے وکالت درجہ سوم کا امتحان دیا۔۔۔ کچھ عہدہ داران مال وعدالت کی توجہ سے ان کا کام چل نکلا۔ اس کے بعد جوڈیشیل امتحان پاس کیا اور وکیل درجۂ اول ہو گئے، اپنے نام کے آگے وکیل ہائی کورٹ لکھنے لگے۔ قحط کے زمانے میں تھوڑی بہت جائیداد پیدا کر لی اور اس زمانے میں جب کہ صفدر نگر تقریباً دلدل اور ملیریا کا گھر تھا، بہت سی زمین خرید لی۔ اس کے بعد جب صفدر نگر شہر کے بہت اچھے محلوں میں گنا جانے لگا اور وہاں بہت سے مکانات بن گئے تو زمین بہت منافع کے ساتھ بیچی۔ صرف ایک پلاٹ اپنے پاس باقی رکھا اور اس پر بہت اعلیٰ درجے کا جدید وضع کا مکان بنوالیا۔ یہ وضع حیدر آباد میں ''جرمن ڈیزائن'' کے نام سے مشہور ہے۔

قصہ مختصر عاقل خاں۔۔۔ جو برعکس نہند نام زنگی کافور سے قطع نظر۔۔۔ تعلیم سے بھی تقریباً محروم تھے، اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ خانم کی ڈور رس نظر کی قدر کریں اور اپنی لڑکی کو انگریزی قسم کی اعلیٰ درجہ تعلیم دلائیں۔

اس زمانے میں کئی اینگلو انڈین عورتوں نے بورڈنگ ہاؤس کھول رکھے تھے جن میں حیدر آباد کے ترقی پسند نواب اپنی چار آٹھ برس کی عمر کی لڑکیوں اور اسی عمر کے لڑکوں کو داخل کر دیا کرتے اور ان کے بچے ان کو پاپا اور اپنی ماؤں کو ماما یا ممی کہا کرتے۔ نیز انگریزی اتنی اچھی بولنے لگتے کہ یونی ورسٹی کے گریجویٹ کو ان بچوں کے سامنے بات کرنے کی ہمت نہ ہوتی۔ ان بچوں کے والدین کا یہ خیال تھا کہ سب سے اچھا بورڈنگ ہاؤس وہی ہے جس کی فیس سب سے زیادہ ہو۔

انہی میں سے ایک بورڈنگ ہاؤس کا نام کارنش کلف (Cornish Cliff) تھا۔ بلقیس کو عاقل خاں نے اس میں داخل کر دیا۔ میڈم جب ٹوٹی پھوٹی اُردو میں باتیں کرتیں تو عاقل خاں اس اعزاز سے پھولے نہ سماتے اور خانم اس درجہ مرعوب تو نہ ہوتیں مگر خوش ضرور ہوتیں۔ بلقیس جب تعطیلوں میں گھر آتی تو خانم اس کے لیے انگریزی کھانے پکواتیں اور جب اسے دیکھنے کارنش کلف جاتیں تو چاکلیٹ لے جاتیں۔

خانم اور عاقل خاں کے بعض عزیزوں نے انہیں یہ سمجھانا چاہا کہ انگریزیت کی نقل اور چیز ہے اور انگریزوں کے ہنر سیکھنا دوسری بات ہے۔ مگر جب بلقیس گھر آ کے پاپا اور ماما سے صاف صاف انگریزی میں پیاری پیاری باتیں کرتی تو انہیں یہ محسوس ہونے لگتا کہ ان کے جاہل عزیز ان سے جلتے ہیں اور اس

کے بعد وہ یا تو اس قسم کے اعتراضات کا سخت جواب دیتے یا بے توجہی سے اس کان سنتے اور اس کان اُڑا دیتے۔

(۴)

دن کی گرمی میں نعیم اپنی ٹوٹی پھوٹی آرام کرسی پر لیٹ جاتا تو عشرت منزل پہنچ جاتا۔ عشرت منزل میں بہت سی تصویریں تھیں، بہت سے مجسمے تھے اور بہت سی جاندار چلتی پھرتی عورتیں تھیں۔ عشرت منزل میں مونا لسا تھی۔ ولما بنکی تھی۔ گار بنا گاربو تھی۔ عشرت منزل میں ان تمام عورتوں کی تصویریں تھیں جن کو اس نے ریل گاڑیوں کی کھڑکیوں سے جھانکتے دیکھا تھا اور پسند کیا تھا۔ اور بھی بہت سی عورتیں تھیں جن کے نام وہ کسی کو نہیں بتانا چاہتا تھا۔ عشرت منزل میں آہستہ آہستہ بلقیس کی تصویر کھنچ رہی تھی۔ یہ تصویر مجسمہ بن گئی اور مجسمہ چلنے پھرنے لگا۔ زندہ ہو کر یہ مجسمہ اور بہت سے مجسموں کی طرح، کبھی سب کے ساتھ کبھی تنہا عشرت منزل میں نعیم کے ساتھ گشت لگاتا۔ کبھی بیداری میں، کبھی خواب میں، کبھی اس حالت میں جب حواس نیم خفتہ اور نیم بیدار ہوتے ہیں۔

عشرت منزل کے ساتھ عموماً کوئی نہ کوئی کہانی وابستہ ہوتی۔ عشرت منزل ایک محل سرا تھی جس کی ہر رہنے والی اور نعیم میں ایک معاشقہ ہو چکا تھا اور معاشقہ بھی وہ جو داستان کی سی شکل رکھتا تھا۔

جب بلقیس عشرت منزل میں آئی تو داستان بخار کے متعلق تھی۔ نعیم نے جو تیمار داری کی ہے اس سے رفتہ رفتہ بلقیس کو محبت ہوتی جاتی ہے۔ وہ راتوں کو اُٹھ کر دیکھتی ہے۔ کبھی نعیم اس کی پیشانی پر یوڈیکلون کی پٹیاں رکھ رہا ہے۔ کبھی اس کے پلنگ کے قریب کتاب پڑھ رہا ہے اور اونگھ رہا ہے اور اسی طرح نعیم نے جاگ جاگ کے تین ہفتے گزارے ہیں وہ دن کو بھی نہیں سویا اور اس کی آنکھیں جل رہی ہیں۔ اور بالآخر ایک روز صبح ہوتے وقت جب سب لوگ سوئے ہوتے ہیں، بلقیس اس سے کہتی ہے سو جاؤ۔ وہ نہیں سوتا۔ بلقیس پھر کہتی ہے۔ وہ کچھ جواب نہیں دیتا۔ بلقیس کی آنکھیں صاف صاف بتا رہی ہیں کہ وہ اس کی اس محبت کی قدر کرتی ہے۔ بلقیس کو بھی اس سے کچھ محبت ہے، بیشک محبت ہے، بہت محبت ہے۔ بلقیس کے رخسار جل رہے ہیں۔۔۔

اتنے میں نعیم کے کوئی دوست اس سے ملنے آئے اور وہ اس سلسلۂ خیال سے چونک پڑا۔ اس کے بعد ایک گلاس ٹھنڈا پانی پیا تو گویا پانی کے ساتھ عشرت منزل بھی پگھل کر حلق کے نیچے اتر گئی۔

دوسرا باب

نعیم کی ڈائری کے کچھ ورق

۲۲ رجون ۱۹۳۵ء۔۔۔اب جو میں نے کھڑکی سے جھانک کے دیکھا تو صبح کی سپیدی اچھی طرح پھیل چکی تھی۔ میں اٹھ بیٹھا اور بستر کو جلدی جلدی باندھنے لگا۔ اتنے میں کوئی اسٹیشن آ گیا۔ گاڑی تین یا چار منٹ ٹھہری۔ ایک برتھ پر مہتمم صاحب آبکاری بلا کچھ اوڑھے مزے میں سو رہے تھے۔ معلوم ہوتا ہے موٹے آدمیوں کو سردی نہیں لگتی۔ مجھے تو اپنے قریب کی کھڑکیاں بند کر دینی پڑی تھیں اور اس کے علاوہ کمبل اوڑھنا پڑا تھا۔ نیچے کی ایک برتھ اور اوپر کی دو نشستوں پر ریلوے کے تین ملازمین سو رہے تھے۔ جب اسٹیشن آیا تو ان میں سے ایک صاحب جاگ اٹھے اور "بوگل کنھ" کی انگریزی میں دوسروں کو پکارا۔ وہ بھی یکے بعد دیگرے اٹھے اور اپنے اپنے بستر لپیٹنے لگے۔ پیچھے کے ڈبے سے باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے اپنی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو نواب صاحب کا ہاتھ ٹرین سے باہر نکلا ہوا تھا۔ اب کے مولا علی کے اسٹیشن پر گاڑی ٹھہری۔ میں نیچے اتر کے پیچھے کے ڈبہ میں پہنچ گیا جس میں نواب صاحب اور سب ہمسفر تھے۔ ملازمین ان سب کے بستر باندھ کر نیچے اتر چکے تھے۔

نواب صاحب نے ان لوگوں سے کہا "ان کا بچھونا بھی تو باندھ دو۔"

میں نے کہا "میں اپنا بستر باندھ چکا"

انہوں نے پوچھا "باندھ چکے؟"

میں نے کہا "جی ہاں!"

اس پر سب ہنسنے لگے۔ غنیمت ہے کہ آج نواب صاحب کے مذاق میں طنز کا وہ اثر نہیں تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے مجھ سے پوچھا "حیدرآباد شروع ہو گیا؟"

نواب صاحب ہنسنے لگے "تقریباً شروع ہو گیا" پھر ڈاکٹر صاحب سے مخاطب ہو کے کہنے لگے "بھئی سنا ڈاکٹر صاحب آپ نے؟ نعیم میاں کہہ رہے ہیں تقریباً شروع ہو گیا" اس پر سب تھوڑا بہت ہنسے۔

کل میں نے تقریباً کا لفظ زیادہ استعمال کیا تھا۔ نواب صاحب کو اور لطف کا بہانہ آ گیا تھا۔

نواب صاحب نے کہا "تم جس ڈبے میں سوئے تھے، وہاں بھی بہت جھکولے کھائے؟"

میں نے کہا "جی ہاں اس سے بالکل ملا ہوا ڈبہ ہے۔ رات کو تقریباً نیند نہیں آئی"

اس تقریباً پر نواب صاحب نے اور پھر سب نے فرمائشی قہقہہ لگایا۔ ڈاکٹر صاحب کچھ مسکرائے۔ ان کی مسکراہٹ کی ایک خاص قسم وہ ہے جس سے پتہ چل جاتا ہے کہ وہ اب کچھ کہنے والے ہیں۔ ان کے ہونٹ کچھ تھرتھرائے۔ پھر انہوں نے کہا "نواب صاحب!"

نواب صاحب نے جلدی سے خشک لہجے میں کہا "جی!"

"تت۔ تت تقریباً پر مجھے ایک قصہ یاد آ گیا۔۔۔ شہزور خاں بھی تقریباً ب۔ ب ب۔ بہ۔ بہت بولتے ہیں۔ ان سے ک ک کسی نے پوچھا، یہ آپ کا۔۔۔ ل۔۔۔ لل۔۔۔ لڑکا ہے۔۔۔ ان کے لڑکے کے مت۔۔۔ مت۔۔۔ ت۔۔۔"

نواب صاحب اور امجد نے یک زبان ہو کے لفظ پورا کر دیا "متعلق۔"

ڈاکٹر صاحب بھی اس اثناء میں اس لفظ کو پورا کرنے پر قادر ہو گئے "متعلق۔۔۔ تو شہزور خاں نے جواب دیا۔۔۔ جی۔۔۔ جی ہاں۔۔۔ تقریباً۔"

اس پر سب خوب ہنسے۔ نواب صاحب نے کہا "بھئی خوب۔"

سکندرآباد اسٹیشن آ گیا۔ نواب صاحب مع تمام ساتھیوں کے اُترے۔ سامان اُترنے لگا۔ صرف میں کاچی گوڑہ اسٹیشن پر اُترنے والا تھا۔ مہتمم صاحب آبکاری بیدار ہو چکے تھے۔ ان کا موٹا زبردست

چہرہ کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے جاتے ہوئے کہا" اچ۔۔۔ اچھا نعیم صاحب کاچی گوڑہ اسٹیشن سے ہمارا سلام کہہ دیجئے گا"

میں نے کہا" بہت اچھا ڈاکٹر صاحب!"

بڑی دیر کے بعد گاڑی چھوٹی۔ میں انتظار کرتے کرتے اکتا گیا تھا۔ موسم بہت اچھا تھا۔ ہلکے ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ جس سے برسات کی خوشبو آتی تھی۔ میں کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا۔ دور دور خوبصورت بنگلے، جامعہ عثمانیہ کا اسٹیشن اور عمارتیں، کاچی گوڑہ اسٹیشن۔ گاڑی ٹھہری، میں اُترا۔ مہتمم صاحب آبکاری سے ہاتھ ملایا۔ تانگے پر گھر پہنچا۔

پاسپورٹ حاصل کرنے کے لیے متعلقہ کچہریوں کا طواف کرنے، دس بجے گیا اور تین بجے واپس آیا۔ سو گیا۔ پھر اُٹھا۔ داڑھی بنائی۔ واپسی میں ریزیڈنسی کے قریب اتر گیا۔ کچھ دیر کے بعد بس آئی۔ صفدر نگر پہنچا۔ راستے میں میں نے کہا" اگر آج میں اس (لڑکی) کو دیکھ لوں گا تو وہ میری ہو کر رہے گی۔"

بلقیس اندر دالان میں در کے پاس کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگی۔" آداب بھائی!"

اس کے چہرے کی بہت سی خصوصیتیں جو صرف اس کے سامنے طرح طرح کی لطیف رنگینیوں کی شکل میں موجود رہتی ہیں اور پھر ذہن سے محو ہو جاتی ہیں، پہلی ہی نظر میں ایک مستقل اور معین حقیقت کی طرح نگاہوں کے سامنے آگئیں۔

اندر کے کمرے میں خانم موجود تھیں۔ بہت محبت سے۔۔۔ یا اخلاق سے ملیں۔ پوچھا "تمہارے متعلق سب طے ہو گیا؟" اور یہ سوال بہت متفکر لہجے میں کہا۔

میں نے کہا" جی ہاں خدا کے فضل سے سب ہو گیا"

کہنے لگیں" کب جاؤ گے؟"

"کہاں؟"

"ولایت کو کب روانہ ہو گے؟"

(بلقیس اندر آگئی۔ اس کا گداز چہاردہ سالہ جسم بل کھاتا ہوا، اس کا ہاتھ دوپٹے کے آنچل کو جو

زمین تک پہنچ رہا تھا، اٹھاتا اور لپیٹتا ہوا۔ اس کا سر سیدھی جانب ایک شان دلربائی سے جھکا ہوا تھا۔ سر کے بھورے بال۔۔۔ مجبور کر دینے والے بال جن کا پانی آج تک میں نے کبھی نہیں دیکھا)

میں نے خانم کے سوال کے جواب میں کہا" ستمبر میں" پھر ان سے پوچھا" آپ وقار آباد سے کب آئیں؟"

"ابھی شام کو!"

میں نے کہا" میں بھی صبح کو اورنگ آباد سے آ رہا ہوں"

بلقیس بولی" خواہ مخواہ انگلستان پڑھنے کے لیے پہنچنے سے کیا فائدہ؟ ہندوستان میں تعلیم نہیں ہو سکتی؟"

خانم نے کہا" تمہارے آئی۔سی۔ایس میں آجانے سے جو لوگ جلتے ہیں ان میں یہ بھی شامل ہے۔"

بلقیس نے حیرت سے سانس کھینچ کر کہا" میں بھلا کیوں جلوں گی؟" اس کے لہجے میں شکایت کی جھلک تھی۔

"نہیں" میں نے کہا" انگلستان تعلیم کے لیے جانا غلامی ہے۔ چونکہ ہم لوگ غلام ہیں اس وجہ سے جاتے ہیں۔ نہیں تو کیا یہاں تعلیم نہیں ہوتی۔ وہاں جا کے صرف شان بڑھ جائے گی"

خانم نے کہا" تم اسے اپنے ساتھ لیتے جاؤ"

بلقیس بولی" نہیں۔ ہم نہیں جاتے۔"

میری نظر بلقیس کی بانہوں پر پڑی۔ اگر اس حسین چہرے، اس ذہانت وجودت اور اس پُرلطف ہلکی سی شرارت کے ساتھ اس نے چھریرا، حسین پھول سا نازک جسم بھی پایا ہوتا تو پھر کیا تھا۔

میں بات بات سے یہ اندازہ کرنا چاہتا تھا کہ کیا خانم نے سچ مچ بلقیس کے لیے مجھے انتخاب کر لیا ہے۔ خانم میرا اس قدر خیال کرتی ہیں۔ میں اس گھر میں اتنا زیادہ آتا جاتا تھا کہ اکثر لوگوں سے بھی میں نے یہی سنا۔۔۔ اور پھر آئی۔سی۔ایس۔

اکثر باتوں سے اور خصوصاً خانم کے اس جملے سے کہ تم بلقیس کو اپنے ساتھ لیتے جاؤ، میرے بر خود غلط مفروضات تقویت پکڑ گئے۔

راستے بھر خیالات کا ایک سلسلہ جاری رہا۔ ایسے خیالات جن کی بنیاد مفروضات پر تھی اور جن کو احساسات نے رنگین بنا دیا تھا۔

اکسلسیئر میں ایک فلم دیکھا۔ اچھا خاصا دلچسپ تھا۔ جتنی توقع تھی اس سے اچھا نکلا۔

۲۳ رجون --- پاسپورٹ کے لیے "پیروی" کرنے شہر جا رہا تھا۔ بس پر سامنے کی نشست پر ایک منشی صاحب ایک طالب علم سے باتیں کر رہے تھے۔ باتیں بہت دلچسپ تھیں۔ "خیر میں نے تیغ یار جنگ کے جنازے کی نماز تو پڑھ لی مگر اب قسم کھالی ہے کہ کسی گزیٹڈ عہدہ دار کے جنازے کی نماز نہ پڑھوں گا" طالب علم نے پوچھا "اور اگر آپ خود کسی گزیٹڈ عہدے تک پہنچ جائیں؟" کہنے لگے "پہلے تو میں یہ دعا کروں گا کہ خدا میرا دماغ خراب نہ کرے اور اگر دماغ خراب ہو گیا تو پھر تم لوگوں کو یہ وصیت ہے کہ میرے جنازے کی نماز نہ پڑھنا۔"

واپس گھر پہنچ کر کچھ دیر سو گیا۔ اُٹھا تو بادل چاروں طرف سے گھرے آ رہے تھے۔ کڑک اور چمک بڑھتی جاتی تھی۔ اس لیے شام کو کہیں نہ جا سکا۔

عشرت منزل اور بلقیس کا تصور

۲۴ رجون --- دن بھر ضروری کاغذات وغیرہ کے سلسلے میں پھرتا رہا۔ پھر عاقل خاں کے یہاں گیا۔ عاقل چچا سو رہے تھے۔ خانم دوسرے پلنگ پر سو رہی تھیں۔ میں نے عاقل چچا کو جگایا۔ انہوں نے کہا "کتنے بجے ہیں؟" میں نے کہا، "چار بجے ہیں" انہوں نے کہا۔ "چار بج گئے۔ مجھے ابھی شیو کرنا اور نہانا ہے" مجھ سے کہنے لگے۔ "تم روزانہ نہیں نہاتے۔ یہ کیا عادت ہے۔ آج تم یہیں نہاؤ۔" میں نے کہا۔ "اچھی بات ہے۔"

اتنے میں گاراج سے موٹر کے نکلنے کی آواز آئی۔ کہنے لگے "نعیم تم بڑے جھوٹے ہو۔ ابھی تین بجے ہیں۔" میں نے کہا۔ "نہیں چچا۔" کہنے لگے "نہیں کیا؟ دیکھو اب بلقیس کو لینے موٹر اسکول جا رہی ہے۔ تین نہیں بجے تو اس وقت موٹر کیسے نکل رہی ہے؟" میں نے کہا "چچا میں نے آپ کو اٹھانے کے لیے کہہ دیا کہ چار بجے ہیں۔ آپ سوتے رہیں گے تو کیا میں دیواروں سے باتیں کروں گا؟" "جاؤ تم بھی

جاؤ۔ دوسرے کمرے میں پلنگ پر لیٹ کے سو رہو۔" میں نے کہا "نہیں آپ سوئیے۔ میں نہاتا ہوں۔" "نہیں، پہلے سو جاؤ پھر نہانا۔"

دوسرے کمرے میں پہنچ کے میں نے شیروانی اتار کے رکھ دی۔ پلنگ پر لیٹ گیا۔ نیند کے آثار نہیں معلوم ہوئے۔ گالسوردی کی Flowering Wilderness میرے پاس تھی۔ اس کو پڑھنا چاہا۔ نہیں پڑھی گئی۔ بند کر دی۔ اتنے میں عاقل چچا کی باتوں کی آواز سنائی دی۔ بلقیس اسکول سے آ گئی تھی۔ اس نے سلام کیا۔ میں نے عاقل چچا سے پوچھا "آپ سوئے نہیں؟" کہنے لگے۔ "نالائق تم نے آ کے مجھے جگا دیا۔" خانم بھی اٹھ چکی تھیں عاقل خاں نے خانم سے کہا۔ "نعیم نالائق نے نہ مجھے سونے دیا نہ تمہیں۔" پھر مجھ سے کہا "جاؤ نہاتے ہو تو نہالو۔ میں شیو کرتا ہوں۔" میں نہانے چلا گیا۔

نہا کے باہر نکلا تو خانم کہیں جانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ بلقیس پہلے ہی سے کپڑے پہنے بیٹھی تھی۔ زرد پاجامہ جس پر بڑے بڑے سُرخ اور سبز بوٹے بنے ہوئے تھے۔ ہلکا زرد دوپٹہ، باریک جالی کا کرتہ اور اس پر گہری آسمانی جاکٹ۔ باریک کرتے سے اس کی شفاف بانہیں صاف نظر آتی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے ہاتھ نور کے سانچے میں ڈھلے ہیں۔ سُرخ اور سفید رنگ اس کی بانہوں میں بھرا ہوا تھا جیسے شیشے میں شراب، جس کا نشہ دیکھنے والے کو بھی مخمور کر دے۔ جب وہ اپنے ہاتھوں کو ہلاتی تھی تب بھی اس کی نفیس جلد میں کسی خاموش سمندر کے منجمد سکوت کی سی وہ کیفیت موجود تھی جس کی لہریں ساکن معلوم ہوتی تھیں۔ "جنبش"، جو نسوانی حُسن میں ایک خاص متحرک و متلاطم سی کیفیت پیدا کر دیتی ہے، بلقیس کے ساکن اور متین حُسن میں کوئی فرق پیدا نہ کر سکتی تھی۔ بلقیس زندہ مجسمہ معلوم ہوتی تھی۔

اس کے گداز جسم کو پہلی مرتبہ میں نے اس نظر سے دیکھا کہ وہ عورت سے زیادہ "نسوانیت" کا مجسمہ معلوم ہو رہی ہے۔ ایسا مجسمہ جو چل پھر سکتا ہے۔ مگر اس نقل و حرکت سے اس کے مرمریں وقار میں فرق نہیں آ سکتا۔ اس کے گداز جسم میں رافائل کی "مریموں" کا تناسب ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یورپی نشاۃ ثانیہ کے کسی مصور کی خیالی محبوبہ زندہ ہو گئی ہے۔

میں اس کے چہرے کی طرف دیکھتا ہوں۔ کیا الفاظ اس کیفیت کو بیان کر سکتے ہیں جو نظر کو سرشار کر دیتی ہے۔ اس کے گھنے، گتھے ہوئے، بھنورے بالوں کے نیچے اس کی شفاف پیشانی۔ اس کی چمکدار آنکھیں جن میں دیدے کی سیاہی چمک چمک کر اپنے پورے ماحول کو روشن کر رہی ہے اور جو ایک خاص

سرشار کردینے والا اثر رکھتی ہیں۔ اس کے لبوں میں شباب کی ساری تازگی جم گئی ہے۔ ان کی ساخت کرنوں کی حدت اور شباب کے کیف و خمار کی سرخی سی ہے اور پھر لطف یہ ہے کہ ہر لمحے ان لبوں میں ایک تازہ کیفیت پیدا ہو جاتی۔ کبھی کبھی جب وہ سر جھکا کے سوچنے لگتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی لمبی لمبی پلکوں اور سرخ لبوں میں سرگوشیاں ہو رہی ہیں۔ باتیں کرتے وقت اس کے دانتوں کی قطار ان لبوں میں سے نظر آجاتی ہیں۔ یہ بہت اچھا ہے کہ وہ پان نہیں کھاتی۔ پان کی مصنوعی سرخی اس کے لبوں کی اس کیف پرور سرخی کا لطف کم کر دے گی۔

اس کے رخسار مونا لسا کے رخسار ہیں۔ اس کا کتابی چہرہ مونا لسا کا چہرہ ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ابھی اس کے چہرے سے بچپن کے آثار پوری طرح رخصت نہیں ہوئے اگر لیونارڈو ڈاونچی نے مونا لسا کے ابتدائے شباب کی تصویر کھینچی ہوتی تو بالکل ایسی ہی ہوتی۔ بلقیس کا جسم اگر پورا نظر آتا تو ایسا ہی ہوتا۔ اس میں وہی گداز، شاداب کیفیت ہے، وہی جمال ہے، وہی وقار ہے۔

ایک عجیب بات ہے کہ بلقیس سے اگر زیادہ التفات سے باتیں کروں تو وہ بے رخی برتنے لگتی ہے اور میری ہنسی اڑاتی ہے۔ مجبوراً مجھے اس کو ستانا پڑتا ہے۔ اس کو ستانے کے لیے ایک آدھ بات ایسی کہہ دیتا ہوں کہ وہ یا تو بگڑ کر جواب دیتی ہے یا بحث کرنے لگتی ہے۔ خانم ایسی باتوں پر ہنستی ہیں۔

آج میرے کسی جملے پر اس نے کہا "ہم نے کیا کیا نعیم بھائی؟ آپ اس مرتبہ ہم سے بہت ناراض ہیں۔"

میں نے کہا "ناراض نہیں۔ صرف تم کو ستانے کے لیے"۔ میں اس جملے کو اچھی طرح ادا نہیں کرسکا۔ کیا وجہ ہے کہ نسوانیت کی آگ کے سامنے میں بالکل پگھل جاتا ہوں۔ مجھے اپنے اوپر قابو نہیں رہتا۔

اس نے کہا "اچھا یہ بات ہے" اور خاموش ہوگئی۔

رات کو سوتے وقت تک اس کے چہرے، اس کے جسم کی مختلف کیفیتوں کا تصور اور اس تصور پر خیالی افسانے!

۲۵ رجون۔ بھائی عادل کو اب بھی مجھ سے وہی للّہی بغض ہے۔ ایک آدھ بار مجھے اس بات کا شک

ہوا کہ بلقیس کے سگے چچیرے بھائی ہیں اور بلقیس کو اپنا حق سمجھتے ہیں۔ میری طرف انکھیوں سے دیکھ کر کہنے لگے "جمیل الحق صاحب کے صاحبزادے نفیس الحق سے بلقیس کی نسبت ہو رہی ہے"۔ ان کے سامنے تو میں مسکراتا رہا لیکن پھر یہ خیال رفتہ رفتہ اس قدر حاوی ہونے لگا کہ اختلاج سا ہونے لگا۔

میں سوچتا ہوں کہ یورپ جا کے حسین سے حسین لڑکیوں سے ملوں گا۔ یہاں آنے کے بعد حسین سے حسین لڑکی سے شادی کرنے کا موقع مل سکے گا۔ ممکن ہے کہ میری واپسی تک بلقیس اچھی خاصی موٹی جائے۔ ابھی تو شباب کی تازگی اور تناسب کی وجہ سے اس کا جسم بدنما نہیں معلوم ہوتا۔ ممکن ہے کہ بھدا پن پیدا ہو جائے۔ پھر وہ بہت زیادہ ہوشیار ہے۔ ممکن ہے کہ شادی ہونے کے بعد اس کی ہوشیاری خطرناک بن جائے۔ آزادی کی مؤید ہے۔ فیشن اور نمود کا اسے شوق ہے۔ اگر شادی ہو بھی جائے تو کیا اسے میں قابو میں رکھ سکوں گا؟"

جب سے میں نے سنا تھا کہ خانم چاہتی ہیں، اس کی شادی مجھ سے ہو، تب سے بلقیس کی "شانِ نارسائی" میں فرق آگیا تھا۔ کشش کا بہت بڑا باعث یہ تھا کہ میری مفلسانہ طالب علمی کے زمانے میں وہ میری پہنچ سے باہر تھی۔ آئی۔ سی۔ ایس کے انتخاب نے مجھے اتنا اُوپر اٹھا دیا کہ میرا ہاتھ اس تک پہنچ سکتا تھا۔ اس سے ناامیدانہ اشتیاق کا خاتمہ ہوگیا تھا اور اس کی جگہ دلچسپی، لطف اور زیادہ مادی قسم کے جذبات نے لے لی تھی۔ مگر میاں عادل سے یہ سن کر کہ اس کی نسبت کہیں اور ہو رہی ہے، کچھ تو مجھے یہ خوشی ہوئی کہ اچھا ہے مجھے موقع ملے گا کہ خوب سے خوب تر کی تلاش کروں۔ مجھے آزادی حاصل رہے گی۔ شادی کی زنجیروں میں جکڑ کے انسان تنگ خیال بن جاتا ہے۔ میرے جذبات مجھے اس کی طرف کھینچتے تھے، اس وجہ سے کہ جتنی لڑکیوں سے ملنے کے مواقع مجھے ملے، وہ ان سب سے زیادہ حسین تھی۔ مگر اس سے بھی زیادہ حسین لڑکیاں ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں۔

مگر اب پھر وہی تھوڑا سا "شانِ نارسائی" کا ناامیدانہ لطف پیدا ہوگیا، یہ محسوس کر کے کہ وہ میرے ہاتھ سے نکلی جا رہی ہے۔ ایک اضطراب سا معلوم ہوتا تھا کہ کاش وہ میری ہی ہو کے رہے۔

۲۶ رجون۔ شام کو خانم کے یہاں گیا۔ بلقیس ڈھیلے پانچوں کا پاجامہ پہنے، ہلکا سا زرد، تقریباً ملگجا سا دوپٹہ، سفید کرتا پہنے بیٹھی تھی۔ اس کا گداز جسم "گداز" سے کچھ زیادہ معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے گھنے

بھورے بال کھلے ہوئے تھے اور اس کی کمر تک پہنچتے تھے۔ میں نے پھر محسوس کیا کہ اس سے قبل میں بارہا محسوس کر چکا ہوں مگر بار بار بھول جاتا ہوں کہ اس کا حسن لباس کا کس قدر پابند ہے۔ کھڑے دوپٹے اور تنگ پاجامے میں وہ حسین معلوم ہوتی ہے اور ساڑی میں کہیں زیادہ حسین۔ خدا کا شکر ہے ادھر ڈیڑھ دو سال سے اس نے فراک پہننا چھوڑ دیا۔

خانم نے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کیں۔ اتنے میں عاقل خاں بھی آ گئے۔ خانم کو غالباً علم نہیں تھا کہ مجھے بلقیس کی نسبت کی گفت وشنید کا علم ہو چکا تھا۔ وہ بے تکلفی میں جمیل الحق صاحب کی بیوی کا ذکر کرنے لگیں (انہیں کا چھوٹا لڑکا جو انجینئر ہے، میرا رقیب روسیاہ ہے) میں نے کہا: ''جمیل الحق صاحب کی ایک بھانجی پاگل ہو گئی ہے اور وہ اس طرح سے کہ اس کی بہن کے شوہر نے دوسری شادی کر لی۔ بہن سے زیادہ وہ اس کو صدمہ ہوا اور پاگل ہو گئی۔''

خانم نے بظاہر خالی الذہن طور پر پوچھا: ''تم نے جمیل الحق صاحب کے چھوٹے لڑکے کو دیکھا ہے؟''

میں نے کہا: ''جی ہاں، دیکھا تو ہے، انجینئر ہے۔''

انہوں نے کہا: ''بلقیس اس کی شکل وصورت کی بہت برائی کرتی تھی۔''

میں نے کہا: ''نہیں تو، صورت تو اچھی خاصی ہے۔''

خانم نے کہا: ''بلقیس تو کہہ رہی تھی، ان کا رنگ بہت سانولا ہے۔''

بلقیس بول اُٹھی: ''سانولا نہیں بلکہ اچھا خاصا کالا ہے۔ نعیم بھائی آپ نے ان کو اچھی طرح نہیں دیکھا۔''

میں نے کہا: ''میں نے انہیں بارہا دیکھا ہے۔''

خانم نے کہا ''جمیل الحق صاحب کی بیوی مجھ سے بولیں۔ آپ اجازت دیں تو میں بلقیس بی بی کو اپنے لڑکوں سے ملاؤں۔ میں نے کہا، لے جائیے، یہ ایسا کیا پردہ کرتی ہیں۔ اور سچ بھی یہ پردہ ہی کیا کرتی ہیں۔ خیر تو وہ لے گئیں، ان کو ملایا۔ یہ تو کہہ رہی ہیں کہ صورت اچھی نہیں، ذرا کالی ہے۔''

بلقیس نے کہا: ''اچھے خاصے کالے ہیں۔''

میں نے اسے چھیڑنے کو کہا: ''نہیں جی وہ سب بھائی بہت خوبصورت ہیں۔''

بلقیس نے سانس کھینچ کر کہا: ''افوہ نعیم بھائی۔ خوبصورت! خوبصورت کہاں! اچھے خاصے بدصورت ہیں۔'' پھر اس نے عاقل چچا سے پوچھا: ''کیوں پاپا جانی آپ نے دیکھا ان کو؟''

عاقل چچا کچھ سوچ رہے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ اس گفتگو سے بے خبر سے ہیں۔ چونک اُٹھے اور پوچھا ''کیا؟''

خانم نے پوچھا: ''تم نے جمیل الحق صاحب کے چھوٹے صاحبزادے کو دیکھا ہے؟ کیسی صورت ہے؟''

عاقل چچا نے کہا: ''ذرا سیاہ رنگ ہے۔''

اب تو میں بھی قائل ہو چلا۔ میں نے اپنے رقیب کی دو تین بار جھلک سی دیکھی تھی اور میرا اندازہ تھا کہ کافی وجیہہ آدمی ہیں۔ ان کے خلاف یہ رائیں سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔

بلقیس کو غالباً اس نسبت کے سلسلے کا علم بھی نہیں تھا۔ ورنہ وہ اس آزادی سے گفتگو نہ کرتی لیکن مجھے سب سے بڑھ کر یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ وہ اس شخص کو پسند نہیں کرتی۔

باتوں باتوں میں میری زبان سے ایک ایسا فقرہ نکل گیا جس سے ایک عجیب پُراسرار، کچھ طنز اور کچھ اطمینان کی مسکراہٹ خانم کے چہرے پر نمودار ہوئی۔ فوراً مجھے احساس ہوا کہ جمیل الحق صاحب کے صاحبزادے کا ذکر محض مجھ کو سنانے کے لیے تھا۔ باوجود انتہائی کوشش کے میں سمجھ نہ سکا کہ ان کی یہ مسکراہٹ مخالفانہ ہے یا موافقانہ یا وہ مجھ پر یہ ثابت کرنا چاہتی تھیں کہ بلقیس کی نسبت کے لیے وہ محض میری محتاج نہیں۔

۲۷؍جون۔ شام کو نواب صاحب کے یہاں گیا۔ امجد اور ڈاکٹر صاحب گھر سے تفریح کے ارادے سے نکلے ہی تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔ ان لوگوں نے شکایت کی، آپ اس دن سے جو غائب ہوئے تو اب تک نہیں ملے۔

امجد نے کہا: ''میں تو آپ کا مکان دریافت کرنے کی فکر میں تھا کہ کہیں آپ اس دن کسی بات سے خفا تو نہیں ہو گئے۔''

میں نے پاسپورٹ اور سفر کی دوسری تیاریوں کا ذکر کیا اور کہا فرصت ہی نہیں تھی۔ امجد نے

کہا: ''نعیم صاحب بتایئے کوئی اچھا فلم کہیں دکھایا جا رہا ہے؟''

ڈاکٹر صاحب نے کہا ''ہا۔ آں نعیم صاحب کوئی اچ۔ چھا فلم ہو تو بتایئے'' میں نے کہا ''کڈ ملیفس تو آپ دیکھ ہی چکے ہوں گے؟''

''ن۔۔۔نہیں۔ میں نے نہیں دیکھا۔''

''پروفیسر ایس۔ کے۔ سید صاحب کہہ رہے تھے، آپ سے سینما میں ملاقات ہوئی تھی۔''

ڈاکٹر صاحب نے کہا ''نہیں وو۔۔۔وو۔۔۔وہ دوسرا فلم تھا۔ کڈ ملیفس نہیں بل۔۔۔بلکہ ال۔۔۔ال۔۔۔الیلی۔۔۔''

امجد نے جلدی سے کہا: ''ہاں اس روز تو آپ الیلی بھٹیارن، دیکھنے گئے تھے''

ڈاکٹر صاحب نے کہا ''نہیں ال۔۔۔ال۔۔۔الیلی رقاصہ''۔

امجد نے کہا: ''نہیں الیلی بھٹیارن کہیے''۔

پروفیسر ایس۔ کے سید صاحب انتظار کرتے کرتے تھک گئے تھے اور تنگ آ کے موٹر میں کہیں جا رہے تھے۔ ہم سب کو آتے دیکھ کر موٹر روک کے اُترے اور کہا: ''چلیے میں آپ ہی کو ڈھونڈنے نکلا تھا۔۔۔''

رات کے کھانے پر پروفیسر صاحب نے روک لیا۔ خانم اور بلقیس سے آج ملاقات نہیں ہوئی۔

آج اس وجہ سے ان کے یہاں نہیں گیا کہ مجھے معلوم تھا کہ ان کے یہاں مہمان آئے ہوئے ہیں۔

۲۹ر جون۔ نواب صاحب کے یہاں مضافاتِ لکھنؤ کے ایک نوجوان شاعر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ تعارف کے بعد میں نے مزاج پوچھا: کہا: ''سب خیریت ہے''۔ خیریت کہتے ہوئے وہ ذرا ہکلائے۔ ان کا بالائی لب اُٹھ کر ذرا ٹیڑھا ہوا، کانپا اور ان کے دانت جن سے لکھنویت ٹپکتی تھی، نمایاں ہوئے۔ یہ ان کی گفتگو کا خاص طریق معلوم ہوتا ہے۔ باتیں کرتے وقت، خصوصاً نواب صاحب سے باتیں کرتے وقت ان کا جسم لکھنوی انداز سے کچھ جھکتا اور کچھ لچکتا ہے۔

شام کو خانم کے یہاں گیا۔ طبیعت کچھ صاف نہیں تھی۔ بلقیس بھی کچھ زیادہ بھلی معلوم نہیں ہوئی۔ تصنع کی فضا چھائی ہوئی تھی۔ میں زبردستی باتیں کر رہا تھا۔

۲۳ر جولائی۔ بلقیس کا قصہ ایک جمود کے عالم میں ہے۔ میرے ذہن میں نہیں بلکہ خانم وغیرہ کے طرزِ عمل میں جمود کی سی کیفیت ہے۔

سویرے جو کل آنکھ میری کھلی تو پانی برس رہا تھا۔ آج بھی پانی برس رہا ہے۔ متواتر تین دن سے گھٹا چھائی ہے۔ ارادہ کرتا ہوں کہ اُٹھوں، تفریح کو جاؤں۔ پھر کاہلی سے یہ عذر کر کے ٹال دیتا ہوں کہ آج تو سڑک پر بہت زیادہ کیچڑ ہوگی۔ کچھ دیر تک اسی طرح لیٹا رہا۔ پھر آنکھیں بند کیں تو عشرت منزل۔ ہر بار جب عشرت منزل کو دیکھتا ہوں نیا نقشہ۔ کبھی یہ جھونپڑا بن جاتا ہے، کبھی محل، کبھی کسی دُور دراز جزیرے میں ہرا بھرا میدان، کبھی دریا کا کنارہ، کبھی ہمالیہ کا ایک محفوظ غار۔ عشرت منزل کی انہیں شکلوں میں سے کسی شکل میں بلقیس چل پھر رہی تھی اور مجھے اشارے سے بلا رہی تھی۔

اٹھ بیٹھا اور اس دالان میں جس سے رخصت کے دن قریب آتے جا رہے تھے بازار سے منگا کر چائے پی۔ چائے مزے کی تھی۔ بھائی عادل تشریف لائے۔ پوچھا: ''کچھ کام کر رہے تھے؟''

میں نے کہا: ''جوتا صاف کر رہا ہوں۔''

انہوں نے کہ: ''جی!'' اٹھ کر ٹہلنے لگے۔ پھر بیٹھے تو فرمایا: ''ایک لڑکا جو بچپن میں جوتوں پر پالش کیا کرتا تھا آگے چل کر امریکہ کا پریسیڈنٹ ہو گیا۔''

میں نے کہا: ''میں پالش نہیں کر رہا تھا۔ جوتا صاف کر رہا تھا اور اب کر چکا۔''

انہوں نے پوچھا: ''تم انگلستان کب جاؤ گے؟''

میں نے کہا: ''غالباً ستمبر کو۔''

مجھے میاں عادل سے نفرت سی ہونے لگی۔

انہوں نے کہا: ''کسی طرح بلقیس کی شادی ہو جاتی تو چچا جان کی گردن کا بوجھ ہلکا ہو جاتا۔''

میں نے کہا: ''گھبراتے کیوں ہو۔ تمہارے ہی ساتھ ہوگی۔''

کہنے لگے: کیا مہمل بکتے ہو۔ نفیس الحق صاحب کے ساتھ نسبت طے ہو چکی ہے۔''

میں نے کہا: ''پھر فکر کی کیا بات ہے۔ عاقل چچا کی گردن کا بوجھ ہلکا ہوا ہی چاہتا ہے۔''

عادل صاحب نے سگریٹ ختم کی اور دفعتاً خدا حافظ کہا۔ میں نے زبان سے خدا حافظ و ناصر کہتے ہوئے اپنے دل میں کہا: ''اچھا تو محض یہ خبر سنانے آئے تھے۔''

۲۵ر جولائی۔ خانم کے یہاں گیا۔ بلقیس کے سر میں درد ہے۔ کچھ دیر کے بعد وہ اٹھی! میں نے پوچھا۔ ''کیوں کیسی ہو؟'' وہ آہستہ سے کچھ جواب دے کر چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد میں اس کے کمرے میں گیا۔ وہ کوچ پر لیٹی تھی۔ سنبھل کے اٹھ بیٹھی۔ میں نے کہا۔ ''تمہارے سر میں درد ہو کیسے؟'' بولی۔ کچھ نہیں نعیم بھائی، اسکول سے آنے کے بعد سے سر میں ذرا درد ہے۔''

میں دوسرے کمرے میں خانم سے باتیں کرتا رہا۔ خانم آج ظرافت اور ہسٹیریا کے ملے جلے عالم میں تھیں۔ بلقیس کچھ دیر بعد آئی تھی۔ اس کی قمیص کا ایک بٹن کھل گیا تھا۔ گردن کے نیچے سینے کی ذرا سی جھلک نظر آئی۔ معلوم ہوتا تھا، بدن کا سارا خون کھنچ کر میرے سر میں پہنچ گیا۔

رات کو سونے سے پہلے طرح طرح کے رومان انگیز خواب، عاشقانہ تخیلات، عشرت منزل ایک مسافر بنگلہ بن گئی۔ موٹر کا سفر، حادثہ، مسافر بنگلے میں رات، بند کمرہ دروازے بند، باہر حفاظت کے لیے آدمی۔ حادثے کا پہلے یہ تصور کہ میں زخمی ہوں اور بلقیس تیمارداری کر رہی ہے۔ پھر یہ کہ بلقیس حادثے میں زخمی ہو گئی اور میں تیمارداری کر رہا ہوں عین دم واپسیں بلقیس کا اقرار محبت!

اس کے بعد میں رویا اور اپنے بگٹٹ تخیل کی حماقتوں پر ہنس کے سو گیا۔

۲۶ر جولائی۔ صبح کو بہت دیر میں آنکھ کھلی۔ مطلع صاف تھا۔ ہلکے ہلکے سفید بادلوں سے آفتاب کی روشنی چھن رہی تھی۔ چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ طاق پر ناشتہ رکھا تھا۔ چڑیاں آج بھی پراٹھے کا ذرا سا ٹکڑا نوچ کر کھا گئی تھیں۔

فرائڈ کے مجموعۂ مضامین کو پڑھنا چاہا۔ ایک آدھ مضمون ختم کرنے پر طبیعت اکتا گئی۔ اس میں گیارہ بج گئے۔ بس سے جانا تھا۔ بس اسٹینڈ گیا۔ صفدر نگر سے خانم نے بلا بھیجا تھا۔

بلقیس کے لیے تصویروں کے فریم لیتا گیا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں تنہا تھی اور اس وقت بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ میاں عادل لاکھ نفیس الحق کا ذکر کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکالیں، ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ بلقیس کی شادی مجھ سے ہو گی۔ یہی ذکر میں خاندان بھر میں سنتا ہوں ''کیا خانم دیوانی ہیں، جو اچھا خاصا لڑکا، پھر ماشاءاللہ آئی۔ سی۔ ایس کو چھوڑ کے ادھر ادھر اپنی لڑکی کی نسبتیں تلاش کرتی پھریں۔''

خانم نہا رہی تھیں۔ نہا کے نکلیں تو میں انہیں سلام کرنے گیا۔ وہ کھڑکی کے پاس جھکی ہوئی تھیں۔ میں سمجھا کچھ لکھ رہی ہیں مگر کنگھی کر رہی تھیں۔ پوچھا کون ہے۔

پھر میری طرف پلٹیں۔ اس وقت ان کے چہرے پر تکدر کے کچھ آثار تھے۔ پوچھا ''کیوں جی تم یہ سب سے کہتے پھرتے ہو کہ ہم تمہاری خوشامد کرتے ہیں کہ بلقیس سے شادی کر لو۔ ہماری جوتی کو غرض ہے کہ کسی کی خوشامد کریں؟ پہلے ہی میرا دل خاندان کے جھگڑوں سے پک کے پھوڑا ہو گیا ہے۔ اپنوں سے غیر اچھے۔ میں تو غیروں ہی میں اپنی لڑکی کی شادی کروں گی۔''

میں نے خانم کو سمجھایا کہ میں نے اس قسم کی کوئی بات کبھی زبان سے نہیں نکالی۔ یہ سب آپ سے لڑانے کی ترکیبیں اختیار کی جا رہی ہیں۔ اسی قسم کی گفتگو ہو رہی تھی کہ عاقل چچا آ گئے اور جمیل الحق صاحب کے لڑکوں کی نسبتوں کا تذکرہ چھیڑا۔ نفیس الحق بھی انگلستان جا رہے ہیں ان کے ساتھ، خیال ہے۔ اس وقت کی گفتگو کا حاصل یہ تھا کہ ان کی والدہ بلقیس سے نسبت کرانے میں کوشاں ہیں۔

ممکن ہے یہ واقعہ ہو یا ممکن ہے یہ ڈرامہ اس لیے اسٹیج کیا جا رہا ہو کہ میرے کان میں یہ بات مرعوب کرنے کے لیے ڈال دی جائے کہ ہمیں تمہاری پروا نہیں۔ بہر حال میں نے بھی اپنا پارٹ ادا کیا اور بالکل انجان بنا رہا۔

اس نے اس قابل سمجھا تو میں سول سروس کے انتخاب کے امتحان میں کامیاب ہو گیا۔ اگر اسے منظور ہے تو سب کچھ ہے۔ اور اگر اس کو منظور نہیں، ہم کو بھی نہیں۔ پھر جب جذبات سے قطع نظر میں ٹھنڈے دل سے غور کرتا ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ بلقیس میں میری دلچسپی پیدا کی ہوئی ہے، قدرتی نہیں۔ ممکن ہے کہ انگلستان سے میری واپسی تک بلقیس بھدی اور موٹی ہو جائے۔ اب تک جتنی لڑکیاں میں نے دیکھی ہیں، ان میں غنیمت اور بہت غنیمت ہے۔ مگر مجھے اس سے ''عشق'' نہیں ورنہ اس کی اور کہیں نسبت ہو جانے کی خبر اور اندیشہ کا مجھ پر کم اثر نہ ہوتا۔ بہر حال اس سے پہلے بھی مفلسی اور طالب علمی کے زمانے میں جب میرا سن صرف سترہ سال تھا، مجھے ''عشق'' ہو چکا ہے۔ ایک دفعہ دن کے بارہ بجے سے رات کے دو بجے تک اسی عشق کے غم میں روتا رہا اور اس کے بعد وہ عشق اچھا ہو گیا۔ انگلستان جا کے بلقیس کو بھول جانا کون سی بڑی بات ہے۔

میں اللہ میاں سے دعا کر کر کے بلقیس کو نہیں مانگنا چاہتا تھا۔ بقول ڈاکٹر صاحب کے ''چھ۔۔۔ چھ۔۔۔ چھوٹی چیز۔'' اس سے تو ابھی بہت کچھ مانگنا ہے۔ پھر بھی بلقیس ملنا ہو گی مل جائے گی، نہ ملنا ہو گی نہ ملے گی۔''

رات کو سونے سے پہلے ''بانگِ درا'' میں فال دیکھی تو یہ شعر نکلا:

ہم نے اے اقبالؔ یورپ میں اسے ڈھونڈا عبث
بات جو ہندوستاں کے ماہ سیماؤں میں تھی!

اس سے زیادہ مناسب فال اور کیا نکلتی۔ دل کو اطمینان سا ہو گیا۔ مگر طبیعت پست رہی۔ روزنامچہ لکھتا رہا۔ رات بہت ہو گئی ہے۔

۲۷ جولائی۔ صبح کو محمد خاں صاحب کے یہاں گیا۔ جمیل الحق صاحب کے یہاں کی نسبتوں کا جو ڈرامہ خانم نے اسٹیج کرایا تھا، اس کی حقیقت معلوم کرنی تھی۔

محمد خاں صاحب کی دریافت کامیاب رہی۔ انہیں کی زبانی واقعہ یوں معلوم ہوا۔

''میں گیا تو جمیل الحق ٹہل رہے تھے۔ میں نے بلا کر پوچھا تو کہنے لگے۔ عجب احمق ہو۔ میں تم سے کہہ چکا ہوں اور وہ کون احمق ہیں جو بار بار تم کو بھیجتے ہیں۔ نفیس الحق کا ابھی شادی کرنے کا بالکل ارادہ نہیں ہے۔۔۔ میں نے نام بھی بتا دیا کہ کوئی وکیل ہیں، عاقل خاں صاحب، ان کی لڑکی سے تو نسبت وغیرہ کا قصد نہیں؟ انہوں نے بگڑ کر کہا۔ نہیں جی، ہمارے پاس بہتر سے بہتر پیام موجود ہیں۔ اس لڑکی میں ایسی کون سی خاص بات ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ہاں ہمارے گھر میں ایک بار اس کا ذکر کیا گیا تھا مگر انیس الحق کی والدہ نے انکار کر دیا۔''

میں نے پوچھا: ''چھوٹے بھائی نہیں تو ممکن ہے کہ بڑے بھائی کے ساتھ ہو۔ انہیں کی فکر زیادہ ہوگی۔''

محمد خاں صاحب نے کہا: ''نہیں جی وہ حضرت اور کہیں کرنا چاہتے ہیں۔''

پھر میں اور محمد خاں صاحب دونوں تفریح کو ساتھ نکلے اور بالآخر اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے میں بس اسٹیشن پہنچا اور مطمئن گھر واپس آیا۔ خانم کا تخیل خوب پرواز کرتا ہے۔ پھر بھی میں ان کو مایوس نہیں کروں گا۔ مجھے بھی اس کا احساس ہے کہ کئی حیثیتوں سے بلقیس بہت اچھی لڑکی ہے۔

سہ پہر کو میں خانم کے یہاں گیا۔ بہت بحال تھیں۔ خانم نے پھر نفیس الحق اور ان کی والدہ سے اپنی ملاقات اور بلقیس کی نسبت اور اچھے سے پیاموں کا قصہ سنانا شروع کیا اور میں مسکراتا رہا۔

تیسرا باب

ایشیا، افریقہ، یورپ

۹ ستمبر۔ بمبئی۔ صبح کو ناشتہ کر کے ہم سب اپنا اپنا اسباب باندھنے لگے۔ اس کے بعد ٹرام پر طامس کک اینڈ کو کے دفتر پہنچے۔ جہاز کے جانے میں صرف چند گھنٹے باقی تھے۔ لیکن برسر کے نام خط جو مجھے مل جانا چاہیے تھا وہ ابھی تک نہیں ملا تھا۔ مجھے غصہ آ رہا تھا۔ یہ میری ہی غلطی تھی کہ میں نے اطالوی جہاز سے جانے پر اصرار کیا۔ پی اینڈ او کے کسی جہاز سے جاتا تو کوئی جھگڑا نہ ہوتا۔ میرے تینوں ساتھی مطمئن تھے اور میری اُلجھن پر ہنس رہے تھے۔ اتنے میں ایک اور صاحب آئے اور انصاری ان سے بے تکلفی سے باتیں کرنے لگا۔ پھر مجھے بلایا۔ ''نعیم!'' میں ان صاحب سے ملنے کے لیے بڑھا۔

''نعیم آپ سے ملو۔ آپ بھی حیدرآباد سے تشریف لا رہے ہیں۔ آپ کا نام یوسفی ہے۔''

اس عجیب نام پر مجھے تعجب سا ہوا۔

میں نے پوچھا۔ ''آپ بھی تشریف لے جا رہے ہیں۔''

یوسفی صاحب نے کہا: ''نہیں میری بیوی جا رہی ہیں۔ انہیں جہاز تک پہنچانے کے لیے آیا ہوں۔''

اس کے بعد ہم سب اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ کلرک نے برسر کے نام چٹھی میرے حوالے کی اور مجھے اطمینان ہوا اور اس اطمینان کے عالم میں جب میں یوسفی صاحب سے باتیں کر رہا تھا تو مجھے تین دن پہلے کا وہ منظر یاد آ گیا جب سکندرآباد اسٹیشن پر میں نے اپنے سب دوستوں کو اور خصوصاً خانم اور

بلقیس کو خدا حافظ کہتے وقت میں نے بلقیس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔ خانم نے میری طرف چونک کے دیکھا تھا۔ اس وقت خانم کی نگاہیں میری آنکھوں کے سامنے پھر گئیں اور وہ ہاتھ جو بلقیس کے کندھے سے مس ہوا تھا، دل کی طرح دھڑکنے لگا۔

''کونتے دی تو سکا'' جہاز کا نام کس قدر بھلا معلوم ہوتا تھا اور جہاز بھی بہت خوبصورت تھا۔

انصاری، نصیر اور ایوب کے ساتھ میں نے بھی جہاز کے مختلف حصوں کو دیکھنا شروع کیا اور اس کے بعد سب نے مناسب سمجھا کہ عرشے پر ٹھہر جائیں۔ پانچ دس منٹ میں جہاز چھوٹنے ہی والا تھا۔ سب مسافر عرشے پر تھے۔ دو تین سکھ اور ان کی بیویاں جن میں ایک خوبصورت تھی اور باقی بدصورت، کئی انگریز یا انگریز نما لوگ، ایک ہندوستانی نوجوان اور اس کے ساتھ ایک ساڑی پوش میم، اور بکثرت ہندوستانی، دو تین چینی یا شاید جاپانی اور انگریزوں کے مقابلے میں کسی قدر سانولے اطالوی۔ پایر پر کھڑے لوگ رومال ہلا رہے تھے۔

اتنے میں انصاری نے دفعتاً کہا: ''اجی آیئے راجہ صاحب۔ ہم سمجھ رہے تھے آپ نے اس جہاز سے جانے کا ارادہ چھوڑ دیا۔ نصیر اور ایوب بھی ان راجہ صاحب سے ملے پھر انصاری نے مجھ سے تعارف کرایا۔ ''راجہ ہمت نواز ونت بہادر، اور مسٹر نعیم حسن۔''

راجہ صاحب جو پچیس چھبیس سال کے وجیہ آدمی تھے اور انتہائی خوش پوش۔ ''بڑی خوشی ہوئی'' کہہ کر پھر انصاری سے باتوں میں مصروف ہو گئے۔ میں نے اپنے دل میں کہا: ''عجیب بدماغ آدمی ہے۔''

ساحل پر جو مجمع تھا، میں نے اس پر نظر ڈالی۔ اس مجمع میں میرا کوئی نہیں تھا۔ ایک رومال بھی میرے لیے نہیں مل رہا تھا اور مجھے دنیا میں اپنی تنہائی اور بے بسی کا سخت اور تکلیف دہ احساس ہوا۔ کاش میرے قریبی عزیزوں میں سے کوئی زندہ ہوتا۔ اتنے میں نصیر نے میرا ہاتھ پکڑ کے نیچے ایک رومال کی طرف اشارہ کیا۔ یہ میرے ایک حیدرآبادی دوست تھے۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے جواب دیا۔ انہوں نے اس ہندوستانی نوجوان کی طرف اشارہ کیا جس کے ساتھ ساڑی پوش میم تھی۔ اس ایک رومال ہلانے والے ہاتھ سے مجھے تسلی ہوئی۔ کوئی عزیز نہ سہی مگر ایک دوست جو اتفاق سے بمبئی میں تھا مجھے خدا حافظ کہنے آ پہنچا تھا۔

جہاز نے سیٹی دی اور حرکت کی۔ راجہ ہمت نواز ونت بہادر یکلخت مجھ سے مخاطب ہوئے

اور کہا: ''ہندوستان کو خدا حافظ کہیے۔'' اور پھر سوالات کا تانتا باندھ دیا۔ میں انہیں جوابات دیتا جا رہا تھا اور ہندوستان سے جدا ہونے پر کچھ رنج محسوس کر رہا تھا اور کچھ خوشی۔ رنج بہت کم تھا۔ کیا اس ملک سے مجھے ذرا بھی محبت تھی؟ خوشی اس وجہ سے تھی کہ میں ہندوستان کو ایک قید خانہ سمجھنے لگا تھا جس سے رہائی ناممکن معلوم ہوتی تھی۔ یہ بالکل ناممکن معلوم ہوتا تھا کہ میں ان سمندروں کے پار جا سکوں گا جو اسے گھیرے ہوئے ہیں۔ یا ان پہاڑوں کے دوسری طرف جاؤں گا جو قید خانے کی دیواریں کی طرح ہیں۔ ایک طرف اونچی اونچی دیواریں اور دوسری طرف خندق۔

راجہ صاحب برابر جرح میں مصروف تھے اور بالآخر مجھے بے توجہ دیکھ کر پھر انصاری یا نصیر سے باتیں کرنے لگے۔

بمبئی اور ہندوستان کا ساحل دور ہوتا جا رہا تھا۔

کھانے کی گھنٹی بجی۔

نصیر، ایوب اور انصاری تینوں ''سکنڈ اکونومیک'' میں سفر کر رہے تھے۔ میں دوسرے درجے میں تھا۔ کھانے کے کمرے میں پہنچ کے میں نے محسوس کیا کہ دوسرے درجے میں بہت تھوڑے مسافر ہیں۔ ایک میز پر ایک بدشکل ہندوستانی عورت بیٹھی تھی۔ میں نے اپنے دل میں کہا: ''مسز یوشی''۔ ایک اور میز پر تین بوڑھی سی میمیں بیٹھی زور زور سے باتیں کر رہی تھیں۔ ایک میز پر تین ہندوستانی نوجوان بیٹھے میری طرف غور سے دیکھ رہے تھے۔ مجھے پریشانی سی ہوئی کہ آیا میرے لباس میں کوئی خاص خرابی ہے یا میرے داخل ہونے کے انداز میں اور میزوں پر تین تین چار چار ٹکڑیوں میں اور ہندوستانی تھے۔ ایک میز پر دو یورپین تھے۔ ایک ضعیف العمر تقریباً ساٹھ سال کا، ایک تنومند نوجوان، ایک اور میز پر ساڑی پوش میم اور وہی ہندوستانی نوجوان بیٹھے تھے جن کی طرف میرے دوست نے ساحل سے اشارہ کیا تھا۔ میں نے دیکھا تو ساڑی پوش لڑکی بڑی خوبصورت معلوم ہوئی۔۔۔ پھر میں بھی ایک خالی میز کی طرف بڑھا۔ اطالوی ویٹر نے دونوں ہاتھ پھیلا کر کچھ شائستگی اور کچھ طنز سے ایک میز کی طرف اشارہ کیا: ''سنیورے۔'' میں بیٹھ گیا تو میرے آگے ''مینو'' بڑھایا۔ اتنے میں ایک اور صاحب آ کے اس میز پر بیٹھ گئے جس پر میں بیٹھا تھا۔ ان کا سر بالکل صاف منڈا ہوا تھا اور باوجود سیاہ فام رنگت کے وہ مجھے ایک حد تک مشہور سینما ایکٹر ''ایرچ فان اشٹروہایم'' سے مشابہ معلوم ہوئے۔

چھری کانٹوں کے استعمال میں بار بار غلطیاں کیں اس دوران "ایرچ فان اشتروہائم" نے میری طرف بار بار کڑوی نظروں سے دیکھا۔ کھانا بالکل کھایا نہیں گیا۔ یہ پہلی بار تھا کہ میں نے پورا یورپین کھانا کھایا تھا۔ پھر اطالوی کھانا روغن زیتون میں پکتا ہے، جہاز کی حرکت ناگوار معلوم ہونے لگی تھی۔ ہلکی ہلکی سی مالش معلوم ہوئی اور میں اٹھ کے کھانے کے کمرے سے باہر چلا گیا۔ جاتے ہی جہاز نے ذرا سی حرکت کی اور میں لڑکھڑا کے سنبھلا اور لوگوں نے میری طرف دیکھا اور میں نے کچھ اُلجھن اور کچھ خفت سی محسوس کی۔

میں عرشہ جہاز پر ایک آرام کرسی پر لیٹ گیا۔ سمندر کی نیلی موجیں اُٹھ رہی تھیں اور جہاز سے ٹکرا رہی تھیں موجوں کا کف مجھے بہت اچھا معلوم ہوا۔ تھوڑی دیر کے لیے میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ سر میں درد سا معلوم ہونے لگا اور طبیعت مالش کرنے لگی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے دماغ کو جہاز کی حرکت کا عادی بنانا چاہا۔ پھر سونا چاہا اور آنکھ لگ گئی۔ اٹھا، لڑکھڑاتا ہوا اپنے کیبن کو گیا۔ میں اپنے کیبن میں اکیلا تھا۔

منہ دھویا۔ چائے کی گھنٹی ہوئی۔ چائے پی۔ سر کا درد کم ہوا مگر طبیعت برابر مالش کر رہی تھی۔ چائے پی کے میں کھانے کے کمرے سے باہر نکلا تو ایک صاحب سلک کی شیروانی اور چوڑی دار پائجامہ پہنے جہاز کے عرشے پر کٹہرے کے پاس کھڑے تھے۔ میں نے اپنے دل میں کہا: "جہاز حیدر آبادیوں سے بھرا ہوا ہے۔" میں ان کے پاس پہنچا اور پوچھا: "کیا آپ حیدر آباد سے تشریف لائے ہیں؟"

انہوں نے جواب دیا: "نہیں۔ کئی بار حیدر آباد جانے کا اتفاق ضرور ہوا ہے۔ کیوں آپ کا وطن حیدر آباد ہے؟"

میں نے کہا۔ "جی ہاں!"

اس نے کہا: "میں کلکتہ کا رہنے والا ہوں۔"

میں نے کہا: "معاف کیجئے گا آپ کے لباس سے مجھے دھوکا ہوا۔"

انہوں نے ہنس کر کہا: "کیوں؟ شیروانی تو ہندوستان بھر میں پہنی جاتی ہے" ---

پھر پوچھا: "آپ کا اسم شریف؟"

میں نے کہا: "نعیم حسن!"

کہنے لگے: "میرا نام عبدالرحیم فاروقی ہے۔"

میں نے ہاتھ ملایا اور کہا: "آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ آپ کا ذکر میں نے اکثر سنا ہے۔" مجھے وہ تمام ظریفانہ جملے یاد آ گئے جو ان حضرت کے سیاسی کارناموں پر اردو اخباروں کے ایڈیٹروں نے اپنے مزاحیہ کالموں میں لکھے تھے۔

پھر کچھ دیر تک میں ان سے ادھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ وہ ساڑی پوش میم اسی ہندوستانی نوجوان کے ساتھ چائے پینے اندر گئی۔ اس وقت وہ ساڑی نہیں بلکہ سایہ پہنے تھی اور پہلے کے مقابلے میں کم حسین معلوم ہوتی تھی۔ فاروقی صاحب نے کہا: "یہ کلکتہ کے ایک مشہور سیٹھ ہیرا چند کے صاحبزادے ہیں۔ اپنے والد کی ٹائپسٹ سے شادی کی ہے۔"

میں نے سوال کیا۔ "یہ لڑکی اینگلو انڈین ہے؟" میں نے سنا تھا کہ کلکتے میں اینگلو انڈین آبادی بہت زیادہ ہے۔ فاروقی صاحب نے کہا: "نہیں، ہے تو انگریز مگر بہت معمولی طبقے کی۔"

میں نے مالش کی شکایت کی۔ فاروقی صاحب نے کہا: "ٹہلو۔" میں ٹہلنے لگا۔ پھر کٹہرے کے پاس کھڑا ہو کر موجوں کو دیکھنے لگا۔ موجیں شاعری کر رہی تھیں۔ ریشم کے پہاڑ بلند ہو رہے تھے اور پھٹ رہے تھے اور گر رہے تھے۔ ریشم کی چٹانیں ایک دوسرے سے ٹکرا رہی تھیں اور میری طبیعت مالش کر رہی تھی۔

آفتاب غروب ہونے لگا! کئی لوگ آرام کرسیوں پر پڑے ہوئے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ حال پتلا ہے۔ بالآخر میں نے بھی شکست قبول کی۔ اپنے کیبن میں پہنچا۔ قے کی، لیٹ گیا۔ بلقیس نظروں کے سامنے تھی۔ کیا پریشانی اور تکلیف کا وقت تھا۔ بلقیس کا تصور سامنے تھا۔ مگر میر طبیعت مالش کر رہی تھی اور جہاز دائیں بائیں حرکت کر رہا تھا اور موجوں کے ٹکرانے کی آواز آ رہی تھی۔ موجیں ریشم کی چٹانیں تھیں اور بلقیس کے بھورے بال ریشم کے تھے۔ سیٹھ ہیرا چند کے لڑکے کی معمولی طبقے کی انگریزی بیوی کے بال بھی ریشم کے سے تھے۔ مگر وہ کٹے ہوئے تھے اور بلقیس کے بالوں سے چھوٹے تھے۔

میں سو گیا تو خواب میں بلقیس کو دیکھا۔ کچھ عجیب طرح کا خواب تھا۔ کچھ یاد نہیں آتا پھر آرام سے نیند آئی۔ جہاز دائیں بائیں حرکت کر رہا تھا۔

(۲)

۱۰رستمبر۔ سمندر۔ نو بجے سو کے اٹھا۔ بہ مشکل تمام حجامت بنائی۔ کپڑے پہنے۔ چائے نہیں پی گئی۔ عرشے پر پہنچا۔ عبدالرحیم صاحب فاروقی براج رہے تھے۔ راجہ ہمت نواز وقت بہادر کیمرہ ہاتھ میں لیے دھوپ کی عینک لگائے درجۂ اوّل سے تشریف لائے۔ ان کی اور فاروقی صاحب کی طبیعت ذرا بھی خراب نہیں ہوئی۔ یہ دیکھ کر مجھے بھی ڈھارس ہوئی۔ راجہ صاحب بہت بے تکلفی سے باتیں کرنے لگے۔ یہ ساتویں مرتبہ ہے کہ وہ یورپ تشریف لے جا رہے ہیں۔ سیٹھ ہیرا چند کے صاحبزادے اور ان کی میم سے خوب واقف ہیں۔ کہنے لگے۔ ''مسز چاند کو میں شادی سے پہلے بھی اچھی طرح جانتا تھا، بہت اچھی طرح'' یہ کہہ کر ہنسے۔

راجہ صاحب گئے تو میں نے عبدالرحیم صاحب فاروقی سے کہا۔ ''کسی ترکیب سے مجھے نصیر یا ایوب کے پاس سے اچار لادیجئے۔ یہ دونوں اکنامک کلاس میں ہیں۔'' فاروقی صاحب نے کہا۔ ''اچھا آپ اپنے کیبن میں جایئے میں لاتا ہوں۔''

کیبن پہنچتے پہنچتے زور سے قے ہوئی۔ ایک اطالوی کیبن بوائے نے ہمدردی میں کچھ الفاظ کہے۔ باوجود متلی اور دردِ سر کے اطالوی زبان بہت اچھی معلوم ہوئی۔ کاش میں سمجھ سکتا۔ فاروقی صاحب اچار لائے۔ کیبن بوائے بسکٹ لے کر آیا۔ اچار کے ساتھ بسکٹ کھائے۔ فاروقی صاحب نے کہا۔ ''کپلنگ جھوٹ بکتا ہے کہ مشرق اور مغرب کبھی نہیں مل سکتے۔ دیکھئے آپ اچار کے ساتھ بسکٹ کھا رہے ہیں۔'' میں ہنسا، خود بھی ہنسے چند سیکنڈ کے بعد پھر ہنسے اور کہا۔ ''سیٹھ ہیرا چند کے لڑکے نے ایک انگریز لڑکی سے شادی کی ہے۔ یہ بھی مشرق اور مغرب کا سنگم ہے۔ کہیں آپ اس حماقت میں نہ مبتلا ہو جایئے گا۔ خدا حافظ!''

میں ہنسا اور جواب میں ''خدا حافظ'' کہا۔ بلقیس کی صورت نظروں کے سامنے آگئی۔ سو گیا اور سہ پہر کے پانچ بجے تک سوتا رہا۔ فاروقی صاحب کی آہٹ معلوم ہوئی۔ کیبن کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور ادھیڑ اطالوی خادمہ جو مسافر خواتین کی خدمت کرتی تھی، فاروقی صاحب سے میرے متعلق ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں پوچھ رہی تھی کہ اب کیسے ہیں۔ میں جو اٹھا تو مشفقانہ انداز سے مسکرائی۔ اس کے جانے کے بعد فاروقی صاحب نے کہا۔ ''عرشے پر آیئے''۔ اور چلے گئے۔ میں نے کپڑے پہنے طبیعت برابر مالش

کر رہی تھی اور سخت کمزوری معلوم ہو رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا سر پر ہتھوڑے پڑ رہے ہیں۔ کچھ بسکٹ کھائے۔ قے ہو گئی۔ ہمت نہیں ہاری اور پھر بسکٹ کھائے۔ عرشے پر پہنچا۔ فاروقی صاحب وہاں تھے۔ طبیعت متلائی۔ بھاگا۔ کیبن پہنچ کر پھر قے کی۔ کپڑے بدل کے بچھونے پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ جہاز پابندی سے دائیں بائیں حرکت کر رہا تھا۔ کبھی دائیں طرف بہت زیادہ جھک جاتا کبھی بائیں طرف اور کبھی جھٹکا سا لگتا تو معلوم ہوتا کہ ساری آنتیں اُلٹ پلٹ گئی ہیں۔ آنکھیں بند کرنے سے کسی قدر تسکین ہوئی۔

دماغ نے ذرا سی کوشش کی تو بلقیس سامنے کھڑی تھی۔ مذاق اُڑا رہی تھی کہ سمندر کے اس ذرا سے تلاطم میں آپ کا یہ حال ہو گیا۔ فاروقی صاحب تو کہہ رہے تھے کہ اس کو طوفان نہیں کہتے ہیں، محض تلاطم کہتے ہیں۔ جب تک سمندر میں اتنا تلاطم نہ ہو، جہاز کے سفر میں لطف نہیں۔ واہ نعیم صاحب واہ۔ پھر مذاق اُڑاتے اُڑاتے مجھے بیمار اور پریشان دیکھ کر وہ خود بھی پریشان ہو گئی اور تسلی دینے لگی۔ جہاز نے دائیں جانب حرکت کی تو اس نے میرے بائیں کان میں جھک کے محبت کا اقرار کیا۔ پھر وہ مسکرائی۔ پھر میرا مذاق اُڑایا، پھر ہنسی، پھر میری ہنسی اُڑائی۔ پھر فرشتوں کی طرح میری پریشانی سے پریشان ہوئی مجھے تسلی دی اور نیند کے ساتھ مل جل کر غائب ہو گئی۔

(۳)

۱۱رستمبر۔ بحیرۂ عرب۔ صبح ذرا جلدی آنکھ کھلی۔ کیبن بوائے نے دروازہ کھول کے پوچھا۔ ''سینورے لیمن ہسکٹ؟'' میں نے کہا۔ ''بسکٹ''۔ جہاز ہلتا رہا۔ موجوں کی آواز آتی رہی۔ میری طبیعت ذرا ہلکی تھی۔ وہ بسکٹ لے کر آیا۔ کل کا اچار رکھا تھا۔ میں نے مشرق کے ساتھ مغرب کو کھایا۔ آدھے گھنٹے کے بعد ایک سنترہ کھایا اور لیموں کا عرق پیا۔ پھر سر چکرایا اور متلی سی ہونے لگی۔ فاروقی صاحب آئے اور کہا۔ ''اٹھئے، خاک پاک عرب قریب آ رہی ہے۔ آپ یہاں گرمی اور بند ہوا میں پڑے رہتے ہیں۔ اس میں طبیعت اور خراب ہوتی ہے۔ ذرا باہر عرشے پر تشریف لایئے۔'' میں نے ان سے وعدہ کیا اور وہ تشریف لے گئے۔ میں نے حجامت بنائی۔ آج شدت کا قبض تھا۔ عرشے پر پہنچ کے فاروقی صاحب سے باتیں کرنے لگا۔ انصاری اور ایوب مجھے دیکھنے آئے۔ میری طرح وہ تینوں بھی فریش تھے۔ انصاری نے

کہا۔ نصیر تو ابھی تک بستر پر دراز ہے اور سمندر کو ماں بہن کی گالیاں دے رہا ہے۔ سمندر بہت متلاطم تھا۔ مگر اوروں کی وجہ سے مجھے فرحت معلوم ہوئی۔ کیبن پہنچا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب قے ہوئی اور اب ہوئی۔ روکا اور پوری طرح کامیابی ہوئی۔ کھانے کے وقت مربا اور بسکٹ کھا کے لیموں کا عرق پیا۔ بے چینی سی معلوم ہوئی۔ اٹھ بیٹھا۔ عرشے پر گیا۔ سمندر کا تلاطم کم ہو چکا تھا۔ انصاری اور ایوب پھر آئے اور کہا۔ نصیر ابھی تک نہیں اٹھا۔ انصاری نے کہا۔ ''چلو پہلے درجے میں دیکھیں تو سہی راجہ صاحب کس حال میں ہیں۔'' اوپر پہنچے تو راجہ صاحب مسز چند کے ساتھ ڈک ٹینس کھیل رہے تھے۔ ٹینس ختم کر کے ہم لوگوں سے باتیں کرنے لگے۔ اور بجیڈ پلوایا۔ عورتوں کے متعلق مذاق کیا۔ میری ''معصومیت'' کا مذاق اڑایا۔ جہاز پر سنیما کا فلم دکھایا جانے والا تھا۔ عجیب مہمل فلم تھا۔ دو ریل دیکھ کے میں باہر نکل آیا اور فاروقی صاحب سے باتیں کرنے لگا۔ رات کے کھانے کے وقت تک ان سے باتیں کرتا رہا۔ پھر اپنے کیبن میں چلا آیا۔ اسٹیورڈ نیم برشت بلکہ ربع برشت انڈے لے کر آیا بسکٹ اور سنترے بھی منگوائے۔ اسٹیورڈ نے کہا ''آپ اچھے ہو گئے ہیں۔ اب کھانے کے کمرے میں کیوں کھانا نہیں کھاتے۔'' میں نے گجراتی ایرچ فان اشٹروہیم کا خیال کر کے دل ہی دل میں اسٹیورڈ کو برا بھلا کہا۔ پھر عرشے پر پہنچا تو عبدالرحیم صاحب فاروقی اسی طرح براج رہے تھے۔ میں نے کہا۔ ''آپ نے کھانا نہیں کھایا۔'' جواب دیا۔ ''بھوک نہیں تھی۔'' پھر سر عبداللہ المامون سہروردی، سر راس مسعود اور حکیم اجمل خاں مرحوم کے متعلق انہوں نے عجیب و غریب خیالات کا اظہار فرمایا۔ پھر مشہور و معروف ترکوں سے اپنی دوستی کے قصے سنائے۔ سب سے آخر میں مصطفیٰ کمال پاشا اور رومن رسم الخط کو گالیاں دیں اور رخصت ہوئے۔ میں نے اپنے دل میں کہا۔ ''خدا ہندوستانی مسلمانوں کو نیم خام اور ناکام لیڈروں سے محفوظ رکھے۔'' فاروقی صاحب کے متعلق میری رائے بدلنے لگی ہے۔

رات کو اچھی نیند نہیں آئی۔

(۴)

۱۲ر ستمبر۔ خلیج عدن۔ صبح تڑکے ہی اٹھا۔ نہایا۔ جہاز کے غسل خانے کے اسرار و رموز اچھی طرح سمجھ میں نہیں آئے۔ اسٹیوارڈ سے ناشتہ منگوایا تو وہ بڑبڑایا۔ مگر چائے، بسکٹ اور لیموں کا عرق لا دیا۔ کل

رات کو ہم جزیرہ سقوطری کے پاس سے ہو کے گذرے تھے۔ جہاں سے مون سون ہوائیں چلنا شروع ہوتی ہیں۔ اس حصے میں سمندر متلاطم تھا مگر اب تو ہم خلیج عدن کے دہانے پر ہیں اور سمندر کافی ساکت ہے۔

کیبن سے اوپر چڑھا تو درجۂ دوم کے ڈرائنگ روم کے سامنے میں نے ان بڑی بڑی تصویروں کو غور سے دیکھا جو مصری اثر کا نتیجہ معلوم ہوتی تھیں۔ آج سمندر ساکت تھا تو جہاز بڑا خوبصورت معلوم ہو رہا تھا۔ جہاز کا نام ہی کتنا پیارا تھا۔ ''کونتے دی توسکا۔'' نصیر اور انصاری مجھ سے ملنے آئے۔ میں نے فاروقی صاحب سے ان دونوں کا تعارف کرایا۔ انصاری اپنے ساتھ کچھ ہندوستانی رکارڈ لایا تھا۔ اس نے ڈرائنگ روم میں گراموفون پر ان رکارڈوں کو لگانا شروع کیا۔ قریب ہی مسٹر اور مسز چند بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ مسز چند آج بھی ساڑی پہنے تھی۔ معلوم ہوا مسٹر چند قانون کی ڈگری حاصل کرنے جا رہے ہیں۔ درمیان میں تعطیلات بسر کرنے آئے تھے۔ انصاری کو لوگوں سے ملاقات پیدا کرنے اور دوستی کا ڈھب خوب آتا ہے۔ بے تکلفی سے ان میاں بیوی سے باتیں کرنے لگا۔ مسز چند اس سے ہنس ہنس کے باتیں کر رہی تھی اور میں دور بیٹھا ہوا رشک کر رہا تھا۔

کھانے کے وقت میں نے صرف پھل کھائے اور وہ بھی اس ہندوستانیت اور اس سادگی سے کہ گجراتی ایرچ فان اشٹروہایم کی نگاہیں غصہ اور افسوس سے لبریز تھیں۔ گجراتی ایرچ فان اشٹروہایم نے سنترے کو بیچوں بیچ چھری سے کاٹا۔ میں نے سمجھا کوئی سفلی عمل کرنا چاہتا ہے مگر اس نے چائے کے چمچے سے رس نکال نکال کے پینا شروع کیا۔ کھانے کے بعد وہ مجنونانہ تیزی سے عرشے پر ٹہلنے لگا۔ اس کے بعد جب وہ فاروقی صاحب سے باتیں کر رہا تھا تو میں بھی ہمت کر کے قریب گیا۔ میرا اندازہ صحیح نکلا وہ گجراتی نژاد ہے، کینیا یا افریقہ کے کسی اور حصے میں کاروبار کرتا ہے۔ ایک بے وقوف بنگالی طالب علم سے ملاقات ہوئی جو ''س'' کو ''ش'' کہتا ہے اور گلاسگو جا رہا ہے۔ سنا ہے بڑا ذہین آدمی ہے۔ ایک سندھی نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ ان کے جانے کے بعد اس کے باپ کو بھی ایک گالی دی۔ سندھی کا نام مرچندانی ہے۔ یہ نام مجھے کچھ عجیب سا معلوم ہوا۔ فاروقی صاحب یورپ اور یورپ کی عورتوں کے قصے سناتے رہے۔

رات کا کھانا میں نے پھر کھانے کے کمرے میں کھایا۔ مرغ خراب تھا۔ پھل کھائے۔ پھر عرشے

پرفاروقی صاحب کو "بال جبریل" کے کچھ حصے سناتا رہا۔ سندھ کے مسٹر چنڈانی انگریزی میں بہت خوب، بہت خوب کہتے رہے۔ میں نے اردو میں بات کرنا چاہی تو معلوم ہوا کہ اردو نہیں بول سکتے۔ ان کے جانے کے بعد فاروقی صاحب نے پھر انہیں گالیاں دیں اور کہا۔ "سال بھر انگلستان میں رہنے سے گدھا آدمی نہیں بن سکتا۔ مسخرا اردو کا ایک لفظ بھی نہیں جانتا اور اقبال کی نظموں کی داد دے رہا تھا۔"

اس کے بعد فاروقی صاحب نے اقبال کے متعلق عجیب وغریب الفاظ استعمال کیے اور کہا۔ "بس ایسے ہی لوگ ڈاکٹر صاحب کے کلام کی تعریف کرتے ہیں جو اسے سمجھ نہیں سکتے۔ مثلاً یہ مسخرا۔۔۔ مرچنڈانی۔"

اب تو فاروقی صاحب سے باتیں کرتے ہوئے مجھے کوفت سی معلوم ہوتی ہے شاید ہی دنیا میں کوئی آدمی گالیاں دینے میں ان سے زیادہ ماہر ہو۔

عدن قریب آرہا ہے۔ مگر نیند عدن سے بھی زیادہ قریب ہے۔

(۵)

۱۳ ستمبر۔ رات کو جہاز عدن پر کچھ دیر ٹھہرا۔ انصاری اور نصیر وغیرہ نے وعدہ کیا تھا کہ مجھے جگا دیں گے مگر جگایا نہیں۔ جب جہاز ٹھہرا ہوا تھا تو چار پانچ منٹ کے لیے میری آنکھ کھلی۔ پھر سو گیا۔ عرب شور مچا رہے تھے اور عرب لڑکے وحشیوں کی طرح گا رہے تھے۔ میں نے اپنے دل میں کہا۔ یہی وہ لوگ ہیں

زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے
شعلۂ جانسوز پنہاں جن کی تلواروں میں تھے

صبح کو حجامت بنائی۔ دونوں غسل خانوں میں سے کوئی سا خالی نہ تھا۔ اس لیے نہا نہ سکا۔ ناشتے کے لیے کھانے کے کمرے میں گیا۔ مسٹر اور مسز چند نے میری طرف دیکھا اور میں نے عرب کے ساحل کی طرف جو دور نظر آرہا تھا۔ ریت کی چٹانیں تھیں۔ عرشے پر بڑی گرمی تھی۔ نصیر، ایوب اور انصاری ملنے آئے اور عرشے پر آرام کرسیوں پر لیٹ گئے۔ لیمونیڈ پی کے سب کے سب اونگھنے لگے۔ مسز چند نہانے

کا لباس پہنے اپنے شوہر کے ساتھ آئی۔ اس کی پیٹھ کے بالائی حصے اور شانے عریاں ہیں۔ آج گرمی زیادہ ہے۔ بحیرہ قلزم کی گرمی کی لہر کے ساتھ حسن کی ایک لہر۔

اس لہر کو دیکھ کر ہم چاروں اٹھے اور نصیر کے کیبن میں پہنچے۔ اکنامک کلاس میں سفر تکلیف دہ ہوتا ہوگا۔ بطریق ہندی لیموں شربت بنایا گیا اور سب نے پیا۔ میں واپس آیا تو دیکھا کہ دوسرے درجے کے عرشے پر راجہ ہمت نواز ونت بہادر مسز چند سے باتیں کر رہے ہیں۔ مجھے دیکھ کے بلایا اور مسز چند سے ملایا۔ ہاتھ ملاتے وقت میں نے اپنے سر میں خون کی گرمی اور تیزی محسوس کی۔ مسز چند وہی نہانے کا لباس پہنے ہوئے تھیں جس سے ان کی پیٹھ اور سڈول کاندھے اپنی پوری شان عریانی کے ساتھ باہر تھے۔ اس سے پہلے میں نے ایسے منظر صرف فلموں میں دیکھے تھے۔ اپنے دل میں کہا کہ یورپ میں ایسے ہزاروں منظر دیکھنے میں آئیں گے۔

یہ دیکھ کر کہ میں راجہ صاحب اور مسز چند کی باتوں میں مخل ہو رہا ہوں، وہاں سے ہٹ گیا اور فاروقی صاحب کے پاس پہنچا۔ وہ جنگ بلقان کے قصے سنانے لگے۔ اس زمانے میں وہ بقول خود ترکی گئے تھے۔

جہاز باب المندب سے ہو کر گذرا۔

لنچ کے وقت کری اور چاول کھائے جو پسند آئے۔ اطالوی کھانے ناولوں ہی میں اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ چیزوں کے نام کیسے اچھے اچھے ہیں۔ "اسپاگیٹی"، "ماکرونی" شاید خشکی پر یہ چیزیں اچھی معلوم ہوتی ہوں یا عادت ہو جانے پر۔ فی الحال تو ہندوستانی یا ہندوستانی نما کھانا ہی غنیمت ہے۔

مرچنڈانی نے بھی ہماری ہی میز پر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد میں اس سے باتیں کرتا رہا۔ سیدھا سادہ مگر بہت شریف آدمی ہے۔ باتیں کرتے کرتے میں کنکھیوں سے ایک آدھ بار مسز چند کی نیم برہنہ پیٹھ کو دیکھ لیتا تھا۔

مرچنڈانی کے جانے کے بعد کچھ دیر تک وہیں ڈرائنگ روم میں بیٹھے بیٹھے کچھ پڑھنے کی کوشش کی۔ مگر گرمی اس قدر تھی کہ کچھ نہ پڑھ سکا۔ عرب کا ساحل نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ باوجود اس کوشش کے اس ساحل سے محبت کا احساس دل میں پیدا ہو، اس ساحل سے کوئی اُنس نہیں پیدا ہو سکا۔ بچپن کی تربیت رائگاں گئی۔ جس طرح ہندوستان سے کوئی اُنس نہیں محسوس ہوا تھا، اسی طرح اس ساحل سے بھی نہیں۔

جہاز بحیرۂ قلزم میں چلا جا رہا تھا۔ عرب اور افریقہ دونوں کنارے نظر سے اوجھل تھے اور صرف گرمی ہی گرمی تھی۔ خدا جانے اس سمندر کو قلزم کیوں کہتے ہیں۔

چائے کے وقت بھی مرچنڈانی ہماری ہی میز پر بیٹھا۔ اس کے بعد ایک فلم دکھایا گیا جس کا نام تھا "اندھیرے میں جاسوس۔" عجب واہیات فلم تھا مگر مرچنڈانی کو بہت پسند آیا اور اس نے بہت تعریف کی۔۔۔ عجب خرنام شخص ہے۔ فاروقی صاحب نے پھر انگلستان اور فرانس کی جنسی زندگی پر تبصرہ شروع کیا اور کچھ اپنے تجربے بھی سنائے۔ رات کے کھانے کے وقت گجراتی ایرچ فان اشتروہایم صاحب بہت مہربان تھے۔ میں مچھلی کھانے کا کانٹا غلط استعمال کر رہا تھا۔ انہوں نے اصلاح کی۔

کھانے کے بعد کچھ پڑھنا چاہا۔ انصاری نے آ کے کہا راجہ صاحب بلا رہے ہیں۔ پہلے درجے میں ہم لوگ ان کے پاس پہنچے تو بیئر کا شغل فرما رہے تھے۔ ضیافت کرنا چاہی تو میں نے معافی چاہی۔ میرے لیے لیمنیڈ منگوایا اور کہا یہ تو عورتوں کے پینے کی چیز ہے۔ ان کے درجے میں ایک امریکن لڑکی سفر کر رہی تھی۔ راجہ صاحب اس کے حُسنِ جسمانی سے آج سہ پہر مسرور ہوئے تھے۔ اس لیے بہت خوش تھے اور مجھ سے انصاری سے اپنے کارنامے کی تفصیلات بیان کر رہے تھے۔

(۶)

۱۴ ستمبر۔ بحیرۂ قلزم۔ صبح کو حجامت بنائی، نہایا، پھر اوپر آ کے ناشتہ کیا۔ چار خطوط لکھے اس کے بعد انصاری وغیرہ سے ملنے اکنامک کلاس جانے کا ارادہ کیا۔ راستے میں انجن کے بائلر کے پاس سے گزرا۔ انجن میں کام کرنے والے نوکر (جو سب کے سب اطالوی تھے) میلے متعفن کپڑے پہنے گوشت کی بڑی بڑی بوٹیاں کھا رہے تھے۔ اس خیال سے خوشی ہوئی کہ غربت اگر ہندوستان میں بہت ہے تو یورپ میں بھی سرے سے مفقود نہیں۔ مسولینی حبش فتح کرنے کی تیاریاں کر رہا ہے اور اس کے ہم وطن مزدور، وحشیوں کی طرح نیم برشت بوٹیاں کھا رہے ہیں۔ انصاری وغیرہ کے ساتھ درجۂ اول میں گیا۔ راجہ صاحب ورزش کر رہے تھے۔ وہاں سے انصاری وغیرہ کے ساتھ اپنے درجے میں واپس آیا۔ انصاری نے کہا۔ "راجہ صاحب اور مسز چند کے تعلقات کچھ زیادہ گہرے ہیں۔" میں نے دریافت کیا۔ "پہلے سے یا ابھی یہ سلسلہ شروع ہوا ہے؟" نصیر نے کہا۔ "آپ تو احمق واقع ہوئے ہیں ورنہ جہاز پر جتنے نوجوان ہندوستانی ہیں سب نے کچھ نہ کچھ لطف اٹھایا ہے۔" مجھے یقین نہیں آیا اور اس خیال سے کہ اور پوچھوں گا تو یہ لوگ

اور زیادہ بے وقوف بنائیں گے، خاموش ہو گیا۔ یہ لوگ لنچ کے وقت رخصت ہوئے۔ لنچ کے بعد مرچنڈانی نے مسٹر چند سے میرا تعارف کرایا اور جب مسز چند سے تعارف کرایا تو وہ کہنے لگی میرا تعارف ہو چکا ہے۔ یہ کہہ کے وہ مسکرائی۔ میں انصاری اور نصیر کی باتوں پر غور کر رہا تھا۔ اب جو مجھے خیال آیا تو یاد آیا کہ بارہا میں نے راجہ صاحب کو اور مسز چند کو یکجا دیکھا تھا۔ میں نے اپنے دل میں غور کیا کہ اس کا شوہر کتنا احمق ہوگا کہ اسے اپنی بیوی کی حرکتوں کا پتہ نہیں چلا۔ معمولی قسم کی یورپین لڑکی سے شادی کرنے کا یہی نتیجہ ہے یا شاید وہ خود شادی کرنا نہ چاہتا ہوگا، پھنس گیا ہوگا۔

اس کے بعد عجیب اتفاق یہ ہوا کہ ادھر میں مرچنڈانی سے باتیں کر رہا تھا۔ اُدھر راجہ صاحب آئے اور مسٹر اور مسز چند سے باتیں کرنے لگے۔ اس کے بعد آہستہ سے میرے پاس آ کے کان میں کہا۔ "تم ذرا مسٹر چند کو باتوں میں لگاؤ۔ تاش کھیلنا آتا ہو تو رمی شروع کرو۔ میاں سیکھو یہ باتیں!" پھر میرے پاس سے سرک کر مسٹر اور مسز چند کی میز پر پہنچے۔ ان سے تاش کھیلنے کو کہا۔ وہ تیار ہو گئے تو ان دونوں کو ہماری میز پر لے آئے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ راجہ صاحب برابر مسز چند سے اشارہ بازی کر رہے تھے۔ ایک آدھ بازی راجہ صاحب نے خود بھی کھیلی۔ اس کے بعد کہا، میں نہانے جاتا ہوں۔ مسز چند نے بھی نہانے کی خواہش ظاہر کی۔ راجہ صاحب نے کہا فرسٹ کلاس کا سومنگ پُول بہت زیادہ آرام دہ ہے اور وہاں بہت اچھا مجمع ہوگا۔ مسٹر چند نے کہا میں بھی چلتا ہوں۔ راجہ صاحب نے میری طرف دیکھ کے آنکھ کا اشارہ کیا۔ میں نے کہا مسٹر چند گیم ختم ہو جانے دیجئے پھر ہم سب ساتھ ہی چلیں گے۔ مسٹر چند نے کہا اچھا اور کھیلنے میں مصروف ہو گئے۔ بازی شروع ہونے کے بعد ہی مسز چند نے اپنے شوہر سے کہا۔ "ڈارلنگ! مجھے گرمی بہت معلوم ہو رہی ہے۔ تم جلدی رمی ختم کر کے آؤ۔ میں نہانے جاتی ہوں۔" دو تین منٹ بعد راجہ صاحب بھی ٹل گئے۔

اب تو مجھے کامل یقین ہو گیا۔ کبھی یہ جی چاہتا تھا کہ مسٹر چند سے کہہ دوں۔ اے جا دیکھ تیری بیوی کیا کر رہی ہے۔ لیکن راجہ صاحب کے خیال سے خاموش رہا اور مسٹر چند خود ہی رمی میں اس قدر محو تھا کہ چائے کا وقت آ گیا اور چائے کے وقت مسز چند بھی آ موجود ہوئی۔

چائے پی کے میں نے فاروقی صاحب سے یہ واقعہ بیان کیا تو انہوں نے کہا۔ "راجہ اس کے شوہر کو بھی خوب پیسے دیتا ہے۔ چند کا باپ کنجوس ہے اور صرف ساڑھے تین سو پونڈ سالانہ دیتا ہے۔ ان

دونوں میاں بیوی کے ٹھاٹ باٹ کے لیے یہ کافی نہیں۔ یہ بھی ایک پیشہ ہے۔ میرے خیال میں تو چند جانتا ہے اور چشم پوشی کرتا ہے۔" یہ کہہ کے انہوں نے مسٹر اور مسز چند کی شان میں کچھ مغلظات ارشاد فرمائے۔

بحیرۂ قلزم میں غروب آفتاب کا سماں بہت اچھا معلوم ہوا اور رات اس سے بھی زیادہ اچھی۔ اس وقت ہمارا جہاز حرمین شریفین کے بہت قریب سے گزر رہا ہوگا۔ چاند بادلوں میں چھپ چھپ کے نکل رہا تھا جو بحیرۂ قلزم پر شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں۔ دور کی ہلکی ہلکی خاموش موجوں پر چاندنی کی چمک عجب لطف دے رہی تھی۔ میں چاند کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس قدر مدہوش سا تھا کہ فاروقی صاحب میرے پاس آ کے کھڑے ہو گئے تو مجھے معلوم بھی نہ ہو سکا۔ انہوں نے پوچھا۔ "بتائیے مولانا، اشعار کی آمد ہے یا وحی کی۔ یہ سارا خطہ، یرموک سے یمن تک اور یرون سے لے کر خلیج عدن تک انبیاء اور شعراء دونوں کو راس آتا رہا ہے۔"

میں نے کہا۔ "صاحب! شاعر تو میں ہوں ہی نہیں، اور رہ گئی وحی تو وہ قوم کے لیڈروں پر اترتی ہوگی۔"

اس کے بعد چاندنی کی تعریف ہوئی۔ فاروقی صاحب نے کہا۔ "ابھی کیا کل کوہ سینا پر چاندنی کی بہار دیکھیے گا۔"

دفعتاً میرے دل میں بلقیس کا خیال آیا۔ حضرت سلیمان کی محبوبہ بلقیس ملکۂ سبا کی سواری فلسطین کو خشکی کے راستے سے گئی تھی یا سمندر کے راستے؟ میں جانتا تھا کہ اس قسم کا سوال احمقانہ ہوگا اور فاروقی صاحب میری ہنسی اڑائیں گے، پھر بھی میں پوچھ بیٹھا۔ "بلقیس ملکۂ سبا کی سواری حضرت سلیمان کے پاس حجاز کے راستے گئی تھی یا بحیرۂ قلزم سے ہو کر۔"

فاروقی صاحب نے ہنس کر کہا۔ "ہوائی جہاز سے گئی تھی۔ آپ نے تختِ سلیمان کا ذکر نہیں سنا؟ وہ ہوائی جہاز کی غیر ارتقا یافتہ صورت تھی۔ اس میں روحانیت کے بادبان لگے تھے۔ کیوں آپ کو بلقیس کیوں یاد آئی؟"

کچھ لمحوں کے بعد میں نے جواب دیا "جس لڑکی سے میری شادی ہونے والی ہے اس کا نام بلقیس ہے۔"

فاروقی صاحب نے کہا۔ "بہت اچھا ہے، مبارک۔ ہمارے ہم وطن نوجوان ناحق گورے رنگ

اور ادرک جیسے بالوں پر مرتے ہیں۔ انجام یہ ہوتا ہے کہ مسز چند کی طرح کا کوئی کچھوا اٹھا لاتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "میرے خیال میں ہندوستانی لڑکیاں کسی طرح بھی حسن میں یورپین عورتوں سے کم نہیں۔"

انہوں نے کہا۔ "بیشک۔ ہماری لڑکیاں اگر اونچی ایڑی کے جوتے پہنیں اور اسی طرح تن کے چلیں تو کسی طرح یورپین عورتوں سے کم نہ معلوم ہوں۔"

اس کے بعد میں نے تفصیل سے بلقیس کا ذکر کیا اور خود مجھے انتہائی قلبی اطمینان اور فرحت معلوم ہونے لگی۔ فاروقی صاحب کے جانے کے بعد بھی میں چاند کو دیکھ رہا تھا اور بلقیس کے تصور میں محو تھا۔ سمندر کی لہروں کا جھاگ پانی میں چمک رہا تھا اور جھاگ پر بلقیس کی تصویریں بن رہی تھیں اور بگڑ رہی تھیں۔ اس کے بال بن رہے تھے اور سنور رہے تھے۔ موجوں کے شور سے اس کی باتوں کی آواز آ رہی تھی۔

موسیقی سننے ڈرائنگ روم میں گیا مگر ہر چیز اور ہر شخص سے بے خبر تھا۔ چاندنی کی لہروں پر میرا دل ہندوستان تک پہنچ کے بلقیس کی صورت دیکھتا اور پھر واپس آ جاتا۔

اطالوی بینڈ، روزینی، وردی، موتسارٹ وغیرہ کے انتخابات بجا رہا تھا۔ اور یہ موسیقی جو میرے لیے مقابلتاً نئی اور غیر مانوس تھی، باہر پھیلی ہوئی چاندنی کی مدد سے بلقیس کی تصویر بن کر میرے دل پر اثر کر رہی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد میں پھر سے عرشے پر باہر نکل آیا اور کٹہرے کے پاس کھڑا موجوں میں بلقیس کو دیکھنے لگا۔ دو سال گزر جائیں گے اور پھر وہ میری ہو کے رہے گی۔ مجھے اس وقت اس کا یقین سا ہو گیا۔

اگر محبت یہی ہے تو شعراء یہ کیوں کہتے ہیں کہ یہ اندھی ہے۔ اس کو غم، درد اور مصیبت کیوں قرار دیتے ہیں۔ کیا دنیا میں اس سے زیادہ تسلی اور اطمینان بخشنے والی کوئی اور چیز بھی ہے؟

(۷)

۱۵ ستمبر۔ بحیرۂ قلزم۔ جزیرہ نمائے سینا۔ نہر سویز۔ صبح کو گرمی تھی۔ میں جب منہ دھونے لگا تو مرزا نوشہ اسد اللہ خاں المتخلص بہ غالبؔ دہلوی نے چپکے سے میرے کان میں کہا:

شب کہ وہ جس فروز خلوت ناموس تھا
رشتۂ ہر شمع خار کسوتِ فانوس تھا

میں نے کہا: ''یہ شعر کافی ہے۔اس غزل کے اور شعر مت سنائیے۔'' غالب نے کہا۔''اچھا۔'' اور پھر یہ دو شعر سنائے:

شب خمار شوق ساقی رستخیز اندازہ تھا
تا محیط بادہ صورت خانہ خمیازہ تھا
یک قدم وحشت سے درسِ دفتر امکاں کھلا
جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

میں نے کہا: ''سبحان اللہ! میں اپنی اور بلقیس کی طرف سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں، جب اپنے دل۔۔۔یا اپنے دماغ کی کیفیت اپنے آپ کو سمجھانا چاہتا ہوں، آپ کو زحمت ،دیتا ہوں۔معاف کیجئے بڑی تکلیف ہوئی۔ تحصیل حاصل سہی مگر آپ کی تعریف آپ ہی کے ایک شعر سے ہو سکتی ہے:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

کیا کہنا۔خدا آپ کو اور آپ کی وجہ سے اردو زبان کو ابدالآباد تک زندہ رکھے۔''

مرزا غالبؔ مذاق میں کچھ کہنا چاہتے تھے۔مگر مطائبات غالب میں سے کوئی لطیفہ انہیں یاد نہیں آیا۔اس لیے محض یہ ارشاد فرمایا۔''میں کس قابل ہوں۔آپ کی عنایت ہے کہ بحیرۂ قلزم میں بھی مجھے یاد فرمایا۔''

مرزا غالب کے تشریف لے جانے کے بعد اوپر جا کے ناشتہ کیا۔ناشتے کے بعد مسٹر اور مسز چند سے کچھ باتیں کیں مگر دل نہیں لگا۔بوڑھا اسکاچستانی پادری نہایت معمولی قسم کا کوئی ناول پڑھ رہا تھا اور اس قدر دلچسپی سے پڑھ رہا تھا کہ حیرت ہوتی تھی۔دوپہر کے کھانے تک وقت اچھی طرح نہیں کٹا

لیکن تیسرے پہر کوہ سینا نظر آیا۔جہاز کوہ طور کے قریب سے گذر رہا تھا۔میں نے فاروقی صاحب سے کہا۔''حضرت موسیٰ کو دیدار نصیب ہوا بھی تو ان ریتلے ،خشک پہاڑوں میں''۔انہوں نے

نے جواب میں کہا۔''بصیرت چاہیے۔'' میں ان ریتلی اور بنجر پہاڑیوں کو دیکھ رہا تھا، جہاں بنی اسرائیل کے پیغمبر پیدا ہوئے اور تلقین کی۔جہاں سے شام سے مصر جانے والے اور عرب سے مصر آنے والے قافلے گذرتے تھے اور مجھے ان پہاڑیوں سے ایک طرح کی محبت معلوم ہوئی جس کی عقلی توجیہ نہیں کی جاسکتی۔چھ بجے کے قریب ایک فلم دکھایا گیا جو نہایت غیر دلچسپ تھا کہ میں باہر آ کے پھر ان پہاڑیوں اور سمندر کے جھاگ کو دیکھنے لگا۔ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی میں ان پہاڑیوں کا رنگ نکھرا اور غروب سے پہلے سمندر کے جھاگ پر قوسِ قزح کے سے رنگ جھلکنے لگے۔

پھر رات آئی اور سینا کی پہاڑیوں پر چاند چمکا۔ایک مدراسی عیسائی کچھ فاصلہ پر کھڑا ایرچ فان اشتروہایم سے باتیں کر رہا تھا۔گجراتی ایرچ فان اشتروہایم نے مجھ سے پوچھا۔''کیا دیکھتے ہو؟'' میں نے کہا۔''بنی اسرائیل کے چاند کو۔'' اس نے کہا۔''وہ کیا؟'' میں نے کہا۔۔۔''بنی اسرائیل کے چاند کو۔'' اس نے کہا۔''تمہارے بال بہت غلیظ ہیں۔ان کو ترشواؤ اور کنگھی پابندی سے کیا کرو اور کوئی تیل لگایا کرو۔'' فاروقی صاحب نے کہا۔''جب ریت کا طوفان آتا تھا تو بنی اسرائیل سروں پر اسی طرح کی جالی باندھ لیتے تھے جیسے آج کل یورپ کی عورتیں باندھتی ہیں تاکہ بال جمے رہیں، تم بھی ایسی ایک جالی خرید لو۔'' میں نے دونوں کا شکریہ ادا کیا۔مگر دل میں ضرور خفیف ہوا۔

یہ رات بڑی خوبصورت تھی۔ہم آہستہ آہستہ نہر سویز کی طرف بڑھ رہے تھے۔جہاز کا آرکسٹرا ''رگوتو'' کے انتخاب بجا رہا تھا اور عرشے پر اس کی دھیمی دھیمی آواز آ رہی تھی۔چاند کو بلقیس سے خاص مناسبت تھی۔بلقیس وہی ماہ سیما تھی جس کی فال میں نے ''بانگِ درا'' میں دیکھی تھی مجھے ہمیشہ بلقیس ،چاند اور مونا لسا میں ایک طرح کی مشابہت معلوم ہوتی ہے۔

جب جہاز بندر سویز میں ٹھہرا تو کچھ مصری سپاہی اوپر چڑھ آئے۔ہم لوگوں سے سگرٹوں کی فرمائش کی۔سویز کی روشنیاں بڑی خوبصورت معلوم ہو رہی تھیں۔معلوم ہوا کہ طبی معائنہ ہونے والا ہے۔طبی معائنوں سے میں ہمیشہ گھبراتا ہوں۔اگر چاندنی نہ ہوتی تو ایک مجھ ہی کو کیا سب کو طبی معائنہ کا انتظار بڑا کھلتا۔ڈاکٹر کسی طرح آ ہی نہیں سکتا تھا۔انتظار کی گھڑیاں کاٹنے کو اسی مدراسی عیسائی لڑکے اور ایک سوستانی انجینئر نے ایک دوسرے کو مقابلے کی دعوت دی کہ کون زیادہ شراب پیتا ہے۔دونوں بار کے اسٹولوں پر بیٹھے اس بے تکلفی سے پی رہے تھے جیسے کوئی پانی پی رہا ہو بلکہ جیسے گھڑوں میں پانی ڈالا

جارہا ہو۔ کچھ دیر یہ تماشا دیکھ کے میں پھر باہر عرشے پر نکلا۔ مصری ڈاکٹر تمام جہازیوں کو نفس کے سلام کرتا ہوا رخصت ہوا۔ معلوم ہوا کہ طبی معائنہ تھا۔ اس ہنگامے کے بعد میں درجۂ اول کی طرف گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک کونے میں راجہ صاحب اور مسز چند لپٹے ہوئے کھڑے ہیں۔ میں واپس پلٹا تو راجہ نے آواز دی مگر میں معافی چاہتا ہوا واپس چلا آیا۔ رات کو بلقیس کی یاد زہرہ مدیچی کی صورت میں آئی۔

۱۶ ستمبر۔ کل رات کا جادو کچھ ایسا تھا کہ جب سونے کو کیبن میں لیٹا تو نیند نہیں آئی۔ مشکل سے رات بھر میں ایک آدھ گھنٹہ سویا ہوں گا۔ مگر وہی

''شب خمار شوق ساقی رستخیز اندازہ تھا''

صبح کو نہایا تو طبیعت چاق ہوئی۔ گجراتی فان اشٹروہایم کی نصیحت یاد کر کے بالوں میں بڑی محنت سے کنگھی کی۔

جہاز آہستہ آہستہ نہر سویز سے گزر رہا تھا۔ راستے میں خیابان، جھیلیں اور ریل کی پٹریاں نظر آرہی تھیں جن پر کبھی کبھی کوئی ریل چلتی یا سڑک پر کوئی موٹر گذرتی ہوئی نظر آتی جس میں کوئی مصری پاشا ترکی ٹوپی پہنے بیٹھا ہوتا۔

قنطرہ مجھے بہت پسند آیا۔ پورٹ سعید پہنچنے سے چند منٹ پہلے فاروقی صاحب نے کہا۔ ''پورٹ سعید نصف یورپ ہے۔'' پورٹ سعید پہنچنے کے بعد میں نے اپنے دل میں کہا۔ ''اگر یہ نصف یورپ ہے تو خدا ہی یورپ پر رحم کرے۔'' انصاری وغیرہ کے ساتھ اترا تو وہ تمام باتیں جو پورٹ سعید کے متعلق سنی تھیں، دیکھیں۔ رنڈیوں کے دلال اور یہودیوں کی دکانیں، ایک صاف سڑک اور کئی گندی گلیاں اور بچے جو منہ سے سکے پکڑنے کے لیے سمندر میں غوطہ لگاتے ہیں۔ لب لب بیچنے والوں اور دلالوں کے ہجوم سے تنگ آگیا تو جہاز پر واپس پہنچا۔ ادھر میں آیا، ادھر دیکھا کہ مسٹر چند اُتر کر جارہا ہے مگر مسز چند اس کے ساتھ نہ تھی۔ معلوم نہیں شیطان نے کیا ورغلایا کہ میں درجۂ اول میں سیدھا راجہ صاحب کے کیبن پہنچا اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے باتوں کی آواز آرہی تھی اور مسز چند کی آواز بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس کی آواز سن کے میں پلٹنے ہی والا تھا کہ راجہ صاحب نے دروازہ کھولا۔ ابھی سہ پہر کا وقت تھا مگر وہ اس قدر پیے ہوئے تھے کہ لڑکھڑا رہے تھے۔ مجھے دیکھ کے کہا۔ ''اندر آؤ۔'' میں گیا تو دیکھا مسز

چند بستر پر شال سے ڈھکی ہوئی پڑی تھی اور وہ بھی تقریباً مدہوش تھی۔ راجہ نے اسی طرح سے لڑکھڑاتے ہوئے کہا۔ ''یہ کیا شرارت ہے تم سے اس وقت آنے کو کس نے کہا تھا۔ میں سمجھا چند ہے۔ میں نے دروازہ کھولا کہ آ اپنی جورو کو دیکھ۔ کل اسے پچاس پاؤنڈ دیئے تھے۔ میں اکیلا بیوقوف ہوں، نہیں تو اس جہاز پر کون سا ہندوستانی لڑکا ہے جس نے اسے نہ چھوا نہ ہو۔ کسی نے ایک پیسہ خرچ نہیں کیا۔ میں بیوقوف ہوں بے وقوف!''

مسٹر چند اس وقت پورٹ سعید کی سیر فرما رہے تھے۔ انہوں نے بعد میں اپنا قصہ بیان کیا (لیکن میں نے یہ قصہ ان سے بیان نہیں کیا) کہ ایک مصری لڑکے نے ان کا پیچھا کیا اور برابر پوچھتا گیا۔ ''کوئی فرانسیسی لڑکی چاہیے؟'' اور جب وہ چائے پینے ایک ہوٹل کے برآمدے میں پہنچے تو سامنے کی میز پر ایک فرانسیسی لڑکی بیٹھی تھی۔ لڑکے نے کہا۔ ''یہ لڑکی بھی مل سکتی ہے۔'' اور مسٹر چند کو اس کا ہلکا سانولا رنگ اور اس کی مسکراہٹ بہت اچھی معلوم ہوئی۔ وہ مسکرائی اور وہ لڑکی بھی مسکرائی اور انہوں نے اس لڑکے کو کچھ انعام دے کر رخصت کیا اور وہ پھر مسکرائی اور اٹھ کے ان کی میز پر آئی اور ان سے پوچھا ''دلے وو فیر امور اوک موآ؟'' اور یہ باوجود اس کے کہ معنی نہیں سمجھے تھے، مطلب سمجھ گئے اور کہا۔ ''ہاں!'' اور پھر انگریزی میں معاملہ طے ہوا اور ایک پونڈ معاوضہ قرار پایا (پچاس پونڈ راجہ صاحب نے دئے تھے) اور پھر مسٹر چند لڑکی کو ہوٹل میں لے گئے اور کمرے کا کرایہ پانچ شلنگ ادا کیا۔

(۸)

۱۷ ستمبر۔ صبح ساڑھے آٹھ بجے اٹھا اور کیبن ہی میں ناشتہ کیا۔ دن بھر پڑھتے گذرا۔ ایک کتاب پورٹ سعید پر لی تھی۔ وہ مسٹر چند نے مانگی۔ اسے دے دی۔ مسز چند سے ملاقات ہوئی۔ چائے کے وقت اس کا چستانی پادری سے برنرڈ شا اور وحشی قبائل کے متعلق گفتگو ہوئی۔ پورٹ سعید پر ایک اطالوی عورت سوار ہوئی۔ اس کی طرف بار بار دیکھا کیا۔ اس نے بھی ایک آدھ بار دیکھا، پھر انجان ہوگئی۔

فاروقی صاحب کی آواز نے مجھے جگادیا۔ وہ ''مدراسی شرابی'' کو اردوئے معلیٰ میں گالیاں دے رہے تھے۔

بلقیس۔۔۔ کیا مجھے بلقیس سے محبت ہے یا شاید میں اس سے محبت میں مبتلا رہنا چاہتا ہوں۔ یہ خواہش سلسلہ برپائی کی خواہش ہے۔

۱۸ ستمبر۔ اب یورپ قریب آ رہا تھا اور سب بحث کر رہے تھے کہ جنیوا سے لندن کس راستے جائیں گے۔ لوزان سے ہوتے ہوئے یا برن کے راستے۔ یا توری نو سے یا ریویرا ہو کر اور بحث بہت دلچسپ تھی۔

سہ پہر کو چائے کے بعد جب جہاز پر سینما دکھایا جانے لگا تو مسز چند نے مجھے اشارہ سے پاس بیٹھنے کو کہا۔ دماغ عشرت منزل جا پہنچا جہاں بلقیس ایک وزیر اعظم کی بیوی تھی۔ اور وزیر اعظم کی خواب گاہ میں ایک کھڑکی تھی اور جب وزیر اعظم ملک کے دوسرے حصوں کا دورہ کرتا تو وہ کھڑکی رات رات بھر کھلی رہتی۔

رات کو آبنائے سینا کی روشنی دیکھی۔ دونوں طرف نور کی ایک قطار تھی جس سے زمین اور پانی، آسمان اور ہوا سب جگمگا رہے تھے۔ ایک طرف اٹلی اور دوسری طرف سسلی، وہی سسلی جہاں عربوں نے حکومت کی اور جہاں فریڈرک ثانی نے دربار لگایا اور جس کے متعلق اقبال نے ایک نظم لکھی۔

یورپ آ گیا۔

جنگ اور خونریزی۔ نسلی تعصب اور سیاسی تدبر والا یورپ نہیں بلکہ جگمگاتی روشنی والا یورپ۔

ریجیو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ستاروں کا ناچتا ہوا جمگھٹ جو زینہ بہ زینہ اوپر چڑھتا جاتا تھا۔

ساحل پر روشنی کی ایک بڑی قطار سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کوئی سڑک ہوگی۔ مسینا کی روشنی ریجیو کے چراغوں سے زیادہ نظر فریب تھی۔

ایک اطالوی جہازی افسر پاس ہی عرشے کے کٹہرے کا سہارا لگائے اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے ریجیو اور مسینا کا ذکر کیا۔ میں نے پرانڈلو کا ذکر کیا تو اس نے کہا میں اس سے واقف نہیں وہ ابی سینا کی فتح پر تلا ہوا تھا۔ ”سینورے چار سال گذشتہ جنگ میں لڑ چکا ہوں مگر اب پھر لڑنے کو تیار ہوں اور میرے جیسے بہت ہیں جو لڑنے کے لیے تیار ہیں۔“

ایک مینار سے نیلی روشنی کی شعاعیں نکل رہی تھیں۔ ایک پہاڑی روشنی سے ثریا بنی ہوئی تھی۔ مسینا کی روشن آبادی کے اوپر آسمان پر صرف ایک ستارہ جگمگا رہا تھا۔ روشنی کی ایک قطار ایک پہاڑی پر چڑھتی ہوئی لگ رہی تھی۔

اور اسی راستے سے یولی سیز اور عرب سیاحوں نے سفر کیا تھا۔

(۹)

نیپلز، ناپل، ناپولی۔ جوں جوں جہاز نزدیک پہنچ رہا تھا، اطالیہ کی مشہور و معروف بندرگاہ قریب آ رہی تھی۔ لیکن پہلے نظارہ میں یہ بندرگاہ مجھے زیادہ بھلی نہیں معلوم ہوئی۔ پھر میں نے یورپ کے ساحل پر قدم رکھا۔ نیپلز کی سڑکیں غلیظ اور خوبصورت تھیں اور مشرقیت کا رنگ اچھا خاصہ تھا۔ فاروقی صاحب کے ساتھ پومپی آئی جاتے ہوئے نیپلز کے بہت بڑے حصے سے گذرے۔ میں عمارتوں اور عورتوں کو دیکھ رہا تھا۔ عورتیں اتنی حسین معلوم نہیں ہوئیں جتنی توقع تھی۔ فاروقی صاحب نے پوچھا بھی ”بتایئے سرزمین یورپ پر قدم رکھنے کے بعد کیا ارتعاشات آپ کے دل میں پیدا ہو رہے ہیں؟“ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

پومپی آئی کے کھنڈر سڑک پر پرانی رتھوں کے پہیوں کے نشانات، بازار، عدالت کا کمرہ پچی کاری کا کام، پومپی آئی کے باغات اور مجسمے اور رویتی کا محل، کھانے کا کمرہ، اور خانگی کمرے اور دیواروں پر نقش کوک شاستر، سرخ رنگ اور سیاہ رنگ اور دیوار پر منقش کوک شاستر اور ایمفی تھیٹر۔

پھر واپس نیپلز۔ اب عورتیں جو راستوں پر چل رہی تھیں، اچھی معلوم ہونے لگیں۔ اور یہ بھی محسوس ہونے لگا کہ یہ شہر ہندوستان کے شہروں سے کتنا مختلف ہے۔ عورتوں نے عمارتوں اور سڑکوں اور چہل پہل اور ہلچل میں جان سی ڈال دی ہے۔ اب کہیں کہیں ایسے چہرے بھی دکھائی دینے لگے جو بوتی چیلی کی تصویروں میں دیکھے تھے۔ مگر غربت کی حکومت تھی۔

پومپی آئی اور نیپلز کی اس سیر میں دو عورتوں سے آنکھیں چار ہوئیں ایک تو پومپی آئی کے کھنڈروں کے دروازے کے پاس سامنے سے گذری۔ اس کی آنکھیں بڑی خوبصورت تھیں۔ دوسری کو میں نے میوزیم کے پاس دیکھا۔ یہ سیاہ ماتمی لباس پہنے تھی اور اس کا سن کوئی پچیس ایک سال کا ہوگا اور اس نے ذرا تجسس سے میری طرف اور میرے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور پھر سڑک پار کرنے کو چلی۔

سر میں شدید درد تھا، گرمی کی وجہ سے۔ لیموں کی سکنجبین پی۔ مگر سر کا درد کم نہ ہوا۔ کھانا کھایا پھر کچھ دیر آرام کیا۔ جہاز نیپلز سے چلا۔ درد سر باقی رہا۔ رات کے کھانے کے بعد دیر تک باہر ہوا میں بیٹھا رہا کہ سر درد کم ہو۔ عرشے پر کئی لوگ جمع ہوئے۔ باتیں کرتے رہے۔ رات کے بارہ بجے سب لوگ چلے گئے۔ میں بیٹھا رہا۔ عرشے پر ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی اور میں گرم کپڑے پہنے تھا۔ ایک بجے ذرا تھی

چند باہر نکلی۔ معلوم نہیں کس کے کیبن سے نکل کے کس کے کیبن کو جانا چاہتی تھی۔ مجھے اکیلا دیکھ کے قریب آئی کہا کہ ''اجنبی'' کو دیکھ کے بہت خوشی ہوئی۔

(۱۰)

۲۰ ستمبر۔ جہاز کے ملازم نے ساڑھے چار بجے ہی اٹھا دیا تھا مگر چھ بجے تک اونگھتا رہا۔ صبح کو جہاز جینوا کی بندرگاہ میں داخل ہو رہا تھا جہاں کا قبرستان بہت خوبصورت ہے۔ مجھے تو یہ شہر نیپلز سے زیادہ حسین معلوم ہوا۔ یہاں آ کے معلوم ہوتا تھا کہ یورپ میں ہوں۔ میں نے اور مرچنڈانی نے یہ طے کیا تھا کہ دونوں برن کے راستے انگلستان جائیں گے۔ شہر کے اطراف میں دور دور تک پہاڑیوں پر مکانات کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ جو بہت خوبصورت معلوم ہوتا تھا۔ ان مکانات کے منظر کو دیکھتے ہوئے ہم لوگ ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ جس ڈبہ میں سوار ہوئے، اس میں مس، اور مسٹر اور مسز چند بھی تھے جو لوزان کے راستے سے جا رہے تھے۔ کچھ دور تک ہمارا ان کا ساتھ تھا۔ میں خاموش تھا اور دل چاہتا تھا کہ باتیں نہ کروں پھر بھی مسٹر اور مسز چند سے باتیں کرتا رہا۔ جب ریل چلی تو ذرا تھی چند فرش پر بیٹھ گئی اور میاں کے دونوں پیروں کو گود میں رکھ کے بھینچا۔ مرچنڈانی نے مجھ سے کچھ عرصے کے بعد چپکے سے کہا کہ ان دونوں میاں بیوی کے بیٹھنے کا یہ طریقہ سخت قابل اعتراض ہے۔ جب ریل چلی تو کچھ عرصے تک تو جینوا کے پہاڑی مکانوں کا سماں دیکھتا رہا۔ چند نے نیپلز کی سیر کے بعد ویسوویس وہاں سے کچھ انگور چرائے تھے۔ وہ انگور سب نے کھائے۔

میلانو کا اسٹیشن بڑا خوبصورت تھا۔ سب نے مل کر ایک ٹیکسی کرائے پر لی۔ یہ شہر مقابلتاً جدید معلوم ہوتا ہے اور اس میں ''یور پا ینت'' زیادہ ہے۔ پھر لیونارڈو ونچی کے نقش دیوار ''آخری طعام'' کو دیکھا۔ میلانو کا معروف کلیسا دیکھا۔ اس کی عظمت اور اس کے حسن کا اثر دل پر بہت دنوں رہے گا۔

اسٹیشن واپس پہنچ کے کیک اور کچھ پھل خریدے۔

لوگے ماجیورے۔ کیا دنیا میں اور بھی کوئی جھیل اتنی خوبصورت ہوگی۔ مگر اب تک میں نے کوئی اور جھیل دیکھی ہی نہیں۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ یہ منظر دنیا کے حسین ترین مناظر میں سے ہے۔ ریل جھیل کے کنارے کنارے چلی جا رہی تھی اور افسوس یہ ہے کہ استریزا پر نہ اتر سکا۔ مگر ریل ہی سے اس کا منظر ایسا

دلکش معلوم ہوتا تھا کہ بیان میں نہیں آ سکتا۔ ایک قلی نے آ کے کہا۔ ''بسٹو رے استریزا اے بیلا۔'' چند نے اس کے معنی سمجھائے۔ ''استریزا خوبصورت ہے۔'' جزیرے سجے ہوئے اور آباد تھے۔ ایک موٹر بوٹ پر کچھ لوگ سوار تھے۔ انہوں نے چلتی ریل کے مسافروں کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور مسافروں نے ان کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ یہ جانور جسے انسان کہتے ہیں اپنی نوع کے اجنبیوں کو کتنا پسند کرتا ہے۔ اب ہم آلپ پہاڑوں میں سے گزر رہے تھے۔ ریل کبھی اوپر چڑھتی، کبھی نیچے اترتی، کبھی سرنگوں میں سے ہو کر گزرتی کبھی بلندی سے گہری وادیاں نظر آتیں، جن میں صنوبروں کے ہجوم میں کوئی چشمہ بہتا نظر آتا۔ کبھی اوپر برف پوش چوٹیاں دکھائی دیتیں، اور نشیبوں پر خوبصورت مکانات اور جھونپڑے بنے تھے۔ وہ اس منظر پر تراشے ہوئے جواہرات کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ ان پہاڑوں پر آبادیاں بھی تھیں۔ کاش ریل ٹھہر جاتی اور ساری عمر یہیں سے گزرتی مگر کچھ دنوں کے بعد پہاڑ میں گھری ہوئی آبادی قید خانہ معلوم ہونے لگتی ہوگی جیسے ہندوستان۔

سمپلان کی سرنگ۔ چند نے کہا۔ یہ دنیا کی سب سے بڑی سرنگ ہے، اور جب اس سے نکل کے ہم برگ پہنچے تو مسٹر اور مسز چند لوزان جانے والے ڈبہ میں چل دیے۔ ہماری ریل نے اوپر چڑھنا شروع کیا۔ نیچے ایک وادی میں میلوں تک ایک ندی بہتی چلی گئی تھی جس کے کناروں پر صنوبروں کی قطاریں تھیں۔ منظر اس بلندی سے عظیم الشان معلوم ہو رہا تھا۔ وادی کی آبادیاں مختصر تھیں اور ایسی خوبصورت کہ آدمی انہیں دیکھ کے محو ہو جاتا ہے۔ اور ہماری گاڑی کو بڑے بھاری بھرکم پل ایک پہاڑ سے دوسرے پہاڑ تک، ایک سرنگ سے دوسری سرنگ تک پہنچا رہے تھے۔

ہم اب بھی پہاڑوں میں گزر رہے تھے مگر اب رات ہوگئی تھی۔ ایک سوستانی ہم سفر نے ہم سے کہا کہ اب ہم نیچے اتر رہے ہیں۔

برن پہنچے تو یہاں کی صفائی اور روشنی اطالیہ کے شہروں سے اس قدر زیادہ تھی کہ معلوم ہوا ہم یورپ میں ہیں۔ مرچنڈانی کے سوستانی دستوں کے ساتھ کھانا کھایا اور ہوٹل نار منڈی میں ٹھہرے۔ جب ہم ہوٹل کے کمرے میں کھانا کھا رہے تھے تو تین انگریز لڑکیاں ہنستی ہوئی آئیں اور ایک میز پر بیٹھ گئیں۔

میں زندگی سے بہت خوش ہوں۔ مرچنڈانی کے دوست بہت امیر تھے، انہوں نے توجہ تک نہیں کی۔

۲۱ ستمبر۔ صبح کپڑے پہن رہا تھا کہ ایک خادمہ چائے لے کر آئی۔ اس کا سیاہ لباس اور اس پر بندھا ہوا سفید کپڑا بہت اچھا معلوم ہوا لیکن کچھ چھیڑ چھاڑ کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ ساڑھے آٹھ بجے ناشتہ کرنے نکلا۔ مرچنڈائی پہلے ہی سے میز پر موجود تھا۔ اس کے بعد ہم برن کی سیر کو۔۔۔۔"

(یہاں نعیم کی ڈائری دفعتاً ختم ہو جاتی ہے)

چوتھا باب

عادل

مدرسۂ علم آثار قدیمہ میں طالب علموں کی تعداد اچھی خاصی تھی۔ جب حیدرآباد میں یہ مدرسہ قائم ہوا تو اس کا مقصد زیادہ تر یہ تھا کہ آثار قدیمہ کی تحقیق کے لیے نوجوان کو تیار کیا جائے لیکن بہت جلد اس میں بہت سے شعبوں کا اضافہ ہو گیا۔ اس کا نام تو مدرسۂ علوم آثار قدیمہ ہی رہا لیکن یہاں تاریخ، فنون لطیفہ، تاریخ ثقافت، طبقات الارض اور بہت سے علم کی تعلیم دی جانے لگی۔

یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب مدرسے کی عمارت بن رہی تھی۔ جس کو ایک قابل نقشہ نویس نے اس خوبی سے تیار کیا تھا کہ دکن کی ہزار سال کی ثقافت کے تمام عناصر اس میں نمایاں تھے۔ بیگم پیٹ اسٹیشن سے وہاں تک ریل کی چھوٹی سی پٹری ڈالی گئی تھی جس میں ہزار ہاٹن سامان مٹی اور پتھر سب ہی آتا اور سینکڑوں مزدور کام کرتے تھے۔ جن طلبا کو وہاں منتقل ہونا تھا وہ اکثر اس نئی عمارت کو دیکھنے جایا کرتے تھے۔ قریب ہی ان کا بورڈنگ ہاؤس تھا۔

عادل بھی اسی مدرسے اور اقامت خانے میں تھا اور اچھا خاصا ہوشیار طالب علم سمجھا جاتا تھا۔ وہ اس امتحان کی تیاری کر رہا تھا جس کا اس مدرسے کے سوا ہندوستان میں کہیں وجود نہیں یعنی بیچلر آف آرکیالوجی۔ بورڈنگ ہاؤس میں شروع شروع میں تو اس کی اچھی گزری اور کچھ دن تو ایسے بھی آئے جب اس کی توقع تھی کہ اسے عریف طعام مقرر کیا جائے گا۔ اس کی ظرافت کی داد بھی دی جاتی تھی۔

اپنی ظرافت کے ایک قصے پر اسے خصوصیت سے بہت ناز تھا۔ ایک بار وہ اٹاچی کیس لیے بورڈنگ ہاؤس آ رہا تھا۔ دروازے کے قریب کچھ لڑکے کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے پوچھا ''کیا آج جمعرات ہے؟'' دوسرے نے کہا۔ ''جمعرات تو نہیں مگر آج حجام آیا ہے۔'' اس پر عادل سمجھا کہ بن گیا اور وہ خاموش ہی تھا کہ پہلے لڑکے نے پھر پوچھا۔ ''کیا کیا سامان اس اٹاچی کیس میں لایا ہے۔'' اس پر عادل کو موقع مل گیا اور اس نے کہا۔ ''اس میں باٹا اور فلیکس دونوں ہیں جس سے کہئے اس سے حجامت کردوں۔''

غرض بورڈنگ ہاؤس میں عادل اچھی طرح گزار رہا تھا کہ دفعتاً وہ غائب دماغ سا رہنے لگا۔ اس کے سرہانے سے ایک تصویر برآمد ہوئی (یہ تصویر بلقیس کی تھی)۔ تصویر برآمد ہونے کی حد تک تو کوئی حرج نہ تھا۔ لیکن اس کے ہم کمرہ لڑکے نے اسے اس تصویر سے پیار کرتے دیکھا تھا۔ جب یہ تصویر چرائی گئی تو اسے اس قدر غصہ آیا اور زیادہ ستائے جانے پر وہ اتنا مضحکہ خیز بن گیا کہ دوسرے لڑکوں کا طرزِ عمل بدلنے لگا۔ ایک دن اس نے اس لڑکے کی 'فاتحہ' اڑائی جس نے تصویر چرائی تھی۔ جاڑوں کے زمانے میں اس پر ٹھنڈا پانی پھینکا جس کی وجہ سے اس لڑکے کو نمونیا کا اثر ہو گیا۔ وہ تو ہسپتال چلا گیا مگر دوسرے لڑکے عادل کے دشمن ہونے لگے۔ وہ اسے کوئی سخت تکلیف دینا چاہتے تھے مگر اسی نمونیا کے مریض لڑکے نے اس کے سامان کی تلاشی کا مشورہ دیا اور یہ امید ظاہر کی کہ کوئی نہ کوئی دلچسپ چیز ضرور برآمد ہوگی۔ ایک دن جب عادل باہر تھا اس کے تمام صندوقوں کے قفل توڑے گئے۔ ایک چھوٹی سی بیاض ملی جس میں بلقیس کی تعریف اور اپنے عشق کے اظہار میں نظمیں تھیں۔ اسی مریض لڑکے کے مشورے سے ذرا تصرف کے ساتھ انہیں نظموں کو ہجو میں بدل دیا گیا اور یہ دیوان ''ارتعاشاتِ عادل'' کے نام سے شائع ہوا اور اس کی ایک ایک جلد عاقل صاحب اور ان کے بھائی کو بھیجی گئی۔

اس طرح بورڈنگ ہاؤس میں عادل کا رہنا قریب قریب دشوار ہو گیا اور وہ غالباً بورڈنگ ہاؤس کو بھی چھوڑ دیتا مگر تعطیلات کا زمانہ آ گیا اور اس کے دشمن دوست اپنے اپنے گھروں کو رخصت ہونے لگے۔

تعطیلات کے ختم ہو جانے کے بعد جب لڑکے پھر بورڈنگ ہاؤس میں واپس آئے تو انہوں نے عادل کا استقبال کرنے کا باقاعدہ انتظام کیا۔ دروازے سے لے کر کمرۂ طعام تک وہ باقاعدہ صف باندھ

کر کھڑے ہو گئے۔ جب تانگے سے سامان اتروا کر وہ اپنے کمرے میں جانے لگا تو دورویہ سنگت نے تالیاں بجا بجا کر گانا شروع کیا۔

''جب چھم سے چلیں گود میں چپکے سے اٹھا لو''

(۲)

اس دن اس نے تہیہ کر لیا کہ بورڈنگ ہاؤس کو چھوڑ دوں گا۔ پانچ بجے کے قریب اس نے سائیکل پر صفدر نگر جانے کا ارادہ کیا۔ وہ چچی (خانم) سے پہلے یہ تذکرہ کرنا چاہتا تھا کہ بورڈنگ ہاؤس میں وہ نہیں رہنا چاہتا۔ اگر چچی اور عاقل چچا تیار ہو جائیں تو وہ صفدر نگر منتقل ہو جائے گا، دن رات بلقیس نظروں کے سامنے رہے گی۔ وہ بیگم پیٹ سے سائیکل پر چلا۔ وہی راستہ جو اس نے اس سے پہلے ہزاروں بار طے کیا تھا آج پھر طے کیا۔ اس راستے میں وہ ایک ایک مکان، ایک ایک ٹوٹی ہوئی دیوار، میونسپلٹی کے ہر نل اور کچرے کے ہر ڈھیر سے واقف تھا۔ جوں جوں وہ صفدر نگر سے قریب ہوتا جاتا کلفت مٹتی جاتی اور بلقیس کی صورت آنکھوں میں پھرتی جاتی۔

(۳)

اس دن خانم کے یہاں اور بھی لوگ جمع تھے۔ خانم کا ایک رشتے کا بھائی تھا جس کا نام مختار عالم تھا۔ مختار نے ایل ایل بی امتحان پاس کر کے شہر کے ایک نامور بیرسٹر کے ساتھ کام شروع کیا تھا اور اس کی وکالت کے چمک جانے کی اچھی خاصی توقع تھی۔ وہ فربہ جسم اور چھوٹی آنکھوں کی وجہ سے ہوشیار معلوم ہوتا تھا لیکن طبعاً بہت نیک تھا۔ اسے خانم سے بہت لگاؤ تھا اور وہ اکثر ان کی لچھے دار باتیں سننے آیا کرتا۔ دوسرا لڑکا جو وہاں موجود تھا، داؤد احمد تھا۔ یہ عاقل خاں کا دور کے رشتے کا عزیز تھا اور عادل کا ہم عمر تھا۔ ایم اے پاس کرنے کے بعد اسے ایک تعلقہ پر ایک مدرسۂ وسطانیہ کی صدر مدرسی کی خدمت مل گئی تھی اور آج کل رخصت پر یہاں آیا ہوا تھا۔

عادل کی بدقسمتی تھی کہ اسی روز اس کے بورڈنگ ہاؤس کے کچھ لڑکوں کی داؤد سے ملاقات ہوئی تھی اور اس نے خانم سے عادل کی گت بننے کا قصہ بیان کر دیا تھا۔ سب اسی پر ہنس رہے تھے کہ عادل پہنچا۔

خانم نے کہا۔ ''میاں عادل، ہم نے سنا آج آپ کا بڑا شاندار استقبال ہوا۔'' اس پر بلقیس

کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

میاں عادل کا چہرہ غصے اور شرم سے سرخ ہو گیا۔ انہوں نے لڑکوں کی بدتمیزی اور بیہودگی کی بڑی شکایت کی، جن کی نالائقیوں کی وجہ سے میاں عادل کو حیدر آباد کا مستقبل بہت تاریک معلوم ہو رہا تھا۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ اس کے الزامات پر سب مسکرا رہے ہیں اور کسی کو یقین نہیں آ رہا، میاں عادل بھی ہنسنے لگے اور اس نے وقت کے موجودہ ماحول کا ان کے حق میں تصفیہ کر دیا اور بات گئی گزری ہو گئی۔

بہر حال اب میاں عادل کو چچی سے یہ کہنا ٹھیک معلوم نہ ہوا کہ وہ بورڈنگ ہاؤس چھوڑنا چاہتے ہیں۔ یہ اعتراف شکست ہو گا اور وہ خانم چچی اور بلقیس دونوں کی نظر سے گر جائیں گے۔

(۴)

''نعیم کا کوئی خط آیا'' مختار عالم خاں نے چائے کی پیالی میں عزیز کمپنی کا ایک بسکٹ ڈال کے پوچھا۔

خانم نے کہا۔ ''ہاں! میرے نام آخری خط انہوں نے تین مہینے پہلے لکھا تھا اس کے بعد کوئی اور خط نہیں آیا۔''

داؤد نے کہا۔ ''ہاں اب تو بڑے آدمی ہو گئے۔ جب واپس آئیں گے اور کلکٹر بن کے پھریں گے تو ان کے پیروں کے نیچے ہندوستان کی زمین کانپے گی۔''

اس پر مختار عالم نے کہا۔ ''نہیں میرے خیال میں تو بڑی اچھی طبیعت کا لڑکا ہے۔''

بلقیس کی اوڑھنی ڈھلکی سی تھی۔ اس نے اسے سنبھال کے کہا۔ ''کیوں داؤد بھائی۔ ہندوستان کی زمین کیوں کانپے گی۔ سیولین ہو جانا بڑا کمال ہے کیا۔ میں لڑکا ہوتی تو میں بھی برابر سیولین ہو جاتی۔''

داؤد نے اس پر کہا۔ ''اب بھی کیا ہے۔ کسی سیولین سے شادی کر لو۔ بات وہی ہو گی۔ اور سول سروس کے امتحان کی تیاری کی زحمت سے بچی رہو گی۔''

اس پر بلقیس ذرا جھینپی، اور خانم زور زور سے ہنسنے لگی۔ داؤد مسکرایا اور عادل کا منہ سوکھ گیا۔

خانم نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''وہاں جا کے معلوم نہیں آدمی کن کن چیزوں میں پڑ جاتا ہے۔۔۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ وہ وہیں شادی کر لے گا۔''

بلقیس نے کہا۔ ''کون ان سے شادی کرے گی۔ کوئی اندھی ہوئی تو دوسری بات ہے۔''

اس پر ایک لمحہ کے لیے سب خاموش ہو گئے۔ چھ مہینے کے اندر حالات اس قدر بدل گئے۔ مختار عالم نے خانم کی طرف دیکھا۔ خانم کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔ داؤد شرارت سے مسکرا رہا تھا اور عادل کے چہرے پر ایک فاتحانہ اطمینان اور مسکراہٹ تھی۔

اور اس خاموشی کو سب سے پہلے عادل نے توڑا۔ ''مجھے میاں نعیم کا ایک لطیفہ کبھی نہیں بھولے گا۔ جب وہ ولایت جانے لگے تو اسٹیشن پر ٹکٹ لینے گئے۔ ٹکٹ بابو نے کہا، 'ویٹ پلیز' (براہ مہربانی ذرا ٹھہریئے) انہوں نے نے جواب دیا۔ ''ایک سو چالیس پونڈ''۔

اس پر سب کو ہنسی آ گئی۔ بلقیس ہنستے ہنستے لوٹ گئی۔ داؤد یہ کہنا چاہتا تھا کہ یہ لطیفہ اس نے آج سے سات سال پہلے اسٹرینڈ ویکلی یا پنچ میں پڑھا تھا۔ لیکن بلقیس کو اس طرح لطف اندوز ہوتے دیکھ کر وہ مسکرا کے خاموش ہو گیا۔ خانم تو مذاق کو سمجھ ہی نہ سکی تھیں۔

صرف افتخار عالم نے اتنا کہا۔ ''تم لوگ نعیم سے جلتے ہو۔''

لیکن نعیم کی قسمت پر مہر لگ چکی تھی۔

(۵)

اس واقعے کے آٹھ دن بعد کا ذکر ہے۔

عاقل خاں سونے کے لیے بستر پر دراز ہو چکے تھے۔ میاں بیوی دونوں کے پلنگ ملے ہوئے تھے۔ خانم ساڑی اتار کے بالوں میں سے پنیں نکال رہی تھیں۔ ویسٹ کوٹ اور پیٹی کوٹ میں ان کا گداز جسم عاقل خاں کو اب بھی بڑا خوبصورت معلوم ہو رہا تھا۔ عاقل خاں ان کی طرف اشتیاق اور عاشق کی نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ خانم نے پلٹ کے تکیے کے نیچے سے ایک خط نکالا اور اپنے میاں کو دیا۔ ''ذرا یہ پڑھو''۔

عاقل خاں نے دل ہی دل میں بڑبڑا کے تکیے کے نیچے سے عینک کی ڈبیا اٹھائی۔ اس میں سے عینک نکالی اور پڑھنا شروع کیا۔

''محترمہ چچی صاحبہ!

تسلیم عرض۔ آپ کی شکایت بالکل بجا ہے کہ میں نے آپ کو ایک عرصے سے خط نہیں لکھا۔ لیکن اس درمیان میں آپ کا بھی تو کوئی شفقت نامہ نہیں آیا۔ میں ان دنوں کام میں ذرا زیادہ مصروف رہا۔ یہ

ابتدائی زمانہ ہے اور ہر چیز نئی ہے۔ اب اگر آپ کا حکم ہو تو میں اور زیادہ پابندی سے خط لکھا کروں۔

مجھے آپ اور آپ سب کی عنایتیں بہت یاد آتی ہیں اور آپ کے اس خط سے مجھے یہ محسوس ہوا کہ آپ سب کی وجہ سے مجھے اپنے وطن سے کتنی گہری محبت ہے۔

مجھے یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ بلقیس اب جونیئر کیمبرج کی تیاری کر رہی ہے اور اس کے بڑے اچھے اچھے پیام آ رہے ہیں۔

پھر بھی مجھے بڑی مسرت ہوگی اگر میری واپسی تک بلقیس کی شادی ملتوی رہے۔ آخر مجھے بھی تو بلقیس کی شادی میں شرکت کا حق ہے۔

اس سلسلے میں آپ بلقیس کی رائے بھی لے لیجیے گا۔ عاقل چچا کو بہت بہت سلام۔

آپ کا خادم نعیم۔''

عاقل خاں نے کہا۔ ''اس خط میں تو کوئی خاص بات نہیں۔ اس نے مذاق میں لکھا ہے۔''

خانم نے جواب دیا۔ ''تم تو اچھے خاصے کوڑ مغز ہو۔ اس سے زیادہ صاف صاف وہ اور کیا لکھتا کہ وہ بلقیس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ ورنہ بلقیس کی رائے پوچھنے کو کیوں لکھتا۔''

''تو پھر۔ اچھا ہے نا؟''

''میں بلقیس سے اس کا ذکر کروں گی۔ مگر جانتی ہوں، عادل اور داؤد اسے نعیم کے خلاف بھڑکا رہے ہیں۔ پہلے تو وہ نعیم سے مانوس تھی مگر اب جب اس کا ذکر آتا ہے وہ بھی ان کے ساتھ اس کی ہنسی اڑاتی ہے۔''

''بچپن ہے۔ تم سمجھا دو۔''

''اور اس خط کا جواب؟''

''میں خود لکھ دوں گا۔''

دوسرے دن عاقل خاں نے اس مضمون کا خط نعیم کو لکھا۔

''عزیز و نور چشم، پارۂ جگر نعیم سلمہ اللہ تعالیٰ

خدا تمہیں عمر دراز اور مرتبہ بلندی عطا فرمائے اور اس کفرستان میں نیک ہدایت دے۔ تمہیں دختِ زر اور لحم خنزیر اور رتادریا سے محفوظ رکھے۔ کفر کی بستی میں تمہارے ایمان اور اسلام کو توانا اور

برقرار رکھے۔ آمین!

تمہارا نوشتہ مکتوب بنام تمہاری چچی کے موصول ہوا جو انہوں نے میری نظر سے بھی گزارا، جس کو دیکھ کے مجھے تمہاری ہوشیاری اور فراست کا یقین ہوا اور بڑی مسرت ہوئی۔

تم نے بلقیس کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اگر اس کا مطلب وہی ہے جو تمہاری چچی سمجھیں اور انہوں نے مجھے سمجھایا تو تم اطمینان رکھو اور مطالعہ کتب اور اپنے کام میں دل لگاؤ۔ خدا تمہیں ہر طرح کے شر اور لالچ سے محفوظ رکھے۔ خصوصاً میموں کے جال سے۔ ان کا جادو ایسا ظالم ہوتا ہے جیسے سحر بنگالہ جس کا ذکر کتابوں میں موجود ہے۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔

تمہارا چچا۔ عاقل خاں عفی عنہ''

(۶)

گرمیاں شروع ہو چکی تھیں۔ داؤد پھر رخصت لے کے آیا تھا اور عاقل خاں کے مکان کی چھت پر سو رہا تھا۔ چاندنی چاروں طرف چھٹکی ہوئی تھی۔

اس کے کان میں آواز آئی ''داؤد بھائی۔ داؤد بھائی!''

وہ چونک پڑا۔ بلقیس اس کے پلنگ کے پاس دو زانو بیٹھی تھی۔ گھنٹہ رات کے دو بجا رہا تھا۔ وہ آنکھیں ملنے لگا کہ کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہے۔ لیکن بلقیس نے جلدی سے کہا۔ ''داؤد بھائی معاف کیجیے گا۔ میں نے آپ کو اس وقت تکلیف دی مگر آپ جانتے ہیں مجھے آپ سے بات کرنے کی اجازت نہیں۔ اماں سمجھتی ہیں کہ آپ مجھ کو نعیم کے خلاف بھڑکا رہے ہیں۔ میں آپ سے مشورہ لینے آئی ہوں۔''

داؤد کی حیرت ابھی تک کم نہیں ہوئی تھی اور وہ چاندنی کا ناچ بلقیس کے ہلکے سنہرے بالوں میں دیکھ رہا تھا۔ بلقیس کی اوڑھنی سرک گئی تھی اور اس کی سانس پھول رہی تھی۔ اس لیے اس کے سینے کا اتار چڑھاؤ بڑا ستم خیز معلوم ہو رہا تھا۔

بلقیس نے پھر کہا۔ ''نعیم کے متعلق۔''

داؤد نے کہا۔ ''کیا؟''

(۷)

صبح کو عاقل خاں کے سامنے مقدمہ پیش ہوا مُردار چڑیل بلقیس نے خاندان کی عزت ڈبوئی تھی۔ رات

کے دو بجے اسے داؤد سے کیا کام تھا۔ خانم اب داؤد حرامزادے کو اپنے گھر میں قدم نہ رکھنے دیں گی۔

عادل نے اپنی آنکھوں سے دونوں کو ساتھ دیکھا۔

اور عاقل خاں ساری احتیاط بھول گئے۔ یہ بھی خیال نہ رہا کہ لڑکی بدنام ہو جائے گی۔ شیر کی طرح دھاڑ کے انہوں نے داؤد سے کہا۔ ''تو نے میری ناک کاٹ ڈالی۔''

داؤد کو ذرا غصہ نہ آیا تھا، وہ اس غیظ و غضب کے منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا اس نے کہا۔ ''چچا جان! آئینہ ملاحظہ فرمایئے آپ کی ناک اپنی جگہ محفوظ ہے۔ آپ کی عزت بھی محفوظ ہے۔ میں آپ کی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ بلقیس میری سگی بہن کی طرح ہے۔ میری شادی ہو چکی ہے۔ مجھے آپ کی صاحبزادی سے کیا دلچسپی؟''

خانم جو بلقیس کو برابر کوس رہی تھیں، پوچھنے لگیں۔ ''کم بخت چڑیل تو وہاں اُوپر کیا کر رہی تھی۔ رات کے دو بجے تو اپنے یار ہی کے پاس تو گئی تھی۔''

بلقیس زور زور سے روتی ہوئی رخصت ہوئی اور اپنے کمرے میں جا کے دروازہ بند کر لیا۔ داؤد نے سمجھانے کی آخری کوشش کی اور کہا۔ ''وہ مجھ سے مشورہ لینے آئی تھی کہ کس سے شادی کروں۔ میں نے مشورہ دیا کہ اگر تم نعیم سے شادی نہیں کرنا چاہتیں تو مت کرو مگر عادل سے ہرگز مت کرنا۔''

عادل جو اس ہنگامے کا اصلی بانی تھا، اب تک خاموش تھا، اب اس نے کہا۔ ''میں نے ان دونوں کو اکثر اکیلے میں کھسر پھسر کرتے دیکھا ہے، یہ پہلی بار نہیں تھی۔۔۔''

اب داؤد کا چہرہ تمتما اٹھا۔ ''جھوٹے، بدمعاش، کمینے! ذرا اپنی عینک تو اُتار'' یہ کہہ کر داؤد نے خانم کی چپل اُٹھائی۔ ''اتار عینک۔ میں نہیں چاہتا کہ جوتیانے میں تیری عینک ٹوٹے یا تیری آنکھیں پھوٹیں۔''

عاقل خاں بیچ میں آ گئے۔ داؤد رُک گیا۔ اس کے بعد عاقل خاں نے کہا۔ ''میاں داؤد! تم میری عزت کے لاگو ہوئے ہو۔ میری لڑکی بدنام ہو رہی ہے۔ تم میرا نہیں، خاندان ہی کی عزت کا خیال کرو اور میرے گھر مت آیا کرو۔''

داؤد نے کہا۔ ''جو آپ کے گھر قدم رکھے وہ کتا۔''

اپنا سامان باندھ کے وہ تعلقہ پر صدر مدرسی کرنے واپس چلا گیا اور اپنی بیوی کو میکے سے بلا بھیجا۔

(۸)

جب داؤد دوبارہ حیدر آباد آیا تو بجائے عاقل خاں کے یہاں ٹھہرنے کے، محبوب ہوٹل میں ٹھہرا۔ یہ دوسرے درجے کا ہوٹل تھا'' اور کمرے اور طعام کا خرچ تین روپے روز تھا۔ بلقیس اسکول سے اس کے آنے کی خبر سن کے اس سے ملنے آئی اور تقریباً دو گھنٹے تک دونوں میں باتیں ہوتی رہیں۔ ان دونوں کی دوستی اب مشورے کی حد سے گذر کے سچی ہمدردی کے مرتبے پر پہنچ چکی تھی اور بلقیس کو داؤد سے اتنا لگاؤ ہو گیا تھا کہ داؤد کی بیوی جلنے لگی تھیں۔ اس درمیان میں دونوں میں برابر خط و کتابت تھی۔

اس دن ہوٹل کی ملاقات کا علم عاقل خاں کو ہوا تو ان کی خانیت کو بڑا غصہ آیا۔ چھڑی لے کر انہوں نے بلقیس کی مرمت کی۔ اس نے بھی انگریزی تعلیم پائی تھی اور اب جونیر میں پڑھ رہی تھی۔ اپنے کمرے میں جا کے اس نے والد کو خط لکھا کہ آپ مجھے آوارہ سمجھتے ہیں تو میری زندگی سے کیا فائدہ۔ اس نے آیوڈکس میں شکر ملا کے چاٹ چاٹ کے آدھی شیشی کھالی اور اس کی حالت اتنی ابتر ہو گئی کہ چھ ڈاکٹروں نے بڑی محنت اور کوشش سے اس کی جان بچائی۔

اس واقعے کے بعد عاقل خاں کے سامنے بلقیس نے قرآن پر ہاتھ رکھ کے قسم کھائی کہ وہ اب داؤد سے کوئی سروکار نہ رکھے گی۔ داؤد نے قرآن پر ہاتھ رکھ کے اپنی بیوی کے سامنے قسم کھائی کہ وہ بلقیس کو اپنی سگی بہن سمجھتا ہے، ہاں بلقیس اگر کچھ اور محسوس کرتی ہو تو۔۔۔

عادل کو راتوں کو نیند نہیں آتی تھی۔ پھر بھی وہ لینڈی کتی کی طرح بلقیس کے ساتھ لگا رہتا، اسے کوئی تکلیف نہ ہونے دیتا۔ پڑھائی میں اس کی مدد کرتا۔ اپنا جیب خرچ اس کے لیے تحفے خریدنے میں صرف کر دیتا اور بلقیس جب اس سے ہنس کے بات کرتی تو اسے اپنی ساری کوشش کا انعام مل جاتا۔

اسی طرح کئی مہینے گذر گئے اور داؤد کے دور ہونے کی وجہ سے ماحول صاف ہوتا گیا۔ چھ ڈاکٹروں نے بلقیس کے علاج میں نہایت رازداری برتی تھی۔ اس لیے اس کی اقدام خودکشی کی داستان خاندان سے باہر نہ پھیل سکی اور یہ واقعات اتنے پرانے معلوم ہونے لگے جیسے گذشتہ صدی میں پیش آئے ہوں۔

پانچواں باب

گلِ سُرخ

پیرس میں گرمیوں کا موسم اور سہ پہر خصوصیت سے خوشنما تھی۔ بولوارساں مشیل میں بھی شہر کے دوسرے حصوں کی طرح ۱۴ر جولائی کو قومی عید کی خوشی میں ہر ریستوران سجا ہوا تھا۔ باہر کرسیاں پڑی تھیں۔ کچھ لوگ ابھی سے آ آ کے بیٹھ رہے تھے اور شراب پی پی کے زور زور سے کاندھے ہلا رہے تھے۔ نعیم کو فرانسیسیوں کے شانے ہلانے کی ادا شروع سے بہت پسند تھی۔

۱۴ر جولائی کا دن انقلاب فرانس کی یادگار کی عید ہے۔ نعیم اور ہروشا دونوں گرما کی تعطیلات بسر کرنے اور فرانسیسی سیکھنے آئے ہوئے تھے۔ دن بھر پھرتے رہے تھے۔ صبح کو دونوں نے پلاس دے کون کارو پر فوجی پریڈ دیکھی تھی۔ دوپہر کو دونوں باستیل گئے جہاں وہ مشہور معروف قید خانہ تھا جس کے افسانے فرانسیسی ناولوں میں پڑھنے سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ انقلاب فرانس میں اسی قید خانے کو ڈھایا گیا اور اب اس کی جگہ ایک چھوٹا سا مینار تھا۔ باستیل کے میدان میں مزدوروں اور انقلاب پسند تحریکوں سے ہمدردی رکھنے والوں کے جلوس نکل رہے تھے اور یہیں نعیم نے "گلِ سُرخ" کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔

"گلِ سُرخ" گھونگھر والے بال والے سفید وزریں بالوں والی انگریز لڑکی تھی۔ اس کے والد وسط انگلستان کی ایک مشہور یونی ورسٹی میں علمِ ہیئت کے پروفیسر تھے اور اپنے فن کے بہت بڑے ماہر سمجھے

جاتے تھے۔ "گلِ سُرخ" کا نام میری پاول تھا۔ لیکن انگلستان اور فرانس کے انقلاب پسند طلباء کے حلقوں میں وہ "گلِ سُرخ" کے نام سے مشہور تھی۔ اس سے زیادہ حسین لڑکیاں جامعۂ پیرس جیسی حُسن پرور یونی ورسٹی میں بہت کم تھیں۔ لندن میں جب وہ سڑکوں پر چلتی تو راہ گیر اسے پلٹ پلٹ کے دیکھتے۔ اس صوری دلکشی کے ساتھ ساتھ اس کی سادگی اور خود اعتمادی کی وجہ سے جو اس سے ملتا متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ غرض گلِ سُرخ سے طالب علموں کی دنیا بہت اچھی طرح واقف تھی۔

باستیل کے جلوس دیکھ چکنے کے بعد ہُروشا اور نعیم دونوں بلوارساں مشیل واپس آئے۔ بہت سی دوکانیں بند تھیں مگر قہوہ خانے (کیفے) سب کے سب کھلے ہوئے تھے۔ دونوں میں بحث ہوئی کہ کہاں چلیں۔ ہُروشا نے "وارکور" کا نام تجویز کیا لیکن نعیم نے اعتراض کیا کہ سرہارکوٹ بٹلر ہندوستان میں گورنر رہ چکا ہے اور اس کیفے کا نام اس کی یاد دلاتا ہے۔ آخر تصفیہ ہوا کہ "لاسورس" جائیں۔ وہ دونوں وہاں پہنچے۔ فرانسیسی اور چرکس، مصری اور ہندچینی سب ہی طرح کے لوگ وہاں تھے۔ رنڈیوں کے آنے کا وقت آ گیا تھا۔ ہروشا نے کہا، "یہ عجیب بات ہے جہاں طالب علموں کی آبادی ہوتی ہے، وہاں رنڈیاں بھی آبستی ہیں۔" غرض لاسور کی سُرخ نشستیں بھری ہوئی تھیں اور گلاسوں اور ظروف اور باتوں کی آوازوں سے بڑی رونق معلوم ہو رہی تھی اور نعیم بہت خوش تھا۔

(۲)

مگر ہم نے اب تک آپ سے ہروشا کا تعارف نہیں کرایا۔ یہ نوجوان چیکوسلواکیہ کا رہنے والا تھا۔ اس کے والد پراگ کے علمی حلقوں میں کافی مشہور تھے۔ انہوں نے یورپ کی کئی زبانوں سے ادبیات عالیہ کا چیک زبان میں ترجمہ کیا تھا اور پریسیڈنٹ میسیرک کی سوانح عمری لکھی تھی۔ اپنے بیٹے زیدنک ہروشا کے متعلق انہوں نے یہ تصفیہ کیا تھا کہ وہ اخبار نویسی کرے مگر وہ اتنا ذہین تھا کہ حکومت نے بہت جلد اخبارات میں اس کے مضامین کی طرف توجہ کی۔ چیکوسلواکیہ کے وزیرِ خارجہ جو اس کے والد کے دوست تھے اس پر رضامند ہو گئے کہ اگر ہروشا چند سال یورپ کے دوسرے ملکوں میں گذار کے وہاں کی سیاست کا مطالعہ کرے اور وہاں کی زبانیں سیکھے تو دفتر وزارتِ خارجہ میں اسے کوئی اچھی خدمت دے دی جائے اور اسی سلسلے میں ۱۹۳۴ء سے اب تک ہروشا جرمنی، رُوس، انگلستان اور اب فرانس میں

تھوڑے تھوڑے مہینے گذار رہا تھا۔

نعیم سے اس کی ملاقات آکسفورڈ ہی میں ہوئی۔ ان دونوں کا ایک مشترک دوست تھا۔ کارلووچ یوگوسلاویہ کا رہنے والا تھا اور بے حد زندہ دل تھا۔ ابتدا میں ہروشا اور نعیم کو ایک دوسرے سے خاص مناسبت معلوم نہ ہوئی۔ لیکن کارلووچ کی ظرافت سے دونوں کو دلچسپی تھی۔ تینوں ساتھ ساتھ پھرا کرتے۔ جب کارلووچ اپنے وطن واپس چلا گیا تو ہروشا اور نعیم اچھے خاصے دوست بن چکے تھے۔

لاسورس سے نکل کے وہ زمین دوز ریل (میٹرو) کے اسٹیشن کی طرف چلے۔ سڑک کے کنارے پیدل چلنے کی روش پر چھوٹی چھوٹی دوکانیں دیکھتے ہوئے۔ ان دوکانوں کی وجہ سے پیرس میں غیر معمولی مشرقیت پیدا ہوگئی ہے۔ روش پر ایک اژدہام سا تھا۔ کچھ لوگ دوکانوں کے سامنے کھڑے ہوتے اور تھوڑی دیر کے بعد چل دیتے۔ نعیم مقابل سے آنے والوں کے چہرے دیکھ رہا تھا۔ ہاتھ ہلا ہلا کے باتیں کرتے ہوئے فرانسیسی اور فرانسیسیوں سے تعداد میں کہیں زیادہ اجنبی۔ بلوار سان مشیل بلکہ پورے کوارتیے لاتاں کی آبادی کا بڑا حصہ اجنبیوں پر مشتمل تھا۔ نعیم کو یاد آگیا کہ یونی ورسٹی میں ترجمے کی کلاس میں نوجوان اُستانی نے لال بالوں والے اسکاچستانی بلند بالا طالب علم سے آنکھ لڑا کے اور مسکرا کے کہا تھا۔ ''مگر موسیو، کوارتیے لاتاں سے آپ فرانسیسی یا پیرس کے تمدن کا اندازہ کریں گے تو غلطی کریں گے۔ کیونکہ یہاں بالعموم اجنبی بستے ہیں۔ جن کی زندگی ہم کو بھی اتنی انوکھی معلوم ہوتی ہے۔ جتنی آپ برطانویوں کو۔''

سامنے سے ایک نوجوان سوکھی سی عورت گذری جس کے بال خشک اور گھونگھرالے تھے۔ نعیم اس کو لاسورس میں بیٹھے بیٹھے تین چار بار سڑک پر اِدھر اُدھر سے اِدھر گذرتے دیکھ چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ رنڈی نہیں ہے۔ کیونکہ ایک بار نعیم کو وہ ''کوپول'' میں ملی تھی۔ اس نے خود ہی ''کماں'' کہہ کے نعیم کو مخاطب کیا تھا۔ نعیم اسے سینما لے گیا اور جب اس کے لیے بھی ٹکٹ خریدنے لگا تو اسے تعجب ہوا۔ سینما میں نعیم نے دست درازی کی تو وہ اسے ٹکٹ کی قیمت سمجھ کے خاموش رہی اور باہر نکل کے اس نے نعیم کو بتایا تھا کہ وہ پناہ گزین یہودن ہے اور بریسلاؤ کی رہنے والی ہے۔ اس نے پھر ملنے کا وعدہ کیا تھا اور نہیں ملی۔۔۔

اتنے میں میترو کا اسٹیشن آگیا اور دونوں دوست نیچے اترے۔ میترو کے اسٹیشن ان دنوں تو قابل

برداشت تھے مگر جاڑوں میں ان کو دیکھ کے نعیم کو متلی ہوتی تھی۔ انگلستان کی زیرِ زمین ریلوے کتنی تیز ہے۔ اسٹیشن کتنے صاف ہیں، ہر چیز کتنی خوبصورت، کتنی باقاعدہ ہے۔

چنانچہ زمین دوز ریل میں سوار ہوتے ہی نعیم نے دفعتاً ہروشا سے کہا۔ ''اگر اب کے جنگ ہوئی تو مجھے فرانس کا حشر کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ کسی چیز میں تیزی نہیں، پھرتی نہیں، تنظیم نہیں، باقاعدگی نہیں۔''

ہروشا پائپ پی رہا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی نیلی نیلی آنکھیں، اس کے سپاٹ کھوپڑی پر جمے ہوئے سیاہ بال اور اس کے سُرخ ہونٹ ہمیشہ مطمئن معلوم ہوتے تھے۔ لیکن اس غیر متوقع اظہار خیال پر وہ چونک پڑا۔ فرانس اور چیکوسلواکیہ میں باہمی معاونت کا معاہدہ تھا۔ اس قسم کی تنقید اسے اچھی نہیں معلوم ہوئی۔ اس نے فرانسیسی فوج اور فرانسیسیوں کی شجاعت کی تعریف کی۔ ''فرانسیسیوں میں توازن ہے۔ یہ چیز بہت کم یورپی قوموں میں ہے۔ ذرا وقت آنے دو، پھر دیکھنا وہ کیسے لڑتے ہیں۔''

یہ کہہ کے اس نے پائپ کا ایک کش لیا۔

اور نعیم سوچنے لگا۔ جوش ملیح آبادی کی ایک نظم اس نے کئی سال پہلے پڑھی تھی۔ فرانسیسیوں کے متعلق اس کا ایک مصرعہ اسے یاد آیا

مری راتیں نگاروں میں، مرے دن کارخانوں میں

مگر یہ بھی غلط تھا۔ نگار خانوں کے سرپرست اجنبی ہی تھے۔ فرانسیسی بہت کم پیرس کی عشرت گاہوں میں جاتے ہیں۔ خاندانی زندگی میں یہاں اتنی روک ٹوک اور اتنا ٹھہراؤ ہے کہ انگلستان میں نہیں۔ متوسط طبقے میں لڑکیوں پر پابندیاں بہت ہیں۔ یہ سب ہے پھر بھی۔ پھر بھی نہ شاں دے مارس کے قریب فرانسیسی فوجوں کی پریڈ دیکھ کر، نہ آج صبح پلاس دے کونکارد میں فرانس کی فوجی طاقت کا مظاہرہ دیکھ کے اسے اطمینان ہوا تھا۔ 'اطمینان' اس لیے کہ اسے فرانس سے محبت معلوم ہوتی تھی۔ ایک فرانسیسی فلم میں اس نے جملہ سنا تھا اور اسے سچ پایا تھا کہ ہر شخص کے دو وطن ہوتے ہیں۔ ایک اس کا اپنا وطن اور دوسرا فرانس۔

زیرِ زمین ریل کا یہ ڈبا چھوٹا سا تھا۔ تمام نشستیں بھری ہوئی تھیں اور اس لیے ہروشا اور نعیم بیچ میں کھمبے کے پاس کھڑے ہوئے تھے۔ قریب ہی ایک حبشی، بہت باتکلف کپڑے پہنے اخبار

''کانڈیڈ'' پڑھ رہا تھا۔ ایک نشست پر ایک مزدور ایک نوجوان لڑکی کا بوسہ لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ نخرے کر رہی تھی اور آس پاس کے نشستوں پر لوگ ہنس رہے تھے۔

یکے بعد دیگرے زیر زمین ریلوے کے غیر دلچسپ اسٹیشن گذرتے گئے ان کے درمیان ریل کی سُرنگ کی دیوار پر نعیم ''لا ایبل ژاردی نیر'' کا اشتہار پڑھتے پڑھتے اکتا گیا۔ ہروشا نے کچھ کہا مگر اس نے نہ سننے کی پروا کی اور نہ سمجھنے کی۔ ہروشا نعیم کی اس عادت سے بخوبی واقف تھا۔ وہ اپنے پائپ میں مصروف رہا۔ یہاں تک کہ دونوں ریل سے اترے اور پاس دے نو فلو روانہ ہوئے۔ جہاں بارہ ہزار مزدوروں کے مجمع کو فرانس کا اشتمالی لیڈر موسیو تھورے خطاب کرنے والا تھا۔

ہروشا اس مجمع کے تمام خصائص سے اچھی طرح واقف تھا۔ بیچ میں خالی زمین تھی اور اس کے سرے پر اسٹیج تھا۔ اطراف میں ایک تین چوتھائی دائرے کی شکل، یا گھوڑے کی نعل کی شکل کا ایمفی تھیٹر تھا جو لکڑیوں کے تختوں سے بنایا گیا تھا۔ اسٹیج کے پاس دوسری صف میں ہروشا نے نعیم کو کسی نہ کسی طرح لا بٹھایا۔ پورا ایمفی تھیٹر کھچا کھچ بھرا تھا۔ بیچ زمین پر مٹھیاں تانے ہوئے کچھ نرسیں ایک جلوس بنا کے آئیں۔ پورے مجمع سے ''لے سوویے پارتو'' کی آوازیں بلند ہوئیں۔ دوسرے انقلابی نعرے بلند ہوئے۔ نرسیں اپنی اپنی جگہ گئیں۔ زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اتنے میں تھورے کی تقریر شروع ہوئی اور مقابلتاً خاموشی چھا گئی۔

نعیم ہمیشہ تقریر سنتے سنتے بیچ بیچ میں غائب ہو جایا کرتا تھا۔ اس کا دماغ اور کسی طرف مصروف ہو جاتا تھا اس مرتبہ بھی دس بارہ منٹ تک تقریر سننے کے بعد اس کی نظریں پھر سے مجمع کا جائزہ لینے لگیں۔ اس کے بائیں ہاتھ پر ہروشا بیٹھا تھا اور اب اس نے اچھی طرح محسوس کیا کہ اس کی داہنی ٹانگ سے چوبیس پچیس سال کی ایک گداز جسم کی عورت کی ٹانگ برابر مس کر رہی تھی۔ یہ عورت موٹا بھدا فرانسیسی سانڈوچ کھا رہی تھی اور تھورے کی تقریر سن رہی تھی۔ نعیم نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ دوہری ٹھڈی تھی۔ لبوں پر سُرخی نہ تھی۔ اس کے پاس ہی ایک بچہ تھا۔ ایک جوان آدمی تھا، پھر ایک چھوٹی لڑکی تھی اور پھر ایک بڈھا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ سب ایک خاندان کے ہیں۔ بہت جلد اس خیال کی تصدیق ہو گئی۔ عورت نے کاغذ کا ایک بڑا سا لفافہ آگے بڑھایا۔ جوان نے انکار سے سر ہلایا مگر بوڑھے نے ایک سانڈوچ نکال کے کھانا شروع کر دیا۔ نعیم ان لوگوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ دیکھ کے اس کی

ہمسایہ عورت نے ''موسیو'' کہہ کے سانڈوچوں کا لفافہ اس کے آگے بڑھایا اور مسکرائی۔ نعیم سے کچھ اور نہ بن پڑا۔ اس نے ایک سانڈوچ نکال کے ''مرسی بوکو مدام'' کہا۔ فرانسیسی سانڈوچوں سے اسے سخت نفرت تھی۔ لیلیٰ کی بانہوں کی اتنی موٹی موٹی روٹیاں اور ان کے بیچ میں گوشت کے ٹکے۔ اس قسم کے سانڈوچ مربھکوں ہی کے لیے بنائے گئے ہوں گے۔ وہ سانڈوچ لینے سے انکار کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس نے لے کیوں لیا؟ اسے تعجب ہوا کہ اکثر ایسا ہوا ہے کہ اس نے وہ کیا جو اس کی خواہش کے بالکل برعکس تھا اور تھورے کی تقریر سے بے توجہ ہو کے اس نے اپنا نفسیاتی تجزیہ شروع کیا۔ غالباً سانڈوچ لے لینے کی نامحسوس خواہش اس لیے پیدا ہوئی کہ اس طرح اس عورت سے بات چیت کرنے کا موقع ملے گا یا کم سے کم اس سے نامحسوس ربط اور تعلق بڑھ جائے گا۔ اس کی ران تو نعیم کی ران سے مس کر رہی تھی اور اگر وہ سانڈوچ لینے سے انکار کر دیتا تو اس عورت سے ایک طرح کا نفسیاتی بُعد پیدا ہو جاتا۔

پھر اس نے مزدوروں اور اشتمالیوں کے لیڈر کی تقریر کی طرف توجہ دی جو فرانس اور سوویٹ روس کے باہمی جنگی پیمان تعاون کو تفصیل سے سمجھا رہا تھا اور بڑے زور شور سے اس کی تائید کر رہا تھا۔

بالآخر اس کی تقریر ختم ہوئی۔ تالیوں کی گونج کے بعد انقلابی نعرے ایمفی تھیٹر کے ایک سرے سے بلند ہونا شروع ہوئے اور دوسرے سرے تک بلند ہوتے گئے۔ اس کے بعد تھورے کی آواز پھر گونجی۔ ''اب میں اشتمالیوں کی محبوبہ گُلِ سُرخ مس میری پاول سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ انگلستان کی انقلابی تحریک پر تقریر فرمائیں۔''

بیچ بیچ میں جب نعیم کا ضمیر اسے ملامت کرتا اور وہ غور سے ''گُلِ سُرخ'' کی تقریر سننے لگتا تو اسے معلوم ہوتا کہ تقریر میں کوئی نئی بات نہیں۔ کوئی ایسی بات نہیں، کوئی نئی بات نہیں جو اسے معلوم نہ ہو۔ تقریر کرنے والی کے پاس سادگی اور حسن کے سوا کوئی حربہ بھی نہیں تھا۔ مگر سامعین کو دم بخود رکھنے کے لیے یہی دو حربے بہت کافی تھے۔ نعیم کی توجہ بار بار ہٹ جاتی۔ وہ تیز روشنی میں میری پاول کے چمکتے ہوئے سنہرے بالوں کو دیکھ رہا تھا اور یہ دیکھ رہا تھا کہ جب وہ تقریر کرتے کرتے اوپر سر اٹھاتی تو روشنی جادو بن کے اس کے چہرے کے بھولے پن پر دوڑ جاتی۔

اس تقریر کے بعد اور بھی تقریریں ہوئیں۔ آخر میں ایک اشتراکی انجمن کی عورتیں سنگت میں ناچیں۔ ان کی برہنہ ٹانگیں اور رانیں اشتمالیت کی تبلیغ کرنے والوں اور اسٹالن کے پیروؤں کے اس

جلسے میں بھی اس طرح بلند ہو رہی تھیں جیسے ان کی بہنوں کی ٹانگیں پیرس یا نیویارک کے کسی ایسے نائٹ کلب میں جہاں وہ لکھ پتیوں کا شکار کھیلتی ہیں۔ ان کی ٹانگیں سر کے قریب بلند ہوتیں اور پھر روشنی میں جگمگاتی ہوئی فرش تک واپس آتیں۔ ہلکے سفید کپڑوں کے نیچے ان کی چھاتیاں تھرک رہی تھیں اور ان کے جسم کی اُچھل کود سے ان کے بال ہوا میں بلند ہوتے اور پھر سر اور شانوں پر گرتے تھے۔

اس کے بعد جلسہ ختم ہوا، انقلابی نعرے لگائے گئے اور فرانس کے مزدور گھروں کو واپس جانے لگے۔ وہ چھوٹا سا تعلیم یافتہ گروہ جس نے انہیں یہاں جمع کیا تھا اور جس میں مارکس، اینگلز اور لینن پیدا ہوئے تھے، دیر تک ٹھہرا رہا۔ کیونکہ متوسط طبقے کے یہ روشن خیال افراد، کچھ ہی کیوں نہ ہوں، کچھ معاشرتی ذمہ داریاں بھی تو رکھتے ہیں۔ چنانچہ اس طبقے کے لوگ ایک دوسرے سے ملنے اور باتیں کرنے لگے۔ کچھ تقریروں پر تبصرہ کر رہے تھے۔ کچھ تقریروں کے موضوع پر اور کچھ جلسے کی کامیابی پر، اور انہی لوگوں کے پاس سے ہوتے ہوئے ہروشا اور نعیم اسٹیج کی جانب بڑھے جہاں میری پاول اب تک کامریڈ تھورے سے باتیں کرتی نظر آ رہی تھی۔

لیکن فاصلہ کافی تھا۔ قبل اس کے کہ یہ لوگ وہاں پہنچ سکیں، وہ دونوں مجمع میں غائب ہو گئے۔ ہروشا نے کہا۔ "خیر آج میں اس سے نہیں مل سکا تو پھر کبھی سہی۔"

(۳)

وہاں سے یہ دونوں پھر بولوارساں مشیل واپس آئے۔ اب ان کے سامنے تین تجویزیں تھیں۔ یا تو اپنے چھوٹے سے ہوٹل میں جا کے سو رہیں یا قریب ترین نائٹ کلب میں تھوڑی دیر ناچیں یا پھر لاسورس میں کوئی "اے پے رے تیف" یا کافی پئیں۔ اوّل الذکر تجویز کی نعیم نے مخالفت کی۔ دوسری کی ہروشا نے اور پھر دونوں لاسورس پہنچے۔ یہاں مجمع چھٹ چکا تھا۔ جو رنڈیاں شام کو آئیں تھیں، ان میں سے ایک دو شکار کھیلنے کو پھر سے آ بیٹھی تھیں۔ تین چار ہندوستانی طالب علموں کا ایک گروہ بڑی محویت سے باتیں کر رہا تھا اور ان کے درمیان ایک لڑکی بیٹھی تھی جو بظاہر یورپین معلوم ہوتی تھی۔

ان ہندوستانی طالب علموں نے ایک لمحے کے لیے ہروشا اور نعیم کو دیکھا۔ پھر اپنی باتوں میں لگ گئے۔ ان میں سے ہر ایک کے سامنے گلاسوں میں مختلف قسم کی شرابیں رکھی تھیں۔ نعیم سوچنے لگا۔ کاش

اسے ان سب کا نام یاد ہوتا۔ اس نے ہروشا سے کہا کہ بھوک لگ رہی ہے اور کچھ اُبالے ہوئے انڈے منگائے اور ساتھ ہی اسکاچ وسکی اور سوڈا۔ پھر سگریٹ جلا کے ہروشا کی طرف دیکھنے اور مقابل کی میز پر اپنے ہندوستانی ہم وطنوں کی باتیں سُننے لگا۔

ان میں سے ایک کہہ رہا تھا۔۔۔ "میں نے جواہر لال سے یہ کہا تھا۔" پنڈت جی یہ تو فرمایئے کہ آپ اپنے ملک میں جو لڑائی لڑ رہے ہیں وہ ہندوستانی سرمائے اور برطانوی سرمائے کی لڑائی ہے یا ہندوستانی مزدور اور برطانوی سرمایہ داری۔۔۔؟"

ایک نوجوان جو ان سب میں خوش پوش تھا اور خدوخال سے راجپوت معلوم ہوتا تھا، جس کی آنکھیں بڑی بڑی اور رنگ سانولا تھا، کہنے لگا۔ "اس مرتبہ اسپین میں میں نے دیکھا، تمام کلیساؤں کی دیواروں پر ہتھوڑے اور درانتی کے نشان بنے ہوئے تھے۔ غالباً لینن نے یہ کہا بھی تھا کہ روس کے بعد سب سے پہلے اسپین میں انقلاب آئے گا۔"

وہ یورپین لڑکی جو ان لوگوں کے ساتھ تھی، اس اردو تقریر میں اسپین اور لینن کا ذکر سن کر ذرا چونکی تو پہلے طالب علم نے فرانسیسی میں کہا:

"حلیمہ خانم! راج کمار اپنے اسپین کے سفر کا ذکر کر رہے ہیں۔" اور اس کے بعد راج کمار پکے اشتمالی کی طرح اسپین کے انقلاب پسندوں کے کارنامے سنانے لگا۔

ان میں سے تیسرا جو اب تک خاموش تھا پہلے سے کہنے لگا۔ "شجاعت کچھ اور پیو گے؟" پھر اس نے آواز دی۔ "گارسو" اور خادم آ گیا۔

شجاعت نے کہا۔ "اعجاز صاحب آپ کا سر ٹھنڈا ہو رہا ہوگا۔ اب وقت کیا ہے؟"

اعجاز نے کہا۔ "بارہ بج کے پچیس۔ شجاعت! جواہر لال کے متعلق تم نے جو کہا۔۔۔"

شجاعت نے پہلے تو ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا جس کی وجہ سے حلیمہ خانم اور راج کمار کی گفتگو منقطع ہو گئی۔ یہ دیکھ کر کہ وہ اس کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں اس نے کہا۔ "اعجاز صاحب آپ نے سوائے اپنی کتابوں کے دیباچے کے اور بھی کچھ پڑھا ہے؟"

اعجاز صاحب جو سیاہ، چیچک رُو اور بدشکل تھے، کہنے لگے۔ "مجھے اس میں شک ہے کہ آپ نے اتنا بھی پڑھا ہو۔"

شجاعت نے کہا۔ ''آپ ضرورت سے زیادہ پی گئے ہیں۔''

راجکمار نے کہا۔ ''جانے بھی دو۔''

اتنے میں شراب آئی اور چاروں پھر چہکنے لگے۔ ہروشا نے نیند کی شکایت کی۔ نعیم نے آہستہ سے کہا۔ ''میں اپنے دلچسپ ہم وطنوں سے ملنا چاہتا ہوں۔ تم جاؤ۔ شب بخیر!''

ہروشا کے جانے کے بعد نعیم نے پھر سننا شروع کیا۔ شجاعت کہہ رہا تھا۔ ''گاندھی جی کے آشرم میں جا کے مجھے تیسرا روز تھا کہ ولبھ بھائی پٹیل سیوا گرام تشریف لائے۔ میں نے ان دونوں سے کہا کہ آپ کی تحریک ڈاکوؤں کی تحریک ہے جو دوسرے ڈاکوؤں کو لوٹنا چاہتے ہیں۔ مجھے یہ بتایئے کہ ہندوستانی کسان یا مزدور کا آقا گورے کے بجائے کالا ہو جائے تو کیا اس کا پیٹ بھر سکے گا؟ ۔ ۔ ۔ ۔''

شجاعت رُک گیا کیونکہ اس اثنا میں نعیم اُٹھ کے ان لوگوں کے پاس جا کھڑا ہوا۔ وہ لوگ اس کی طرف کسی قدر استفہام اور کسی قدر تعجب سے دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ نعیم نے اپنا تعارف کرایا۔ ''معاف کیجئے کہ میں نے مخل ہونے کی جرأت کی مگر آپ کی گفتگو اتنی دلچسپ ہے کہ مجھ سے رہا نہ گیا۔ میرا نام نعیم حسن ہے۔''

''آپ سے غیبی تعارف ضرور ہے۔'' شجاعت نے کہا۔ ''آپ آئی۔ سی۔ ایس کے مقابلے کے لیے آئے ہیں۔ ۔ ۔ میرا نام شجاعت علی خاں ہے۔ میں بھی حیدر آباد کا رہنے والا ہوں۔ میرے والد شبیر جنگ تھے۔ آپ راج کمار رام سنگھ ریاست ۔ ۔ ۔ کے ولی عہد ہیں اور آپ نواب اعجاز علی خاں ۔ ۔ ۔ آپ کے بھائی ریاست ۔ ۔ ۔ کے والی ہیں۔ ۔ ۔ حلیمہ خانم۔ آپ البانیہ کی رہنے والی ہیں۔''

''ہم سب کو آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔'' یہ کہہ کے پھر سب بیٹھ گئے اعجاز نے پوچھا۔ ''نعیم صاحب آپ کیا پئیں گے؟''

یہ سب کے سب اسی اشتمالی جلسے سے واپس آئے ہوئے تھے جس میں نعیم اور ہروشا نے بھی شرکت کی تھی اور بہت جلد آپس میں فرانس کی سیاسیات پر بحث ہونے لگی۔ شجاعت کو اس کی توقع تھی کہ اشتراکی اور اشتمالی عناصر فرانس میں اتنی ترقی کر لیں گے کہ بلا کشت وخون آسانی سے انقلاب آجائے گا۔ یہ دوسرا انقلاب فرانس ہوگا اور فرانس میں اشتمالی حکومت کے قائم ہو جانے کے بعد یورپ میں اشتمالیت کا پھیلنا یقینی ہے۔ روس اور فرانس کے درمیان جرمنی سانڈوچ کے گوشت کی طرح دب بھی

جائے گا۔

لیکن اعجاز کو اس طرز خیال سے بنیادی اختلاف تھا۔ اشتراکیت ہی اشتمالیت کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ جرمنی میں کیا ہوا؟ انگلستان کی مزدور جماعت کا کیا حال ہے؟ نہیں فرانس کی سیاسیات کا یہ رجحان ہی غلط ہے۔ اشتمالیت اگر اشتراکیت کے ساتھ مل کر ایک متحدہ محاذ بنا رہی ہے تو یہ محاذ رفتہ رفتہ رجعت پسند ہوتا جائے گا۔ اشتراکیت ہمیشہ سرمایہ دارانہ زور کے سامنے سر جھکاتی ہے۔ اس کا انجام کچھ اچھا نہ ہوگا۔

راج کمار صاحب بھی بیچ بیچ میں اسپین کے حالات کا ذکر کر دیتے۔ اتنے میں شجاعت نے نعیم سے پوچھا۔ ''آپ کا کیا خیال ہے؟''

نعیم اس سوال پر ذرا لاجواب سا ہو گیا۔ ''سیاسیات میں مَیں صرف ایک ناظر کی حیثیت سے دلچسپی لیتا ہوں۔ مجھے سرکاری ملازمت کرنی ہے۔ آپ سب حضرات امراء کے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کو مزدوروں کی تحریک سے اس قدر دلچسپی ہے اور آپ نے اتنی معلومات حاصل کی ہیں کہ مجھے آپ کے سامنے کچھ کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔''

اس پر تینوں میزبان خوشی اور شفقت سے مسکرائے اور راجکمار نے اعتذاراً اور انکساراً کچھ کہا مگر شجاعت کی بلند آواز سے ان کا شکریہ دب گیا۔ شجاعت نے کہا ''نعیم صاحب آج اعجاز نے ہندوستانی کھانا تیار کرایا ہے۔ ہم سب وہاں پر کھانے جا رہے ہیں۔'' حلیمہ کا بازو پکڑ کے اس نے کہا۔ ''مدموزیل حلیمہ بھی چل رہی ہیں۔ اگر آپ کو کوئی خاص کام نہ ہو تو ہمارے ساتھ چلیے۔''

نعیم بہت بہت شکریہ ادا کر کے ان کے ساتھ ہولیا۔ شجاعت نے ایک ٹیکسی والے کو آواز دی۔ سب کسی نہ کسی طرح اسی ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ حلیمہ شجاعت کی گود میں بیٹھی۔ تھوڑی دیر کے بعد ریو ساں دینی میں ایک خوبصورت بلاک کے سامنے سب اترے اور اعجاز کے فلیٹ میں پہنچے۔ ڈرائنگ روم میں کرومیم کا اعلیٰ درجے کا فرنیچر تھا۔ کونے پر ایک میز پر کارل مارکس کی بڑی سی تصویر چاندی کے چوکھٹے میں لگی ہوئی تھی۔

اعجاز نے وہ تصویر دکھا کر کہا۔ ''یہ وہ مورتی ہے جس کی ہم صبح و شام پوجا کرتے ہیں۔'' پھر کھانا ہوا۔ حلیمہ راج کمار سے باتیں کر رہی تھی کہ اتنے میں راج کمار نے بڑے ادب سے جھک کے

معافی چاہی اور دروازہ کھول کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

شجاعت نے تھوڑی دیر کے بعد آ کے حلیمہ سے کہا۔ "رام سنگھ بہت زیادہ پی گیا تھا۔ بستر پر قریب قریب بیہوش پڑا ہے۔" تھوڑی دیر کے بعد دوسرے باتھ روم سے اعجاز کے قے کرنے کی آواز آئی۔ شجاعت نے جلدی سے یونانی اور ہندو علم الاصنام کا مقابلہ شروع کیا "زیس اور دیوز یہ دونوں لفظ ایک ہی اصل سے نکلے ہیں۔۔۔" نعیم نے دیکھا کہ حلیمہ شجاعت کی طرف دیکھ رہی ہے اور اس کی آنکھیں چمک رہی ہیں۔ گویا شجاعت کی آنکھوں سے بغل گیر ہونا چاہتی ہیں۔ جس کی غالباً ان کو عادت ہے۔ یہ دیکھ کے اس نے بھی معافی چاہی۔

"آپ کو ٹیکسی کہیں قریب ہی مل جائے گی۔ یا آپ کہیے تو میں آپ کو ٹیکسی تک چھوڑ آؤں" شجاعت نے کہا۔

نعیم نے بہت بہت شکریہ ادا کیا اور کہا اس کی ضرورت نہیں۔

اس نے دیکھا کہ حلیمہ کا ہاتھ شجاعت کے ہاتھ میں تھا۔

شجاعت نے مسکرا کے اس سے کہا۔ "یہ تو بتایئے پھر کب ملئے گا۔ آپ سے مل کے بڑی خوشی ہوئی۔ آپ لوگ زیادہ تر سوربن جاتے ہیں؟ مجھے سوربن زیادہ پسند نہیں۔ ہم لوگ ڈوپاں میں بیٹھا کرتے ہیں۔۔۔ قریب قریب روزانہ پانچ بجے کے بعد۔ وہاں کسی روز آیئے یا پھر یہیں۔"

نعیم نے پھر شکریہ ادا کیا۔ حلیمہ نے مسکرا کے شب بخیر کہا اور نعیم لفٹ ہی میں ان اشتمالیت پسند ہندوستانی امیر زادوں پر تبصرہ کر رہا تھا اور طنز سے مسکرانے لگا تھا۔ بجز ٹیکسی کے، اور کسی سواری کی امید نہ تھی۔

جب وہ سونے کو لیٹا تو پاس کے کمرے سے ہروشا کے خراٹوں کی آواز آ رہی تھی۔ کپڑے اتارتے ہوئے اس نے شام کے واقعات پر تبصرہ کیا۔ گلِ سُرخ۔ میری پاول کتنا معمولی نام ہے۔ انگریز عورتوں کے نام کی مثال دینی ہو تو یہ نام بتاؤ، میری پاول۔ یہ بھی کوئی نام ہے۔ فرانسیسیوں کے مذاق سلیم نے البتہ اسے "گلِ سُرخ" کا لقب دیا جو اسے زیب دیتا ہے۔

اور حلیمہ؟ ہم سمجھتے تھے کہ البانوی حسن میں کوئی خاص بات ہوگی۔ صحت؟ شاید وہاں ہوگی۔ پیرس نے تو اس کے لب و رخسار پر اتنی سُرخی، اتنا غازہ مل دیا تھا کہ اس میں اور کسی فرانسیسی لڑکی میں فرق

ہی نہیں ہو سکتا تھا۔

اور یہ پُر جوش انقلاب پسند ہندوستانی نوجوان۔ ان کی باتیں، ان کے تبصرے کرومیم کا فرنیچر اور چاندی کے چوکھٹے میں کارل مارکس کی تصویر اور قے کرنے کی آواز۔۔۔ قے کرنے کی آواز طلائی ہے یا نقرئی۔۔۔۔

تھوڑی دیر کے بعد اسے نیند آ گئی۔

(۴)

اگلے دن "سرکل آنگلو فرانسیز" نے ناچ اور رات کے کھانے کا انتظام کیا تھا۔ ہروشا برطانوی تھا نہ برطانوی رعایا اور نہ فرانسیسی، اس ناچ میں مدعو نہ تھا۔ نعیم شاید نہ جاتا۔ لیکن ایک امریکن لڑکی ایلس جو اس کے ساتھ فرانسیسی سیکھ رہی تھی کہہ چکی تھی کہ وہ شریک ہوگی۔ نعیم اس زمانے میں اس کا باقاعدہ "تعاقب" کر رہا تھا اور کامیابی کی اچھی خاصی امید بندھ چکی تھی۔ اس کے علاوہ "گلِ سُرخ" کے وہاں آنے کی بھی امید تھی۔

ناچ میں فرانسیسی بہت کم تھے۔ تین فرانسیسی لڑکیاں بڑی خوبصورت تھیں۔ مگر وہ اپنے ساتھی فرانسیسی لڑکوں کے ساتھ ناچ سے زیادہ کود پھاند اور کشتی میں مصروف رہیں۔ انگریزوں ہی کی تعداد زیادہ تھی۔ کچھ امریکن تھے۔ نعیم نے تقریباً ہر ناچ اپنی امریکن دوست کے ساتھ ناچا۔ اسی کے ساتھ ناچ کے وقفے میں پھل اور کیک کھائے اور کافی پی۔

لیکن ایک ناچ ایسا بھی تھا جس میں جو چاہتا دوسرے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کے ساتھ کی ناچنے والی کو چھین لیتا۔ لال بالوں والا اسکاچستانی لڑکا جس سے نظر ملا کے استانی نے یہ سمجھایا تھا کہ کوارے لاتاں میں زیادہ تر اجنبی لیتے ہیں، برابر "گلِ سُرخ" میری پاول کا پیچھا کر رہا تھا۔ مگر اور بھی کئی لڑکے بار بار اس سے میری کو چھین رہے تھے۔ اس نے ایک بار نعیم سے اس کی امریکن دوست ایلس کو چھینا، اس کا بدلہ لینے کے لیے نعیم نے "گلِ سُرخ" کو اس سے چھینا۔ نہ صرف چھینا بلکہ "گلِ سُرخ" سے کہا بھی کہ میں آپ سے ایک زمانے سے ملنا چاہتا تھا۔ اپنا تعارف کرایا۔ اتنے میں چھن گئی۔ نعیم کو پھر اپنی ایلس مل گئی۔ جب وہ دوبارہ چھنی تو اس نے سُرخ بالوں والے اسکاچستانی سے گلِ سُرخ کو پھر

چھینا اور محض اس کا چستائی کو جلانے کے لیے جو پیچھے کسی اور کے ساتھ ناچتا آرہا تھا کہا۔"آپ سے پھر ملنے کی کوئی صورت ہو سکتی ہے؟"

میری نے کہا۔"ضرور!"

اس نے کہا۔"میں آنستی تیوت میں چائے پیا کرتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں وہاں سے بہتر چائے پیرس بھر میں اور کہیں نہیں ملتی، اگر آپ کو کل فرصت ہو تو پانچ بجے میرے ساتھ چائے پئیں۔" اتنے میں سُرخ بالوں والے وحشی اسکا چستائی نے اس کے شانے کو ٹہوکا دے کے پھر گل سُرخ کو چھین لیا۔

لیکن چھنتے ہوئے میری نے کہا۔ضرور!"

اس کے بعد نعیم ایلس کے ساتھ ناچتا رہا۔ ناچ کے خاتمہ پر اس کو ساتھ لے کے مولاں روژ گیا۔ وہاں سے واپس آتے ہوئے ٹیکسی میں خوب بوس و کنار ہوا۔ مگر جب ایلس نے ضد کی کہ وہ سیدھی اپنے بورڈنگ ہاؤس جائے گی تو نعیم اس کو وہاں پہنچا کے، پیچ و تاب کھاتا ہوا، اکیلا اپنے کمرے کو واپس لوٹا۔

اس رات اس نے اپنی زندگی میں خلا محسوس کیا۔ خلا اور بڑی ہی سخت تنہائی۔ ایسی تنہائی جو کبھی کبھی برسات کی راتوں میں حیدرآباد میں محسوس کیا کرتا تھا۔ یہاں تنہائی کی شدت زیادہ تھی۔ پیرس کے جگمگاتے ہوئے انسانی جنگل میں وہ اکیلا تھا۔ اکیلا اور بالکل اکیلا۔ اگر ایلس آجاتی تو اس کا کیا بگڑ جاتا۔ بجز آخری بات کے وہ اس کے ساتھ اور سب کچھ تو کر ہی چکا تھا۔ مگر یہ متوسط طبقے کی تربیت، خدا اس سے بچائے۔ اور طرہ یہ ہے کہ امریکن لڑکیاں بڑی روشن خیال سمجھی جاتی ہیں۔

تنہائی، تنہائی، تنہائی۔ دو گھنٹے تک نیند نہ آئی۔ بالآخر وہ اٹھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور اس کے دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے۔ اس نے کپڑے پہنے۔ وہی کپڑے جو تھوڑی دیر پہلے اتارے تھے۔ آہستہ سے دروازہ بند کیا۔ نیچے اترا۔ ہوا بہت سرد ہو گئی تھی اور آسمان پر بارش کے آثار تھے۔ ٹیکسی کے اڈے پر پہنچ کے اس نے آہستہ سے کہا۔"اسفانکس"۔ کیونکہ پیرس کے قحبہ خانوں میں صرف اسی کے متعلق اس کا خیال تھا کہ یہاں بیماریوں کا زیادہ اندیشہ نہیں اور یہاں کی چند لڑکیاں اسے پسند تھیں۔

شوفر نے کہا۔"دی مسیو۔" اور انجن اسٹارٹ کیا۔

جب وہ قحبہ خانے سے واپس ہوا تو اسے نیند آرہی تھی اور بلقیس یاد آرہی تھی۔

چھٹا باب

انتظار

پانچ بجنے میں ابھی پندرہ منٹ باقی تھے۔ اس کے زیادہ تر ساتھی اور ہم جماعت چائے پی کے رخصت ہو چکے تھے۔ بہت سے ابھی تک اپنی میزوں کے پاس بیٹھے یا تو ہنس ہنس کے باتیں کر رہے تھے، یا اخبارات اور رسائل پڑھ رہے تھے۔ نعیم نے کمرے میں ادھر اُدھر دیکھا۔ ایک میز کے قریب دو فرانسیسی لڑکیاں جو مریل اور دق زدہ معلوم ہوتی تھیں اور مخبوط الحواس قسم کے انگریز طالب علم سے باتیں کر رہی تھیں۔ ایک میز پر جنوبی افریقہ کی وہ حسینہ تھی جس کو نعیم کی صورت سے محض اس لیے نفرت تھی کہ جنوبی افریقہ کے سفید باشندے تمام رنگ والی نسلوں کے باشندوں کو حقیر سمجھتے ہیں۔ اور اس حسینہ کو یہ بہت ناگوار گذرتا تھا کہ پیرس میں یہ بات نہیں۔ وہی یہودی انگریز اس حسینہ کے ساتھ آج بھی بیٹھا ہوا تھا جو پہلے ہی دن سے اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ ایک میز کے گرد چار انگریز نوجوان زور زور سے ہنس ہنس کے باتیں کر رہے تھے۔ یہ چاروں کیمبرج کے طالب علم تھے۔ ان میں سے ایک بہت بلند و بالا اور خوبصورت تھا۔

ان چاروں کو سر کے اشارے سے سلام کر کے اور مسکرا کے ان کی "ہلو" کا جواب دیتا ہوا، نعیم پاس ہی ایک خالی میز کے پاس بیٹھ گیا اور اخبارات کے اس ڈھیر کو اُلٹنے پلٹنے لگا جو میز پر تھا۔ ٹائمز کا

اڈیٹوریل پڑھا۔ کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھا۔ پانچ بج کے پانچ منٹ ہو چکے تھے۔ ''گل رُخ'' ابھی تک نہیں آئی تھی۔

کہیں وہ بھول تو نہیں گئی؟ مگر ابھی وقت ہی کتنا ہوا ہے۔ پھر فرانس میں وقت کی پابندی کا اتنا لحاظ رکھنا جتنا انگلستان میں رکھا جاتا ہے ستم ہے۔ آتی ہوگی۔ نعیم نے ''ٹائمز'' کے ایک گوشے میں ہندوستان کے متعلق ایک چھوٹی سی خبر پڑھی۔ پھر سوچنے لگا کہ برطانوی پبلک ہندوستانی معاملات کے متعلق کس قدر تاریکی میں رکھی جاتی ہے۔ یکا یک ہندوستان کے متعلق خبریں پڑھنے کو اس کا جی چاہنے لگا اور پھر یہ خیال آیا کہ ہندوستان میں اسے ہندوستان کی سیاست اور ہندوستانی خبریں پڑھنے سے کیسی اُلجھن معلوم ہوتی تھی۔ جہاں صبح کی امید ہی نہ ہو، وہاں رات کو بار بار گھڑی دیکھنے سے کیا حاصل۔ اس نے کلائی پر نظر ڈالی۔ پانچ بج کے دس منٹ ہو چکے تھے۔ میری پاول ابھی تک نہیں آئی۔ بُھول گئی؟ یا اسے وقت کا خیال نہیں رہا؟ ٹال گئی؟ پھر آنے کا وعدہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ دونوں مریل فرانسیسی لڑکیاں اٹھیں اور مخبوط الحواس انگریز طالب علم سے رخصت ہوئی۔ انگریز طالب علم اٹھ کے اخبارات دیکھنے لگا اور پھر خود بھی چل دیا۔

نعیم کو چائے پینے کی بڑی خواہش معلوم ہوئی۔ ساڑھے پانچ بجے چائے بند ہو جائے گی۔ میری پاول کو اچھی طرح معلوم ہے۔ پھر وہ ابھی تک کیوں نہیں آئی؟ نہیں آنا تھا تو وعدہ کیوں کیا؟ نعیم کو یاد آیا کہ کتنی بار ایسا ہوا ہے، لندن میں زمین دوز ریل کے اسٹیشنوں پر اس نے ان دکانوں میں کام کرنے والی لڑکیوں کا انتظار کیا جن سے وہ ہیمر اسمتھ پیلس یا کسی اور ناچ گھر میں ملا تھا، اور ان میں سے کئی ایک نے دھوکا دیا۔ یا پیرس ہی میں ایک نائٹ کلب والی لڑکی نے تین بجے لاسورس میں ملنے کا وعدہ کیا اور نہیں آئی۔ لاسورس کا خیال آتے ہی اسے یاد آیا کہ اس نے ہروشا سے اس کا ذکر ہی نہیں کیا تھا کہ گل رُخ سے اس کی ملاقات ہوئی اور اسے آج چائے پر بلایا ہے۔ ہروشا کو عورتوں سے اس قدر کم دلچسپی کیوں ہے؟

اسی طرح ایک خیال سے دوسرا خیال پیدا ہوتا گیا۔ بیچ بیچ میں انتظار کا احساس یوں دخل دیتا جیسے گھڑی کا گھنٹہ مقررہ وقت پر ٹن ٹن بجتا ہے۔ یہاں تک کہ ساڑھے پانچ بجنے لگے۔ چائے کا وقت ختم ہونے کو آیا۔ نعیم نے دو آدمیوں کے لیے چائے کا ٹکٹ دے کے کشتی اپنی میز پر منگوائی۔ اب بھی میری

پاول کے آنے کی محض موہوم سی امید باقی تھی۔

کیمبرج کے چاروں نوجوان بھی اٹھ کے چل دیئے۔ اب نعیم کمرے میں اکیلا تھا۔ وہ انڈیل کے چائے بنانے لگا کہ خود تو پی لے تاکہ چائے بالکل ٹھنڈی نہ ہو جائے۔ اتنے میں زینے پر کسی کے چڑھنے کی آواز کھٹ کھٹ کھٹ سنائی دینے لگی۔ نعیم بے ساختہ اٹھ کر کھڑا ہوا۔ بغیر کسی وجہ کے اس کا قلب دھڑکنے لگا۔ لیکن بہت جلد اس آواز ہی نے اپنی دلائی ہوئی امید کی تردید کی۔ یہ کسی زنانہ جوتے کی کھٹ کھٹ نہ تھی۔ نعیم پھر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

چند ہی ثانیے کے بعد ایک نوجوان بڑی عمدہ پوشاک پہنے، کمرے میں داخل ہو کے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ نعیم نے اسے پہلی مرتبہ آج دیکھا تھا۔ اس کے قد، اور اس کی چال سے، بلکہ اس کے لباس سے صاف عیاں تھا کہ وہ فرانسیسی نہیں تھا۔ حالانکہ اس کے بال بالکل سیاہ تھے۔

وہ اِدھر اُدھر میزوں پر اخبارات اُلٹتا پلٹتا رہا۔ پھر ''ٹائمز'' کو نعیم کی میز پر دیکھ کے ذرا ٹھٹکا۔ بالآخر اس کے پاس آ کے معذرت کے لہجے میں پوچھنے لگا۔ ''اگر آپ ٹائمز پڑھ چکے ہیں تو میں لے سکتا ہوں؟''

نعیم نے کہا۔ ''ہاں۔ ضرور!''

اس نے نعیم کی طرف ایک بار ذرا دیکھا اور اخبار میں مشغول ہو گیا۔

اور دو ایک منٹ کے بعد اخبار کو تہہ کر کے اس نے میز پر رکھا اور کہا۔ ''کوئی خاص بات نہیں۔۔۔۔ اگر آپ اسے تجسس نہ سمجھیں تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ ہندوستانی ہیں؟''

''ہاں!''

''میرا نام کراکسلے ہے۔ جیمز کراکسلے۔ میرے والد ہندوستان میں صوبہ۔۔۔۔ میں چیف جسٹس رہ چکے ہیں۔ میں بھی وہیں پیدا ہوا تھا۔''

''بڑی خوشی ہوئی۔'' نعیم نے اٹھ کے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ''میرا نام نعیم حسن ہے۔۔۔ آپ چائے پیجیے گا۔۔۔ یہاں کی چائے میرے خیال میں پیرس بھر میں اچھی ہوتی ہے۔''

کراکسلے نے کہا۔ ''جی ہاں! میں فرانس میں کافی پیتے پیتے اکتا گیا ہوں۔'' یہ کہہ کے وہ ہنسا اور نعیم نے چائے بناتے ہوئے اس کا ساتھ دیا۔ شکر کے ٹکڑے اٹھاتے ہوئے اس نے پوچھا

"کتنے؟" کراکسلے نے کہا۔ "دو، شکریہ!"

کراکسلے جو، اب ایک کرسی پر نعیم کے پاس بیٹھ گیا تھا کہنے لگا: "یہ مقام تو اچھا خاصا معلوم ہوتا ہے۔ پہلے میں نے ارادہ کیا کہ شہر جامعہ (ستے یونیورستے) میں جا کر رہوں۔ پھر میں نے طے کیا کہ تمام ترتعلیمی روایات تو پیرس میں حلقۂ لاطینی ہی سے وابستہ ہیں، یونیورسٹی یہیں ہے۔ اس لیے یہیں آ گیا۔"

نعیم نے کہا: "میں نے آپ کو اس سے پہلے یہاں نہیں دیکھا۔"

کراکسلے نے کہا: "میں کل پیرس پہنچا۔ میں گرے نوبل سے آ رہا ہوں، وہاں میں نے تعطیلات میں فرانسیسی کا کورس شروع کیا تھا۔ مگر اب یہاں اس ارادے سے آیا ہوں کہ تکمیل یہاں کروں۔ اس آنستی تیوت میں شریک ہو گیا ہوں۔"

نعیم نے اس آنستی تیوت کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ یہاں کلب کی سی زندگی ہے۔ چند ہی منٹ کے اندر دونوں نوجوان کے درمیان سے اجنبیت کا حجاب اٹھ گیا۔ وہ اس طرح باتیں کرنے لگے گویا ایک دوسرے کو عرصے سے جانتے ہیں۔

کراکسلے کا لہجہ پبلک اسکول کا خالص ترین اور شیریں ترین انگریزی لہجہ تھا۔ اس کی وضع قطع اور چال ڈھال سے خاندان اور تعلیم کی بلندی کا اندازہ ہوتا تھا۔ وہ قومی اور نسلی جھجک جو انگریزوں کو غیر ملکیوں اور غیر یورپیوں سے اس عمر میں ہوتی ہے اسے بالکل نہ تھی۔ اظہار خیال سے نہیں بلکہ بات چیت کے انداز ہی سے یہ ظاہر تھا کہ اسے دوسرے ملکوں سے نہ صرف یہ کہ تعصب نہیں ہے بلکہ اس طرح کی دلچسپی ہے جیسے اپنے ہم وطنوں سے۔

چھ بجے نعیم نے اجازت چاہی۔ ساڑھے آٹھ بجے اسے بولوا روز اتالیاں سے ایلس کو ساتھ لے کے تھیٹر جانا تھا۔ اس نے کراکسلے سے کہا کہ کل ملاقات ہوگی۔

کراکسلے نے کہا: میں کھانے کے بعد ایک لڑکی کو ساتھ لے کے "دوم" قہوہ خانے جاؤں گا۔ اگر نعیم کو فرصت ہو تو وہ بھی وہاں آ جائے۔ اس پر نعیم نے کہا: "میں ایک امریکن نوجوان خاتون کے ساتھ کامیڈی فرانسیز جا رہا ہوں۔ وہاں سے واپسی پر اگر اس کا بھی جی چاہا تو دوم آ جاؤں گا۔ مگر وعدہ نہیں کر سکتا۔"

نعیم کو توقع نہ تھی کہ ہروشا ابھی تک اپنے کمرے میں ہوگا۔ لیکن یہ خیال ضرور تھا کہ سات بجے تک

وہ واپس آ جائے گا۔ کیونکہ دونوں نے سات بجے ایک یونانی ریستوران میں کھانا ساتھ کھانے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن جب نعیم میری پاول کے نہ آنے سے آزردہ اور کراکسلے کی ملاقات سے خوش گھر پہنچا تو سڑک پر سے ہی اس نے ہروشا کو اپنی کھڑکی کے پاس آرام کرسی پر لیٹے ہوئے پڑھتے دیکھا۔

نعیم سیدھا ہروشا کے کمرے میں پہنچا۔ اپنی ٹوپی اس کے بستر پر پھینکی۔ "تمہاری گل رُخ نے دھوکا دیا۔ مجھ سے آنے کا وعدہ کیا اور گھنٹہ بھر انتظار کرایا۔" یونیورسٹی کے زمانے کی اشتراکیت اور اشتمالیت کی اس خبر لینی شروع کی۔ یہ بھی ایک ذہنی فیشن ہے۔ ایک طرح کا ذہنی تدمغ ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اسے نعیم سے اور ہندوستانیوں سے تعصب نہ ہوتا تو وہ اس طرح دھوکا نہ دیتی۔

ہروشا نے اس کے تمام اعتراضات کو احساسِ کمتری پر محمول کیا۔

پھر نعیم نے اپنی مصیبت کی دوسری کہانی سنائی۔ کل رات ایلس نے۔۔۔ زیادہ۔۔۔ اجازت نہیں دی۔ ابتدائی کارروائیوں کو شروع ہوئے ہفتے ہو گئے مگر قلعہ کسی طرح سر ہی نہیں ہونے پاتا۔ کل پھر وہ ضد کر کے، اپنے بورڈنگ ہاؤس چلی گئی تھی۔ آج کامیڈی فرانسیز چل رہی تھی۔ مگر آج بھی کامیابی کی امید کم ہی تھی۔

ہروشا نے کہا: "متوسط طبقے کی لڑکیوں کی تاب مقاومت توڑنے کو صبر چاہیے۔ غریب اور مزدور طبقوں کی لڑکیوں میں عصمت کی استطاعت ہی نہیں ہوتی۔ متوسط طبقے کی لڑکیوں میں عصمت کی استطاعت ہوتی ہے اور امیر طبقے کی لڑکیوں میں بے عصمتی کی استطاعت ہوتی ہے۔"

(ہروشا کی زبان سے ایسے مرصع جملے بہت کم نکلا کرتے تھے)

"اب رہی نفسیاتی فتح۔ سو میرے خیال میں ہر عورت فتح کی جا سکتی ہے۔ چاہے اسے کسی اور ہی سے محبت کیوں نہ ہو۔ عورت فطرتاً مجہول اور منفعل ہے۔ مگر فتح کے لیے ہمت اور استقلال کی ضرورت ہے۔"

عورت کے متعلق اس طرح کی حقارت آمیز رائیں ہروشا اس سے پہلے بھی کئی بار دے چکا تھا۔ نعیم نے طنزیہ دلچسپی کے ساتھ کہا: "یہ ترقی پسند اشتمالی کی رائے ہے؟"

"یہ زیدنک ہروشا کی رائے ہے۔"

عورت کے مساوی حقوق کے متعلق بھی ہروشا کو اشتمالی نظریوں سے بنیادی اختلاف تھا۔ لیکن اسی درمیان میں نعیم دل ہی دل میں غالب کے اس شعر کا مزا لے رہا تھا۔

اس لب سے مل ہی جائے گا بوسہ کبھی تو ہاں!
شوقِ فضول و جرأتِ رندانہ چاہیے

افسوس تو یہ تھا کہ غالب کا ترجمہ ناممکن تھا ورنہ ہروشا کو سناتا۔ پھر نعیم نے کرا کسلے کا ذکر کیا اور رات کو روم میں اس کے بلاوے کا بھی ذکر کیا۔ ہروشا نے کہا۔ "فرصت ہوئی تو میں بھی روم جاؤں گا۔ میرے خیال میں اچھا تو یہ ہے کہ تم بھی اپنی امریکن دوست کو جلدی سے دفن کر کے آ جاؤ۔ ہاں اگر تم خود بھی اس کے ساتھ دفن ہو جانے میں کامیاب ہو جاؤ تو دوسری بات ہے۔ لیکن فی الحال اس کی امید کم ہے۔"

نعیم نے کہا۔ "تم آ گئے تو میں ضرور آؤں گا۔ اگر ایلس آئی تو اسے بھی ساتھ لیتا آؤں گا ورنہ اسے بورڈنگ ہاؤس پہنچا کے آ جاؤں گا۔ چلو اب کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔"

(۲)

بُولوار روزا تالیاں میں جس امریکن گھرانے میں ایلس چائے کے لیے مدعو تھی وہاں نعیم اس سے پہلے بھی جا چکا تھا۔ ایلس کو جب وہ اس گھر سے اپنے ساتھ سڑک پر لایا تو پوچھا "اگر بھوک لگی ہو تو کچھ کھا لو، ابھی وقت ہے۔"

ایلس نے انکار سے سر ہلایا۔ ایک گہری سانس لی۔ تھکاوٹ کا اظہار کیا اور کہا کہ "چائے کے ساتھ بہت کھا گئی۔ تم نے کچھ کھایا؟"

"ہاں میں ہروشا کے ساتھ کھانا کھا چکا۔"

زمین دوز ریل میں نعیم نے ایلس کا ہاتھ پکڑا۔ پہلے درجے میں بہت تھوڑے لوگ تھے اور بہت دور بیٹھے تھے۔ چند ثانیوں کے بعد نعیم نے ایلس کی انگلیوں کی جوابی گرفت محسوس کی۔

(۳)

کامیڈی فرانسیز سے واپس ہوتے ہوئے نعیم نے کرا کسلے کا ذکر کیا۔ "تمہیں بھوک لگ رہی ہوگی۔ طبیعت چاہے تو تم بھی روم چلی چلو۔ وہیں کچھ کھا لیں گے۔ نہیں تو میں تمہیں بورڈنگ ہاؤس تک چھوڑ آؤں۔ جو تم کہو۔"

ایلس نے مسکرا کے کہا کہ میں بھی چلوں گی۔ زمین دوز ریلوے کے اسٹیشن کی سرنگ میں نعیم نے

ایک طویل بوسہ لیا۔ اس کے ہونٹ خشک اور گرم تھے۔ نعیم نے خیال کیا کہ اسے بھوک لگ رہی ہوگی۔ ایلس نے اس کے بازو میں اپنا ہاتھ حائل کیا اور اس کے سہارے چلنے لگی۔ تھوڑی دور آگے بڑھ کے دونوں پھر رکے۔ پھر ایک طویل بوسہ لیا۔ ایک جلد باز فرانسیسی ان کے قریب سے گذر گیا اور نعیم کو ذرا سا دھکا لگا۔ فرانسیسی نے جاتے ہوئے مڑ کے کہا۔ معاف کیجئے۔ موسیوں۔"

اور زمینِ دوز ریل میں موں پرناس جاتے ہوئے نعیم نے ایلس کی طرف دیکھا جو اس کے کاندھے کا سہارا لگائے، آنکھیں بند کئے نیم دراز تھی۔ اس کے بال پیلے پیلے اور ریشم کی طرح نرم تھے مگر ان میں سنہری چمک نہ تھی۔ اس کا چہرہ گول گول تھا۔ نعیم کو ہمیشہ حیرت ہوتی تھی کہ امریکن لڑکیوں کی صورتیں ایک دوسرے سے کس قدر ملتی جلتی ہیں۔ غالباً اس وجہ سے کہ ان کا بناؤ سنگار یکساں ہے۔ گول چہروں والی تمام لڑکیاں گول چہروں والی سنیما ایکٹرسوں سے اس قدر مشابہ ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ مصنوعی رنگ اور روغن کی اتنی موٹی تہ۔ مگر نعیم کو یہ مصنوعی رنگ اور روغن پسند تھا۔ یہ لڑکیاں اس اعلیٰ ترین امریکی رنگ و روغن میں گڑیوں کی طرح خوشنما معلوم ہوتی تھیں۔

کوئی مہینہ بھر پہلے اس نے ایلس کو پہلی بار دیکھا تھا۔ جس دن فرانسیسی کلاس شروع ہونے والی تھی، پرنسپل کے کمرے کے باہر وہ بھی کھڑی تھی اور نعیم بھی۔ نعیم نے اسے امریکن لہجے میں فرانسیسی میں پرنسپل کے سکریٹری سے یہ پوچھتے ہوئے سنا "کیا وہ بہت مصروف ہیں؟" اور پھر نعیم نے ہمت کر کے اس سے بات کی۔ ہر نئے مکتب میں پہلا دن بڑا قیمتی ہوتا ہے۔ اس دن اگر کسی ہم جماعت لڑکی کو گانٹھ لیا جائے تو کام مقابلتاً آسان ہو جاتا ہے۔ اس دن سے نعیم اور ایلس میں صاحب سلامت اور بہت جلد اچھی خاصی دوستی شروع ہو گئی تھی۔ حالانکہ یہ دوستی انتہائی سطحی قسم کی تھی۔ اس دوستی کی بنیاد محض یہ امر تھا کہ دونوں کا تعلق متضاد جنسوں سے تھا۔ دونوں ایسے ملکوں سے آئے تھے جو ایک دوسرے کے لیے ضدین کی دلچسپی رکھتے ہیں، دونوں کے مذاق ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ لیکن پیرس کی تنہائی نے دونوں کو دوست بنا دیا تھا۔

تیسرے چوتھے روز ہی بوس و کنار شروع ہو گیا تھا۔ بہت سے ہم جماعت لڑکوں نے نعیم کی رقابت کی کوشش کی۔ مگر سب کو شکست ہوئی۔ ایلس وقتِ واحد میں ایک سے زیادہ نوجوان دوست کی نہ ضرورت سمجھتی تھی، نہ خواہاں تھی اور نہ اس کے پاس اتنا وقت تھا۔ نعیم کی طبیعت میں اسے جو چیز پسند تھی

اسے وہ فرانسیسی لفظ ''سمپاتیک'' کہہ کے ادا کرتی تھی جس میں ہم درد، ہم مشرب اور ہم خیال تینوں کے معنی پوشیدہ ہیں۔ پیرس کی تنہائی میں اس سے زیادہ کی نہ اسے خواہش تھی نہ ضرورت۔

اس کے والد سنسناٹی میں ایک بڑی جوہری فرم کے ڈائریکٹر تھے، اور اسے کافی جیب خرچ ملا کرتا تھا۔ اس کا اصول شروع میں یہی تھا کہ نعیم کے ساتھ وہ جہاں کہیں بھی جائے دونوں نصف نصف خرچ کریں۔ جب بوس وکنار کی قیمت نہ تھی اور ایک عجیب نامحسوس طریقے سے یہ امر اس نے نعیم کو محسوس بھی کرا دیا تھا۔ اگر کبھی ایسا ہوتا کہ نعیم کے پاس نقد کچھ نہ ہوتا تو وہ بے تکلف ایلس کا بٹوا کھول کے جتنا لینا ہوتا نکال لیتا اور گھر پہنچ کے نعیم کے انتہائی اصرار کے باوجود بھی پیسے واپس نہ لیتی۔ بالآخر نعیم نے اس قسم کا اصرار بھی چھوڑ دیا۔

دوستوں کی طرح ان کا شعور، اور ان کی محسوس اور غیر محسوس نفسیاتی کیفیتیں ایک دوسرے کی سمجھ میں آ گئی تھیں۔ اور دونوں کی دوستی میں خلوص تھا۔ لیکن اس دوستی کا جنسی پہلو ابھی بہت تشنہ تھا۔ ایلس سینکڑوں بار کہہ چکی تھی۔ ''میں تمھیں بہت پسند کرتی ہوں۔ مگر مجھے تم سے محبت نہیں۔'' اسے کسی طرح بھی اس سے عشق نہ تھا۔ اس کی رفتار گفتار، وضع تراش، اس کی ہنسی، اس کے دانت، سب نعیم کو اچھے معلوم ہوتے مگر دل ویسا کا ویسا سرد رہتا۔ جنسی تعلقات بھی تکمیل کو نہ پہنچ سکے۔ بوس وکنار میں اسے شروع سے انکار نہ تھا۔ لیکن نعیم کی دست درازی دیکھ بھال سے آگے بڑھنے نہ پاتی۔ دو ایک بار جب نعیم نے حد سے تجاوز کرنا چاہا تو وہ اس قدر بگڑ گئی کہ نعیم کو ہٹ جانا پڑا۔

اس جنسی تشنگی کی وجہ سے نعیم بہت بے چین ہو جاتا۔ بعض وقت وہ یہ بھی چاہتا کہ ایلس کا پیچھا چھوڑ دے اور کوئی اور ایسی لڑکی تلاش کرے جس میں اس کی مدعا برآری زیادہ آسان ہو۔ لیکن ایلس سے اس کی دوستی میں کچھ ایسی انسانی خصوصیت تھی، کچھ ایسا خلوص اور کچھ ہمدردی تھی کہ وہ اسے چھوڑ نہ سکتا۔ کم از کم اس وقت تک جب تک وہ پیرس سے آکسفرڈ واپس چلا جائے اور زمان و مکان اس دوستی اور ہمدردی کا رشتہ آہستہ آہستہ منقطع نہ کر دیں۔

اس وقت جب ایلس اس کے کندھے کا سہارا لگائے اونگھ رہی تھی، اسے بڑی بھلی معلوم ہو رہی تھی اور اس کے دل سے ہمدردی کی ایک لہر اٹھی اور ایلس کے پیلے پیلے بالوں تک پر چھا گئی۔

اتنے میں، 'موں پرناس' آ گیا۔

(۴)

دوم میں کراکسلے اپنی میز سے اٹھ کر نعیم کو بلانے دروازے کی طرف آیا۔ نعیم اسے ادھر اُدھر ڈھونڈ ہی رہا تھا۔ نعیم نے ایلس کا تعارف کرایا اور دیر ہو جانے کی معافی چاہی۔ اپنی میز پر واپس پہنچ کے کراکسلے نے اپنی ساتھی کا تعارف کرایا۔ ''یہ مارگرٹ ہے۔ میری بہن۔'' پھر نعیم کے چہرے پر حیرت کے آثار دیکھ کے اس نے کہا ''مارگرٹ کا اصرار تھا کہ پیرس کی اندرونی دنیا میں دوم یا کسی اور کیفے سے زیادہ نیچے نہیں اتر سکتا تھا۔ مارگرٹ کی عمر ابھی سولہ سال کی ہے اور اس کی دو خواہشیں ہیں۔ ایک تو امریکہ جانے کی، اور دوسری دربار میں پیش ہونے کی۔ ابھی دونوں کے لیے وہ بہت کم عمر ہے۔''

مارگرٹ نے مسکرا کے دونوں کا خیر مقدم کیا۔ ساتھ ہی اس کے گالوں پر شرم اور حجاب کی وہ سُرخی دوڑ گئی جو بچپن کے ختم اور جوانی کے آغاز کی نشانی تھی۔

ایلس کے لیے ابالے ہوئے انڈے، سینڈوچ، کچھ کیک، سیاہ کافی اور اسی قسم کی چیزیں منگوائی گئیں۔ مارگرٹ کے لیے صرف کافی۔

مارگرٹ نے ایلس سے پوچھا ''آپ امریکہ کے کس حصے کی رہنے والی ہیں؟''

ایلس نے مسکرا کے جواب دیا ''سنسناٹی۔''

''کیا اچھا نام ہے۔۔۔ مجھے امریکہ دیکھنے کی اتنی تمنا ہے۔۔۔ اتنی تمنا ہے۔۔۔''

دونوں کو اس طرح آپس میں شیر و شکر ہوتے دیکھ کے نعیم اطمینان سے مسکرایا اور کراکسلے سے باتیں کرنے لگا۔ اس نے ہروشا کا ذکر کیا اور کہا کہ اس نے اسے بھی یہاں بلایا ہے۔ کراکسلے نے کہا۔ ''یہ بہت اچھا ہوگا''۔ دونوں نے آہستہ آہستہ اپنے گلاس خالی کرنے شروع کیے۔ کراکسلے نے گرینوبل میں طلبا کی زندگی کے قصے سنائے، ریویرا میں ایک جرمن جلاوطن خاندان سے ملاقات کا ذکر کیا۔ پھر جرمنی پر بحث شروع ہوئی۔ کراکسلے کے لہجہ میں ایک طرح کا شریفانہ غصہ تھا۔ محض مباحثے کو طول دینے کے لیے نعیم نے بھی حجت شروع کر دی۔ ''یہ آپ کے چپ کی جماعتیں، یہ آپ کے سوشل ڈیموکریٹ اور سوشلسٹ اور کمیونسٹ، باتیں کرنے، جلوس نکالنے، بحثیں کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے کہ جب کام کا وقت آتا ہے تو فاشسٹی یا ناتسی ہی پہلے ہاتھ مارتا ہے۔ اطالیہ میں یہی ہوا، فنستان میں یہی ہوا، جرمنی میں یہی ہوا۔''

دونوں اس بحث میں مصروف تھے، اور اُدھر ایلس اور مارگرٹ ذرا ذرا سے وقفے کے بعد پھر بار بار چھوٹی نسوانی باتوں کے متعلق گفتگو میں مصروف ہو جاتیں۔ اتنے میں مارگرٹ نے اپنے بھائی کو کاندھے سے دھکا دے کے اشارے سے کچھ بتایا۔

یہ ایک مصور تھا۔ غالباً ہنگری یا شاید پولینڈ کا۔ بہر حال خدوخال وسط یورپ کے تھے۔ وہ بڑی تن دہی سے مارگرٹ کی تصویر پنسل سے کھینچ رہا تھا۔ وہ بار بار اس کی طرف دیکھتا اور پھر پنسل تیزی سے کاغذ پر چلنے لگتی۔ مارگرٹ اور اس کے ساتھیوں کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر وہ سر کا اشارہ کر کے مسکرا دیا۔ کراکسلے اور نعیم جواب میں مسکرائے۔

''جم یہ کون ہوگا؟''

''سفید عورتوں اور غلاموں کی تجارت کرنے والا۔'' ایلس نے ہنس کے کہا۔

''مجھے یقین ہے تمہاری تصویر وہ اس لیے بنا رہا ہے کہ اپنے سردار کو دکھا کے پسند کرائے۔ اس لیے اس نے اس پر اسرار مشرقی (نعیم کی طرف ہاتھ کا اشارہ کر کے) کو یہاں مقرر کیا ہے کہ وہ ہمارے سارے بھید معلوم کر لے۔۔۔ میری پیاری بچی، مجھے تو بڑا ڈر معلوم ہو رہا ہے کہ تم چھ ماہ بعد بونس ایر یس پہنچ جاؤ گی۔''

سب ہنس رہے تھے۔ نعیم نے کہا بھی۔ ''ایلس۔ چپ رہو۔''

مگر مارگرٹ نے ایلس کی کہانی میں اضافہ شروع کیا۔ ''تب تم مجھ سے ملنے اور مجھے چھڑانے اس ہوائی جہاز میں اُڑ کے آنا جس کا بڑا اچھا سا نام ہے۔۔۔۔''

''کلپر۔'' ایلس نے مدد دینے کے لیے کہا۔

مارگرٹ نے اسی طرح ہنستے ہوئے کہا۔ ''ہاں کلپر۔ اور تم بھیس بدل کے آنا۔ سُرخ ہندوستانی لباس میں، سر پر پروں کا تاج پہن کے اور اپنے اے۔ ڈی۔ سی (نعیم کی طرف اشارہ کر کے) کو لے آنا۔ اگر بدقسمتی سے یہ ثابت ہو گیا کہ یہ مجرموں اور غلام فروشوں کے دلال ہیں تو میری قیمت ان کے ذریعے طے کرا کے چھڑوا لینا۔''

جیمز کراکسلے نے اپنی بہن سے کہا۔ ''بس کرو مارگرٹ۔ مجھے یقین ہے یہ پکاسو ہوگا۔''

نعیم نے کہا۔ ''چالیس سال پہلے شاید پکاسو کی یہ عمر ہوتی۔''

کراکسلے نے کہا۔ ''ہاں مگر پکاسو کے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ ایک کیفے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے پلٹ کے دیکھا تو پیچھے ایک میز پر ایک ریاضی دان کچھ اشکال بنا رہا تھا۔ پکاسو نے کہا۔ ''خوب!'' اور یہ تعریف ریاضی کے نقطۂ نظر سے نہیں کی گئی تھی۔ یہ مہندسانہ مصوری کی ابتدا تھی۔ مگر میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ یہ نوجوان مصور۔۔۔ جو یقیناً بڑا ہنر مند ہے۔۔۔ کس اسلوبِ مصوری سے میری ننھی سی بہن کو زندہ جاوید کر دینا چاہتا ہے۔۔۔ مہندسانہ مصوری یا کلاسکی یا رومانی یا اثر پرستانہ یا ورائے حقیقی یا باطنی۔۔۔ یا یہ نوخیز صناع کسی نئے مکتبِ مصوری کا بانی ہے۔۔۔ بہر حال مسٹر حسن آپ میرے ساتھ اتفاق فرمائیں کہ ان حالات میں تحقیق کرنا میرا فرض ہے۔''

''یقیناً، یقیناً۔''

کراکسلے نے باآوازِ بلند مقابل کی میز پر اس مصور کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ جو بڑی تن دہی سے پینسل کو کاغذ پر گھس رہا تھا۔ ''مسیو۔''

کراکسلے نے کہا۔ ''ہم لوگ جو یہاں بیٹھے ہیں تعلیم یافتہ اور مہذب ہونے کے مدعی ہیں۔ حالانکہ اس دعویٰ پر ہمیں اصرار نہیں۔۔۔''

مصور نے وسط یورپ کے لہجے میں جو غالباً اہلِ ہنگری کا انگریزی لہجہ تھا کہ۔ ''یہ دیکھتے ہوئے کہ مسیو انگریز ہیں آپ کے اس قدر انکسار پر مجھے بڑی حیرت اور تعجب ہوتا ہے۔۔۔ فرمایئے۔''

کراکسلے نے جو اپنی تقریر کے منقطع ہو جانے پر بے صبر ہو رہا تھا۔ پھر سے کہا۔ ''درست ہے۔۔۔ درست ہے۔۔۔ میں اور یہ نوجوان خاتون جس کو آپ بقائے دوام عطا کر رہے ہیں بے وفا آلبین (انگلستان) کے رہنے والے ہیں۔ یہ خاتون اس ملک کی رہنے والی ہیں جس نے نیویارک کے سامنے آزادی کا مجسمہ بنا کے میرے بے وفا وطن سے بے وفائی کی۔ اور یہ صاحب اس ملک کے رہنے والے ہیں جو بمبئی کے سامنے آزادی کا مجسمہ بنا کے میرے بے وفا وطن سے بے وفائی کرنا چاہتا ہے، اور اب تک کر بھی چکا ہوتا۔ مگر ہم لوگوں کو دوسروں کی بے وفائی پسند نہیں۔۔۔ یہ تو سب غیر متعلق باتیں ہیں۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ آپ کے ہنر سے ہم کو شاید ہمیشہ دلچسپی رہے گی، اور آپ جو تصویر بنا رہے ہیں اس سے فی الوقت ہمیں اتنی دلچسپی ضرور ہے کہ ہم اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔۔۔ کیا آپ ہماری میز پر ہمارے ساتھ شریک ہو سکتے ہیں؟''

"ضرور۔ مسیو۔ ضرور۔ شکریہ۔ شکریہ!"

اور مارگرٹ دل میں سوچ رہی تھی کہ والدہ کو اگر یہ معلوم ہو کہ میں رات کے ایک بجے ایک سونولے رنگ کے ہندوستانی، ایک بجھی ہوئی امریکی لڑکی اور ایک اوباش مصور کے ساتھ یہاں بیٹھی ہوں تو وہ مجھ پر اور جیمز پر کتنا بگڑیں گے اور ان کی خفگی کا خیال کر کے وہ دل میں ذرا خوش ہوئی، کیونکہ اس کی اطلاع والدہ کو کبھی نہ ہونے پائے گی۔

مصور کے بال اُلجھے ہوئے تھے اور گال پچکے ہوئے۔ عمر تیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ اور اس کے کپڑے میلے اور پرانے تھے جس سے اس کی فلاکت کا پتہ چلتا تھا۔

نعیم نے کہا۔ "آپ انگریزی تو بہت اچھی بولتے ہیں۔"

"بے وفا آلبین میں میں نے دو سال گذارے ہیں۔" یہ کہہ کے مصور نے بنائی ہوئی تصویر میز پر ڈال دی۔

یہ ایک معمولی سا پنسل اسکیچ تھا۔

کراکسلے کو یہ اسکیچ دیکھ کر ذرا مایوسی ہوئی، جو اس کے چہرے پر ظاہر تھی، اور مصور جو ایک اعصابی کشمکش کے عالم میں اس کے چہرے کا مطالعہ کر رہا تھا، یہ دیکھ کے زور زور سے سگریٹ کے کش لینے لگا۔

"فیئر۔۔۔ یہ آپ کا نام ہے؟" کراکسلے نے اس کے دستخط دیکھ کے کہا۔

مست پرولتاری اکثر بھول جاتے ہیں۔ میرا نام فیئر ہے۔ میں ٹرانسلوے نیا کا رہنے والا ہوں جو پہلے ہنگری میں تھا، اب رومانیا میں ہے۔ میں اس لیے نکلا کہ وہاں فوجی افسر گالوں پر سرخی لگاتے ہیں اور میرے خیال سے سرخ رنگ کاغذ کے سوا اور کسی چیز پر اچھا نہیں لگتا۔

"خصوصیت سے روس کے نقشے پر۔" نعیم نے کہا۔

"جی مسیو!"

سب اس تصویر کو غور سے دیکھ رہے تھے جس میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ یہاں تک کہ مارگرٹ جو اپنی تصویر دیکھنے کی سب سے زیادہ مشتاق تھی، اس کے چہرے پر بھی ناپسندی کی جھلک تھی۔

مایوس مصور نے کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ میں اپنے فن میں ناکام ہوں۔ اگر آپ کو کامیاب مصور

دیکھنا ہو تو ادھر دیکھیے۔" یہ کہہ کے اس نے شیشے کی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ ایک جاپانی لڑکا جس کی عمر بمشکل تیئس چوبیس سال ہوگی کھڑکی کے اس طرف کھڑا ہوا تھا۔ اس کے بال اس کی پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے اور اس کی پیشانی شیشے سے لگی ہوئی تھی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور اس کے کالے بال شیشے کے اس پار سے چمک رہے تھے۔ ایک لڑکی جو کسی اور کے ساتھ ایک میز کے پاس بیٹھی ہوئی تھی، وہ شیشے کے اس پار سے اسے اپنی حرکات سے مخاطب کر رہا تھا اور لڑکی ہنس ہنس کے اشاروں سے اس کا جواب دے رہی تھی۔ پھر وہ لڑکی اٹھ کے باہر گئی، اور اس جاپانی لڑکے کو اپنے ساتھ لے آئی۔ اس کا ساتھی اس لڑکے کا بڑا دوست معلوم ہوتا تھا۔

فیئر جا کے نوجوان جاپانی مصور کو بلا لایا۔ وہ بڑے اطمینان اور خود اعتمادی سے مسکراتا ہوا آیا اور سب سے ہاتھ ملا کے ایک کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا۔ اسے انگریزی کا ایک لفظ بھی نہیں آتا تھا اور فرانسیسی بھی ٹوٹی پھوٹی جانتا تھا۔

فیئر نہیں بیٹھا۔ کراکسلے نے بہت اصرار کیا کہ کچھ پی لے۔ اس نے انکار کیا، اس پر کراکسلے نے یہ کہہ کر کہ "کم از کم اس تصویر کے شکریے میں جو آپ نے کھینچی ہے، یہ ناچیز ہدیہ تو لیجئے۔" سو سو فرانک کے دو نوٹ دیئے۔ ہنگرین مصور نے شکریہ ادا کیا اور سب کو شب بخیر کہہ کے کیفے سے باہر چلا گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھا اور وہ صورت سے بھوکا معلوم ہو رہا تھا۔

جاپانی لڑکے کی خود اعتمادی پر نعیم کو حیرت ہو رہی تھی۔ اس نے ایلس کو دیکھ کر کہا "ژولی" (خوبصورت) اشاروں میں کچھ باتیں کیں۔ مارگرٹ نے دل میں کہا "ایک اور ملاقاتی جو والدہ کے لیے بالکل ناقابل قبول ہوگا۔" ایلس نے نعیم سے کہا۔ "کیوٹ cute یہ وہ امریکی لفظ ہے جس کا ترجمہ ناممکن ہے۔"

جاپانی نوجوان فرانسیسی کے ٹوٹے پھوٹے جملوں اور اشاروں میں ان لوگوں سے باتیں کرتا رہا۔

کراکسلے نے برف میں لگی ہوئی شامپین منگوائی اور مارگرٹ نے بھی ہمت کر کے آدھا گلاس بھر لیا۔

کراکسلے نے نعیم سے کہا۔ "اب تک تمہارے دوست نہیں آئے۔"

نعیم نے کہا۔ "تعجب ہے!"

کراکسلے نے کہا۔ "ننھی بچی! مسٹر حسن سے میں اتنا بے تکلف ہو گیا ہوں گویا ہم بچپن کے دوست

ہیں۔وہ برا نہیں مانیں گے۔"

نعیم نے کہا۔عجیب بات ہے۔یہی میں نے بھی محسوس کیا گویا بچپن کے دوست ہیں۔" جاپانی مصور اشاروں سے ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی میں ایلس کو کچھ سمجھا رہا تھا اور وہ سرپرستی کے انداز میں مسکرا رہی تھی اور "وی وی" (ہاں۔ہاں) کہہ رہی تھی۔

اتنے میں ہروشا دروازے کے قریب نمودار ہوا۔اور اس کے ساتھ۔۔۔جیسے مداری اپنے ٹوکرے سے کوئی انتہائی غیر متوقع چیز نکالے۔۔۔"گل سرخ" میری پاول تھی۔

(۵)

وہ اس طرح نہیں آئی جیسے کوئی شہزادی آتی ہے۔حالانکہ اس کا حسن شہزادیوں کا سا تھا۔اس کی رفتار، اس کے لباس، اس کے بالوں کی تراش، ہر بات سے سادگی اور بے پروائی ظاہر ہوتی تھی۔سرخی یا غازے کا نشان تک اس کے چہرے پر نہ تھا۔اشتمالیت اور روئے زیبا دونوں غازے کی مدد سے بے نیاز ہیں۔بہت سے لوگوں نے اس کی طرف دیکھا۔دو تین نے شاید اپنے ساتھیوں سے آہستہ سے کہا بھی۔"خوبصورت"۔

سب سے پہلے نعیم اٹھ کے کھڑا ہو گیا، اور پھر کرا کسلے۔کرا کسلے نے بے تکلفی سے "ہلو۔میری!" کہا، غالباً وہ بھی عرصے سے میری کو جانتا تھا۔بہت جلد معلوم ہو گیا کہ کئی سال سے دونوں ایک دوسرے سے واقف ہیں۔ ایک مشفقانہ مسکراہٹ سے میری پاول نے نعیم اور ایلس کو سلام کیا اور بے تکلفی سے مارگرٹ سے پوچھا کہ کیسی ہو۔اور پھر اسی سادگی سے اس کرسی پر بیٹھ گئی جو اس کے لیے کرا کسلے نے بڑھائی تھی۔اس کے بعد نعیم نے ہروشا کا کرا کسلے، اس کی بہن اور جاپانی مصور سے تعارف کرایا۔

میری نے نعیم سے چائے پر نہ آنے کی معافی چاہی۔"میں بالکل بھول گئی۔" "ایلس کے چہرے پر ناراضی اور طنز کی خفیف سی جھلک نمودار ہو کے پھر غائب ہو گئی۔اس نے سگریٹ نکالا۔نعیم نے جلایا۔اس اثنا میں میری، کرا کسلے سے باتیں کر رہی تھی۔

ہروشا: (نعیم سے) "کھیل کیسا تھا؟"

نعیم: یونہی سا تھا۔تم کیا کرتے رہے؟"

"میں طلبا کے اشتراکی کلب گیا۔۔۔تمہارے ساتھ کھانا کھانے کے بعد۔۔۔وہاں میری ملی۔میں نے مسٹر کرا کسلے کا اور تمہارا ذکر کیا۔اور وہ یہاں ساتھ چلی آئی۔"

کرا کسلے: "چیکوسلواکیہ کے گلچیں بڑے غضب کے ہوتے ہیں۔آدھی رات کو گل سرخ کو ساتھ لانا انہی کا کام ہے۔"

ایلس بھی اور سب کے ساتھ جھوٹ موٹ مسکرائی۔

پھر اس نے نعیم کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا۔اس اثنا میں جاپانی آرٹسٹ یہ دیکھ کر کہ میری پاول کی ضو سے ایلس کی روشنی ماند پڑ چکی ہے، اس کو مخاطب کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔لیکن چونکہ وہ برابر کرا کسلے سے باتیں کرنے میں مصروف تھی۔اس لیے اس نے ہروشا ہی کو مخاطب کرنا غنیمت سمجھا۔

رات گذرتی گئی۔سب بہت خوش تھے۔آہستہ آہستہ شراب چلتی رہی۔عورتیں بیچ بیچ میں کوئی ہلکی چیز پی لیتیں۔اور سب ہی مباحث پر گفتگو ہوئی۔ہیگل، اور فائر باخ، بسمارک اور مسارک، مزدان اور ستیا گرہ۔آئیندہ جنگ اور ہسپانیہ میں خانہ جنگی کا آغاز۔

یہاں تک کہ "دوم" کی گنبد نما چھت کے شیشوں پر طلوع سحر کی بھوری روشنی نمودار ہوئی۔دوسرا دن شروع ہو رہا تھا۔دوسرے دن ہروشا کے سوا ان سب میں سے اور کوئی یونی ورسٹی نہ گیا۔

ساتواں باب

عشق تقسیم

خدائے عشق اس زمانے میں نعیم کے دل میں تین مورتیں بنا رہا تھا۔ عجب بات ہے کہ ایک میان میں دو تلواریں نہیں سماتیں، ایک اقلیم میں دو بادشاہ نہیں سماتے مگر ایک بت کدے میں کئی کئی صنم سما جاتے ہیں۔ کفر ہمیشہ جمہوریت پسند رہا ہے۔ تین مورتیں نعیم کے دل میں بھی اُبھر رہی تھیں۔

اکثر وہ تصویر خانہ لوور جایا کرتا تھا۔ وہاں مونالسا کی تصویر تھی۔ اسے یاد تھا کہ پہلی مرتبہ یہ تصویر دیکھ کے اسے مایوسی ہوئی تھی۔ اس اصل تصویر سے تو نقلیں ہی اچھی معلوم ہوتی تھیں۔ لیکن مونالسا اسے بلقیس کی یاد دلاتی تھی۔ چاند اور مونالسا دونوں گویا رمز تھے جو بلقیس کی طرف اشارہ کرتے تھے۔

لیکن جب وہ لوور جاتا اکثر گھنٹہ گھنٹہ بھر شکستہ دست زہرہ (زہرۂ میلو) کا مجسمہ دیکھتا رہتا۔ قدرت کو چاہئے کہ جب وہ مکمل عورت بنانا چاہے تو اس مجسمہ کی نقل کرے۔ اور رفتہ رفتہ نعیم پر منکشف ہونے لگا کہ اسے شکستہ دست زہرہ سے کیوں اس قدر اُنس ہے۔ ایک دن وہ مسلسل ڈیڑھ گھنٹہ اس مجسمہ کو دور ہی سے مختلف زاویوں سے دیکھتا رہا۔ کیونکہ نزدیک سے تو مجسمہ ذہن پر حاوی ہونے لگتا۔ اس دن اس پر منکشف ہوا کہ یہ مجسمہ میری پاول 'گلِ سُرخ' کا رمز ہے۔ یہ بات نہیں تھی کہ اس مجسمہ میں اور 'گلِ سُرخ' میں کوئی مشابہت تھی۔ رمز اور مشابہت میں بڑا فرق ہے۔ رمز اگر تصویر بن جائے تو اس کی شانِ رمزیت جاتی رہتی ہے۔

کوئی مجسمہ یا کوئی تصویر ایلس کا رمز نہ بنی تھی۔ ایلس کلاڈل کی حیثیت ابتدا میں بالکل تفریحی تھی۔ جیسے سنیما کی ایکٹرسوں کی تصویریں۔ وہ امریکہ سے آئی تھی اور امریکہ چلی جائے گی۔ امریکہ سے آنے والی لڑکیوں کے چہرے اکثر ایک دوسرے سے ایسے مشابہ معلوم ہوتے کہ نعیم کو حیرت ہوتی۔ یہ غازہ وسُرخی کا تصرف و اعجاز تھا۔

میری پاول کی عمر اس وقت پچیس سال کی ہوگی۔ لیکن دیکھنے میں وہ کسی طرح بیس سے زیادہ معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اس کی صورت سے بڑا بھولا پن ٹپکتا تھا، اور ہر طرح کی سادگی کے ساتھ جب وہ اپنی ذہنی قوت سے پورے مجمعوں کو دم بخود کر دیتی، تب اس کی متضاد طاقت کا پتہ چلتا۔ حسن کی طاقت اور شخصیت کی طاقت کا یہ تضاد ہی اس کشش کا باعث تھا جو ہزاروں نوجوان محسوس کرتے۔ نعیم کی حسن پرست طبیعت پر زیادہ تر اثر اس کے حسن کا تھا یا اس کی شخصیت کا۔۔۔ یہ کہنا بہت مشکل ہے۔ غالباً دونوں کششیں ایسی تھیں کہ ان میں امتیاز مشکل تھا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کشش کا رجحان عشق کے مقابل دوستی کی طرف زیادہ تھا۔ ذہنی دوستی جس میں بوس و کنار کی چاشنی شامل ہو۔ لیکن یہ رجحان ابھی نعیم کے دماغ میں بہت غیر ارتقا یافتہ اور خلط ملط سا تھا۔

یہی زمانہ ہسپانوی خانہ جنگی کی ابتدا کا تھا۔ ہسپانوی سوشلسٹ ابھی کلیساؤں پر ہتھوڑے اور درانتی کی شکلیں ہی اتار رہے تھے کہ فاشسٹوں نے ہاتھ مارا۔ ہٹلر اور لیوڈن ڈروف نے سالہا سال پہلے اس قسم کی کوشش کی تھی اور ہار گئے تھے۔ یہاں تک کہ ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۳ء میں خود وائمار جمہوریت کے نظام نے جس کی چول چول ڈھیلی ہو چکی تھی ہٹلر کو مسندِ حکومت پر لا بٹھایا۔ مگر ہسپانیہ میں ایسے کسی ارتقا کی امید نہ تھی۔ ملک کا رجحان دن بدن اشتمالیت اور اشتراکیت کی طرف بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ فرانس میں ''محاذِ عام'' کی حکومت تھی اگرچہ اسے ابھی بہت کچھ رنگ بدلنے تھے۔ جنرل فرانکو کو ابتدا میں بڑی کامیابیاں ہوئیں۔ پھر حکومت نے بہت سے شہر چھین لیے اور اس کے بعد طویل خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ مراکو بربری مسلمان جو کبھی فاتح بن کے آئے تھے، اب فرانکو کے سپاہی بن کے آئے۔ جمہوریہ ہسپانیہ نے جو عدل و مساوات کے لیے لڑ رہی تھی، اس کے تحفظ میں 'القصر' کا تاریخی قلعہ اُڑا دیا۔ اسی خانہ جنگی کے زمانے میں اشتمالی دنیا میں ایک ہسپانوی عورت مشہور ہونے لگی جسے ہسپانوی فردیت (شولری) نے ''لا پاسیونارا'' (گلِ صلیبی) کا لقب دے رکھا تھا۔

پیرس میں اشتراکی ہمدردی رکھنے والے طلبا کے طبقے میں شروع ہی سے ہسپانوی ''گل صلیبی'' کے کارناموں کا یہ اثر ہوا کہ ''گل سُرخ'' میری پاول کی قدرت بہت بڑھ گئی ۔۔۔ ''گل صلیبی'' اُدھیڑ تھی اور ''گل سُرخ'' نوجوان ۔ وہ دور تھی اور یہ نزدیک اور دونوں ایک ہی مقصد کے لیے لڑ رہی تھیں ۔ میری پاول نے اس زمانے میں ہسپانیہ کے ''بین الاقوامی'' بریگیڈ کے لیے اپنے نوجوان دوستوں کو بھرتی کرانا شروع کیا ۔ اس کے بالوں کی چمک، اس کی زبان کے زور، اس کی شخصیت کے اثر سے بہت سے انگریز اور فرانسیسی، یہودی اور سلاف اسپین جانے لگے کہ ظلم و جبر کی فاشسٹی قوت کے خلاف جہاد کریں ۔ بہت سی لڑکیاں نرسیں بن کے گئیں ۔ ایک ہونہار شاعر نے پیرس میں میری پاول کے لبوں کا بوسہ لیا اور ہسپانیہ میں محاذِ جنگ پر جان دی اور اپنی نظموں کا چھوٹا سا مجموعہ میری پاول کے نام معنون کر گیا ۔

ہروشا اور کرا کیلے کے ساتھ نعیم کو کئی بار میری پاول سے ملنے کا موقع ملا ۔ لیکن وہ اپنی سیاسی اور تبلیغی جدوجہد میں اس قدر مصروف تھی کہ نعیم اسے کہیں تنہا دعو کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا ۔ وہ بار بار وعدہ کرتی اور اکثر نعیم کو ایک لفافہ میں ایک چھوٹا سا کارڈ ملتا جس پر ایک طرف ''میری پاول ۔ جامعہ پیرس'' چھپا ہوتا، اور دوسری طرف جلدی میں پنسل سے لکھی ہوئی ایک آدھ سطر، جس کا مضمون عموماً یہ ہوتا، معاف کرنا میں نہ آسکوں گی ۔ کل ملاقات ہوئی تو پھر کبھی وقت مقرر کریں گے ۔ آج تو میرا آنا ممکن نہیں'' وہ اس بے تکلفی سے ساتھ کھانا کھانے، یا کسی میوزیم کو دیکھنے یا کسی جلسے میں جانے یا کسی قہوہ خانے میں ملنے کا وعدہ کرتی کہ اس آسانی اقرار پر ہی نعیم کو بے اطمینانی ہونے لگتی کہ یہ وعدہ پورا نہ ہوگا ۔

اور چونکہ میری پاول سے تنہا ملنے کا ہر موقع اسی طرح نکل جاتا ۔ اس لیے نعیم کے لیے اس کی کشش بڑھتی ہی گئی ۔ شانِ نارسائی ہی سے عشق پیدا ہوتا ہے ۔ لیکن نعیم کو اپنے جذبات کا کوئی اندازہ نہ تھا کہ یہ محض خواہش ہے یا شوق ہے یا شوقِ فضول ہے یا اُنس ہے، محبت ہے ۔ عشق تو یہ ہرگز نہ تھا ۔

ایک دن ہروشا نے میری پاول کا ذکر کرتے ہوئے کہا ۔ پچیس سال کی عمر میں بھی اس کے چہرے پر وہی بچپن کا بھولا پن ہے ۔ وہ ان چند عورتوں میں سے ہے جن کے حسن پر سالہا سال تک زمانے کی دست برد کا اثر نہیں ہوتا ۔ ان کا جوش ان کو جوان رکھتا ہے ۔ لیکن جب وہ تھک جاتی ہیں تو ایک ہی دن میں بوڑھی ہو جاتی ہیں ۔''

ہروشا کو عورتوں سے کچھ ایسا بغض تھا کہ اس کے اکثر جملے نعیم کو متبسم کر دیتے ۔ لیکن اس کی یہ رائے بڑی سچ معلوم ہوئی ۔ میری پاول کی کشش کا سارا راز اس کے شباب کی ابتدائی تازگی تھی اور یہ تازگی ہر چیز میں موجود تھی ۔ صورت میں، سیرت میں، شخصیت میں اور عمل میں ۔

جس ضعیف کے ہاتھ میں عصا نہیں ہوتا وہ دیوار کے سہارے سہارے چلتا ہے ۔ ایلس کلاڈل کی جسمانی قربت ایسا ہی سہارا تھی ۔ نعیم منزلِ وصل سے اب بھی بہت دور تھا ۔ صورت محض دوستی کی تھی ۔ ایک اجنبی اور مسافر مرد اور ایک غریب الوطن تنہا اور تنہائی پسند لڑکی کی دوستی مگر اس دوستی میں خودداری اور راستی تھی ۔ وہ اس قدر جلد نعیم سے مانوس ہوگئی تھی کہ یاد کر کر کے خود نعیم کو حیرت معلوم ہوتی تھی ۔ نعیم کی آرزوئے وصل میں بہت بے تابی سہی مگر سطحی ہم آغوشی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا ۔ رفتہ رفتہ وہ اس کا عادی ہونے لگا تھا ۔ ایلس کے طرزِ عمل میں ایک 'انسانیت' تھی جس نے بہت جلد نعیم کے دل میں گھر کر لیا ۔ مرد اور عورت کا بے غرض اُنس، بے غرض رفاقت اور ہمدردی ۔ یہ وہ خصوصیت تھی جس کی ایلس کے سوا بہت کم عورتوں سے اسے توقع ہو سکتی تھی ۔

بلقیس دُور تھی اور میری کمیاب ۔ لیکن ایلس سے ملنے کا اسے روز موقع ملتا تھا ۔

بلقیس کی یاد بھی آتی ۔ کبھی بالکل سطحی سی، غیر اہم سی یاد، کبھی دل کو تڑپا دینے والی یاد ۔ مثلاً کبھی رات کے تین بجے آنکھ کھل جاتی تو بلقیس پہروں یاد آتی اور تصورات اور تخیلات کے محل کھڑے ہو جاتے ۔ اکثر وہ حسرت کا یہ شعر پڑھتا ؎

نہیں آتی جو یاد ان کی تو برسوں تک نہیں آتی!
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں!

اکثر وہ نیم بیداری یا بیداری میں بلقیس کے خواب دیکھتا ۔ خطۂ جنت نشان وجہنم نشان یعنی سرزمین ہندوستان کو واپسی اور شادی ۔ شادی کی رات، بند کمرے میں تین صوفے اور ایک پلنگ ۔ معلوم نہیں کیوں ۔ مگر تین صوفے اور ایک پلنگ، اور بلقیس کے ہنستے ہوئے ہونٹ اور بکھرتے ہوئے بال ۔

۔۔۔ لیکن پھر صبح کو ۔ اس کا تخیل دوسری صبح کا اندازہ کبھی نہ لگا سکتا جیسے مادموزیل دموپاں کی ہم آغوشی کے بعد گا تیر کا امیر شاعرانہ تخیل ٹھٹک کر ٹھہر گیا ۔ اور اس نے تمت کا پردہ ڈال دیا؟ متاہل زندگی کا

دن تو بڑا طویل ہوتا ہے اور اس کی دو پہر بڑی کڑوی ہوتی ہے۔ اس سوال کا جواب دینے سے اس کا ذہن گریز کرتا۔

خانم کے خط کم آنے لگے تھے۔ ایک دن نعیم نہا کے صبح سویرے چائے پینے اترا تو اسے خانم کا ایک خط ملا۔ ساتھ ہی ایک خط داؤد کا بھی تھا۔

خانم کے خط کا مضمون یہ تھا:

عزیزی نعیم سلمہ!

تم تو ہم کو ایسا بھولے کہ کبھی کبھی جو خط لکھتے تھے وہ بھی چھوڑ دیا۔ خیر یہ لاپروائی تو جناب کی پرانی عادت ہے۔ معلوم ہوتا ہے وہاں خوب دل لگ گیا۔ کس کس سے دوستی ہوئی۔ ذرا ہمیں بھی تو وہاں کے حالات لکھئے۔ اب آپ تشریف کب لائیں گے، یہ تو لکھتے ہی نہیں۔ تمہارے چچا بھی پوچھ رہے تھے۔ ابھی شاید ایک آدھ سال باقی ہے۔ مگر بیچ ہی میں کیوں نہیں آجاتے۔ تعطیلات یہاں گذار کے پھر چلے جاؤ۔ بہت سے لوگ یہ کرتے ہیں۔ بلقیس اب ماشاء اللہ سینیئر میں ہے۔ اس سال پاس ہوجائے تو میں تو اسے بی اے تک پڑھاؤں گی۔ اس کے پیام بہت آرہے ہیں۔ ابھی سورت سے ایک بڑے زمیندار کا پیام آیا ہے۔ ان کے بہت سے کارخانے بھی ہیں۔ لاکھوں روپے بنک میں جمع ہیں مگر بوہرے ہیں۔ اس لیے تمہارے چچا نے منظور نہیں کیا۔ اب نصیر الدین صاحب کے لڑکے کا پیام آیا ہے۔ کانپور کے قریب اس کے کئی گاؤں ہیں۔ گورنمنٹ آف انڈیا میں ہزار روپیہ کے قریب تنخواہ ہے۔ یہاں دو تین دن سے بارش ہورہی ہے اور ذرا سردی ہے۔ بلقیس نے شکایت کی ہے کہ تم نے اس کے لیے جو کپڑے بھیجنے کو کہے تھے وہ ابھی تک نہیں بھیجے۔ اور سب خیریت ہے۔

تمہاری چچی

داؤد کے خط کا مضمون یہ تھا:

میاں نعیم سلمہ

تمہارا خط ملا۔ اگر صبح کا بھولا شام تک واپس آجائے تو اسے بھولا نہ کہنا چاہئے۔ میں حیدرآباد بھی گیا تھا۔ کل پھر وینگلور واپس آگیا ہوں سب جگہ ہر طرح خیریت ہے۔ مجھے اندیشہ ہے۔ جب تم حیدرآباد واپس آؤ تو شاید خانم کے یہاں تمہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے۔۔۔ میاں عادل نے اتنا

بھڑکایا ہے کہ اب بلقیس کی مرضی نہیں رہی۔ باقی خود سمجھ جاؤ۔

تم نے لکھا تھا۔ تعطیلات میں تم پیرس جا رہے ہو۔ شاید آج کل وہیں ہو۔ اچھا ہے میاں مزے کرو۔ ہم اس سڑے گلے تعلقہ میں تمہاری بھابی کے ساتھ دفن ہیں۔۔۔

خط کے بقیہ حصہ میں کوئی اور خاص بات نہ تھی۔

ان دو خطوں کے بعد نعیم پر ایک نفسیاتی جمود سا طاری ہونے لگا۔ ایلس کے غازہ و سُرخی ولباس سے مزین حسن اور میری کے جمالِ ذہنی وجسمانی کے اثر سے بلقیس کی مقناطیسیت یوں بھی مدھم پڑنے لگی تھی۔ اب گویا کسی نے اس کے دل کے اندر ہاتھ بڑھا کے قطب نما کو توڑ دیا۔ قوت احساس اور قوت مدرکہ نے معلوم نہیں کیوں اسے بلا کسی سبب اور وجہ کے سمجھانا شروع کیا کہ اب بلقیس اسے پسند نہیں کرتی۔ خانم بھی اس معاملے میں ڈھل مل ہو رہی ہیں۔ وہ اپنے خط میں اور سب کے مقابلے میں اسے ترجیح دے رہی ہیں لیکن جب اس سے نسبت ہوچکی ہے تو دوسرے پیاموں کے ذکر کے کیا معنی۔ خانم کی عادت شیخی خوری کی سہی لیکن پھر بھی۔

اگر میری کا تصور اور ایلس کی قرابت اسے بے پروا نہ بنا دیتی تو شاید اسے شدید ترین رنج ہوتا لیکن اسے خود تعجب ہوتا تھا کہ دل کی گہرائی میں رنج کا پتہ نہ تھا۔ رنج نہ تھا۔ ٹھیس البتہ لگی تھی۔ مگر دل کو نہیں، اس کے غرور خودداری اور جذبۂ خود پرستی کو۔

پھر اس کے دل پر انتقام کی ایک خواہش غلبہ پانے لگی۔ بلقیس یا خانم یا جو کوئی بھی اس نسبت کے کمزور کرنے کا ذمہ دار ہے اس کو بھی کچھ ذہنی سزا ملنی چاہئے۔ سزا کے لیے اس نے انتہائی عامیانہ طریقہ اختیار کیا اور یہ نہ سوچا کہ رشک اسی عورت کو ہوتا ہے جسے لگاؤ بھی ہوتا ہے۔ محبت کے بغیر رقابت کوئی معنی نہیں رکھتی اور اگر محبت نہ ہو اور کسی کو کوئی پسند نہ ہو تو اس کو کسی اور کے ہاتھوں میں جاتے دیکھ کے اُلٹا اطمینان ہوتا ہے۔ غلط ترین نفسیاتی اندازے قائم کر کے اس نے ایلس کی تصویریں، ایسی تصویریں جس میں ایلس سے اس کے اخلاص اور اختلاط کا اظہار ہوتا تھا، خانم کے خط کے جواب کے ساتھ خانم کو بھیجیں۔

یہ لکھنے کی کیا ضرورت ہے کہ خانم اور عاقل خاں پر ان کا کچھ اثر ہوا یا نہ ہوا ہو۔ بلقیس پر ان کا کچھ اثر نہ ہوا۔

میری اب نایاب تو نہ تھی مگر کمیاب ضرور تھی۔ اس لیے جب وہ سات سمندر جو ہندوستان اور یورپ کے درمیان ہیں بلند ہو کے سات پہاڑ بن گئے اور انہوں نے بلقیس کو اپنی اوٹ میں چھپالیا تو نعیم کا دل ایلس کی طرف پلٹا۔

نادانستہ طور پر دوستی کی سرحد اس وقت ختم ہوئی تھی اور محبت کی سرحد اس وقت شروع ہو گئی تھی جب اب سے ڈیڑھ ہفتہ پہلے زمین دوز ریل میں ''دوم'' جاتے ہوئے ایلس اس کے کندھے کا سہارا لگائے اُونگھ رہی تھی اور اسے بڑی بھلی معلوم ہو رہی تھی اور اس کے دل سے ہمدردی کی ایک لہر اُٹھی تھی اور ایلس کے پیلے پیلے بالوں پر چھا گئی تھی۔

اب تک نعیم کو خود اس کا پتہ نہ چلا تھا کہ وہ کس خطرناک طریقے پر ایلس کے قریب ہوتا چلا جارہا ہے۔ وہ ایلس کو ''محفوظ'' سمجھتا تھا۔ اس لیے کہ اس میں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ کوئی مجسمہ یا کوئی تصور اس کا ''رمز'' نہ بننے پایا تھا۔ اس میں گہرائی نہ تھی۔ اس میں خون کی نزدیکی نہ تھی جو بلقیس میں تھی۔ بلقیس کی طرح وہ اپنے ماحول میں ممتاز نہ تھی۔ میری کی طرح سینکڑوں نوجوان اس کی پرستش نہ کرتے تھے۔ اس میں کوئی خطرناک دلکشی نہ تھی۔ وہ دلکش ضرور تھی اور ہر لحاظ سے خوبصورت کہلانے کی مستحق مگر پیرس میں لاکھوں لڑکیاں اس جیسی ہوں گی۔

متوازی خطوط لامتناہی حد پر جا کے ملتے ہیں۔ لیکن متوازی خطوط کا ایک دوسرے کے پاس پاس ہونا ہی ملنے سے کیا کم ہے۔ متوازی خطوط میں ایک طرح کی رفاقت ہوتی ہے۔ اسی طرح کی رفاقت نعیم اور ایلس میں تھی۔ ایلس محض ایک سیدھی سادی، اچھی خاصی صورت شکل کی لڑکی تھی۔ خوش پوش مذاق لیکن متوسط طبقے اور متوسط ذہن کی۔ عام اوسط معیار کی لڑکی۔ اوسط عورت۔ نعیم میں بھی نوجوانی کی انانیت اور خود پسندی بہت تھی۔ وہ اپنے آپ کو جو کچھ سمجھتا ہو لیکن ایلس کی طرح اس میں بھی ''کوئی خاص بات'' نہ تھی۔ وہ بھی متوسط طبقے کا، اوسط مذاق اور اوسط ذہن کا نوجوان تھا۔ اوسط مرد۔

حیاتی اُصولِ انتخاب نے ان دونوں کو مساوی قرار دیا تھا۔

ایک نوجوان مرد اور ایک نوجوان عورت کا اگر زیادہ ساتھ رہے تو انس ہو ہی جاتا ہے۔ قریب قریب روز شام کو نعیم، ایلس کو لے کے کسی تھیٹر یا تماشے جاتا اگرچہ دونوں کو ملے اور یوں ساتھ ساتھ جاتے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا — یہ سب پندرہ دن کے اندر کے واقعات ہیں — لیکن وقت کی قیمت اور اہمیت کا وقت کی مقدار سے بہت کم تعلق ہوتا ہے۔ ہر دن جو گزرتا اس میں نعیم اور ایلس ایک دوسرے سے قریب ہوتے جاتے اور ہر دوسرا کبھی نعیم کی بدمذاقی پر احتجاج کرتا۔ ایک عورت کے ساتھ دن کے چار پانچ گھنٹے ضائع کرنا کیا معنی؟

بہت جلد نعیم کو محسوس ہونے لگا کہ وہ صبح ہی سے سہ پہر کا منتظر رہتا ہے، جب ایلس کے ساتھ کا وقت آئے گا، اس کو کہیں ساتھ لے جانے کا وقت آئے گا۔ اور پھر اسے یہ محسوس ہونے لگا کہ ایلس اس کے لیے کتنی ضروری ہوتی جارہی ہے۔ جب وہ ہنستی ہے تو اس کے سُرخ سُرخ ہونٹوں میں اس کے دانت کتنے بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ چمکتے ہوئے ہموار سفید دانت، اور اس کے ہونٹ کتنے پیارے ہیں اور اس کا گول چہرہ اور اس کے پیلے پیلے بال اور اس کی سخت چھاتیاں۔

اس کا دل نرم ہونے لگا۔ ایک ایسی نرمی جو اس نے اب تک کسی عورت کے لیے محسوس نہیں کی تھی، وہ ایلس کے لیے محسوس کرنے لگا۔ اسے بات بات کا خیال رہنے لگا۔ اگر رات زیادہ آ گئی ہے اور دونوں کھلی سڑکوں پر ہیں تو اس کا خیال کہ کہیں ایلس کو سردی نہ لگ جائے۔ اگر وہ زیادہ پیدل چلی ہے تو یہ خیال کہ کہیں تھک نہ جائے۔ جس دن اس کی طبیعت کسل مند ہوتی، نعیم اس سے زیادہ پست ہو جاتا۔

اب تک ہزاروں بار وہ ایلس کے بوسے لے چکا تھا۔ لیکن ان بوسوں میں کوئی خاص کیفیت نہ تھی۔ جیسے اور کسی لڑکی کے بوسے لیے جائیں۔ جیسے ان تمام لڑکیوں کے بوسے جو اس نے اب تک لیے تھے۔ مگر اب جب وہ ایلس کا بوسہ لیتا تو معلوم ہوتا کہ اس کا دل اس کے ہونٹوں میں آ گیا ہے۔ معلوم ہوتا کہ جتنی لذت اس ایک بوسے میں ہے اتنی لذت اور کسی چیز میں نہیں اور ایلس کی انگلیوں کے ناخن تک اسے عزیز معلوم ہوتے۔

اسے ایلس کی قدر بھی معلوم ہونے لگی تھی۔ ایلس کی ''وفاداری'' کی کوئی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ جب سے ایلس پیرس آئی تھی شاید ہی وہ کسی نوجوان کے ساتھ اِدھر اُدھر گئی ہو۔ یہ کوئی انوکھی

بات نہیں۔ اس کی ملاقاتیوں میں بہت سی لڑکیاں وقتِ واحد میں "ایک ہی لڑکے" سے دوستی رکھنا مناسب سمجھتی تھیں۔ خصوصاً خاموش طبیعت کی لڑکیاں، سنجیدہ لڑکیاں۔ ایلس نے بھی اگر کسی اور سے دوستی نہ کی تھی تو کوئی خاص بات نہ تھی۔ لیکن یہ کیا کم تھا کہ ایلس نے اس سے دوستی کی تھی۔ اس کو انتخاب کیا تھا اور پھر اس وفاداری سے۔۔۔ اسے ایلس سے مل کے ابھی دو ہفتے بھی نہیں ہوئے تھے۔۔۔ وہ انتخاب پر قائم تھی۔

اب تک ایلس کے آخری انکار سے اسے سخت ترین جسمانی اور اکثر ذہنی اذیت ہوتی تھی۔ وہ اسے حد سے متجاوز ہونے نہ دیتی تھی۔ اب نعیم اس کے اس انکارِ وصل کی وجہ سے اس کی اور عزت کرنے لگا تھا۔ اسے یقین ہونے لگا کہ وہ دوشیزہ ہے۔ وہ ابھی تک "خراب" نہیں ہوئی۔ اسے اپنی عصمت اس قدر عزیز ہے۔ اب ایلس کے خوانِ محبت سے اسے جو کچھ مل جاتا، وہ کتنا ہی ناکافی کیوں نہ ہوتا، وہ اسی پر راضی تھا۔ اب وہ اس کی عزت اور اس کا احترام کرنے لگا تھا۔

پھر بھی جب رات کو اسے اس کے بورڈنگ ہاؤس پہنچا کے دروازے پر شب بخیر کہتے ہوئے وہ اس کو لپٹاتا۔ جب دونوں کے جسم ایک دوسرے کو والہانہ خلوص سے بھینچتے اور دونوں کے لب مل جاتے تو وہ مُلحد جو نعیم کے خمیر میں تھا پکار اُٹھتا کہ اکثر مذاہب میں جنت کا تصور کتنا ناقص ہے۔

(۴)

لاسورس میں بیٹھے بیٹھے ذرا سرور کے عالم میں ہروشا نے کہا۔ "جو خواتین آج اس میز پر موجود ہیں، وہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ مگر میری اب بھی یہی رائے ہے۔"

"عورتوں سے آپ کو اگر اتنی نفرت ہے تو پھر آپ ہم لوگوں کے ساتھ کیوں پھرتے ہیں؟" ایلس نے پوچھا۔

کراکسلے نے ہروشا کی طرف سے جواب دیا۔ "زرتشت کا ایک باغ۔۔۔ یا ایک وادی۔۔۔ بہر حال کسی جگہ گذر ہوا، جہاں لڑکیاں رقص کر رہی تھیں۔ انہوں نے زرتشت کو بلایا کہ آئے اور ان کے ساتھ ناچے۔ وہ گیا اور ان کے ساتھ ناچا۔ مگر پھر اپنی راہ چل دیا۔۔۔"

نعیم نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے کسی نے زیدنک کو بڑا دھوکا دیا ہے۔"

"ہمیں سناؤ تو سہی۔" میری پاول نے کہا۔

"اس کے بال سنہرے تھے؟" ایلس نے چھیڑنے کے لیے کہا۔

"یا کالے؟" میری پاول نے جملے کی تکمیل کی۔

"ہاں اگر ہم لوگوں کو تم ضرورت سے زیادہ متجسس نہیں سمجھتے تو سناؤ۔"

"اب تک مجھے صرف ایک سے محبت ہوئی ہے۔ لیکن اب وہ محبت بھی کم ہو رہی ہے۔ ایک دوسری محبت اس کی جگہ لے رہی ہے۔۔۔" یہ کہہ کے ہروشا ذرا ٹھہرا۔

دونوں لڑکیوں نے میز پر اپنی کہنیاں ٹیکیں اور ہتھیلیوں پر اپنی ٹھڈیاں رکھ دیں۔ دونوں نے ایک دوسری کی طرف شرارت سے دیکھا اور پھر ہروشا کے اعتراف کا انتظار کرنے لگیں۔

ہروشا نے کہنا شروع کیا۔ "اب سے چودہ سو سال پہلے وہ راستہ بھٹک کے بوہیما پہنچی۔ اب سے گیارہ سو سال پہلے اسے معلوم ہوا کہ یروشلم میں ایک شخص کو انسانوں سے محبت کے جرم میں سُولی پر چڑھا یا گیا، جب سے اسے اس شخص سے عقیدت ہوگئی —— یہاں میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ یہ میرا عقیدہ نہیں۔۔۔"

"ہاں۔ پھر کیا ہوا؟" میری پاول نے شرارت اور اشتیاق سے پوچھا۔

"جس مکان میں وہ رہتی تھی اس کے مغرب میں ایک بڑی سی چٹان کے پیچھے ایک موٹا لیم شیم جرمن رہتا تھا جو اڈالف ہٹلر کے پردادا کا رشتے کا بھائی تھا۔ وہ اکثر اندھیری رات کو کھڑکی کے راستے یا دیواریں پھاند پھاند کے اس مکان میں گھس آتا اور۔۔۔"

"اور ظاہر ہے تمہاری محبوبہ کو اس موٹے، بیئر پینے والے جرمن سے نفرت تھی؟" میری پاول نے کہا۔

"ظاہر ہے۔ مگر وہ گھر میں اکیلی رہتی۔ اس زمانے میں یہ اس جرمن کے حرم میں داخل ہوئی۔ جب کہ ہارون الرشید بغداد کے بازاروں میں چھپ چھپ کے گشت لگایا کرتا تھا۔"

"اور جب اس نے تمہارے جرمن کو تحفہ میں ایک ہاتھی بھیجا تھا۔" میری پاول نے کہا۔

"یہ آخر تم دونوں کو کیا ہو گیا ہے؟" ایلس نے کہا، جو ان عجیب و غریب باتوں کو ذرا حیرت اور پریشانی سے سُن رہی تھی۔

''صبر، صبر، پیاری صبر۔'' میری پاول نے ایلس سے کہا۔

نعیم جو اس قصے کو کچھ کچھ سمجھ رہا تھا۔ اس نے محض ایلس کی خاطر کہا۔ ''سنتی جاؤ ایلس، ہروشا پر ذرا سرور کا اثر ہے۔''

''ہاں۔ ہروشا پھر؟'' کراکسلے نے کہا۔

''پھر مسٹر کراکسلے یہ ہوا کہ میری محبوبہ کو بھی اس جرمن سے نفرت۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ اس جزیرے میں ہندوستان کے جنوب میں ہے۔۔۔۔''

''سیلون!''

''نہیں جی، سسلی۔ اس جزیرے میں ایک جرمن نے ہارون الرشید کے نکالے ہوئے درباریوں سے حرم کے آداب سیکھے اور ذرا ذرا روشن خیالی سیکھی۔''

''اس سسلی والے جرمن کا نام فریڈرک تو نہیں تھا؟'' میری نے سوال کیا۔

''ہاں۔ تم کو کیسے معلوم ہوا؟''

''فریڈرک ثانی۔'' میری نے مصنوعی فتح مندی کے انداز میں کہا۔

کراکسلے نے کہا۔ ''وہ بھی کیا زمانہ تھا۔ لوگ مشرق سے تہذیب سیکھتے تھے اور نتیجے کے طور پر نشاۃ ثانیہ ظہور میں آیا۔ اب مسٹر نعیم حسن مغرب میں تہذیب سیکھ رہے ہیں اور دوسری عالمگیر جنگ کے ظہور میں آنے کی توقع ہے۔''

اب ایلس بھی ذرا دلچسپی سے ہروشا کی داستان سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''خیر تو اس سسلی والے جرمن نے میری محبوبہ کو اندر ہی رکھا۔ مگر ذرا آزادی دی اور عورتوں کا تو یہ خاصا ہے کہ ذرا آزادی ملی اور وہ اپنے جامے سے باہر۔ میری محبوبہ نے بھی ہاتھ پاؤں پھیلانے شروع کیے۔ یہاں تک کہ جرمن کے حرم کی کئی بیگمات کو اپنی کنیزیں بنا کے اپنے مکان میں رکھ لیا۔ اس پر وی آنا والے جرمن کو غصہ آیا۔۔۔۔''

''روڈولف فان ہاپس برگ؟'' میری نے کہا۔

''ہاں رُوڈی۔ اس نے پہلے تو میری محبوبہ کے گھر میں نقب لگائی اور تمام کنیزوں کو جو کوٹھریوں میں بند تھیں اُڑا لے گیا۔ اس نے میری محبوبہ کی بھی بے عزتی کرنا چاہی مگر وہ کسی طرح اس کے ساتھ راضی نہ

ہوئی اس نے ایک اور جرمن سے اس کی شادی کرا دی اور وہ جرمن خانہ داماد ہو کے اسی مکان میں رہ پڑا۔۔۔۔''

''دین سس لاس؟'' میری نے جلدی سے کہا۔

''ہاں دین سس لاس۔ اس نے میری محبوبہ کو پڑھایا لکھایا اور جب وہ یروشلم کے سُولی پانے والے کی محبت میں سچ بولی تو اسے جلایا گیا اور پھر ایک اور جرمن نے اس کے شوہر ہونے کا دعویٰ کیا۔ وہ اندھی مگر لڑتی رہی۔۔۔۔''

''اندھی تھی۔۔۔۔یعنی جان زیز کا؟''

''ہاں وہ جان زیز کا بن کے اندھی ہوئی مگر حسن کی چتا نے اسے جو آنکھیں دی تھیں وہ نہیں پھوٹی تھیں۔ کچھ دن اسے چین بھی ملا اور وہ چھوٹے چھوٹے مکان اور تصویریں بنواتی رہی۔ یہاں تک کہ وی آنا کے ایک جرمن نے اسے جھانسہ دیا، اس سے شادی کر لی۔ اس کی اور بھی سوکنیں تھیں۔۔۔۔''

''مثلاً ہنگری؟'' میری نے کہا۔

''چار سو سال اس کا یہ شوہر زندہ رہا اور اسے ایک دن راحت نہ ملی۔ میں آپ لوگوں سے کیا کہوں کہ اس سہاگ کے زمانے میں اس کا گھر کیسا جہنم تھا۔ اٹھارویں صدی میں اس کے جرمن شوہر نے عورت کا روپ بدلا اور عورت بن کے اپنی بیویوں کی آزادی کے خواہش سے ایسا چڑنے لگا کہ اس نے میری محبوبہ کو دن رات نقاب پہننے کا حکم دیا۔ اب تو جرمن راتوں کو اسے اپنے کمرے میں سُلاتا لیکن ۔۔۔خواتین مجھے معاف فرمائیں۔۔۔۔لیکن اپنے بستر پر نہیں۔ سرد پتھر کے فرش پر۔۔۔۔''

جب جرمن نے اپنا روپ بدلا اور عورت بنا تو اس کا نام میریا تھریسا تو نہیں تھا؟''

''ہاں۔ مگر پھر انیسویں صدی آئی۔ وہ بھی کیا صدی تھی۔ اس کی قدر انگریزوں سے پوچھو۔ کیوں جیمز اس صدی میں میریا تھریسا کی ایک لڑکی اور اس کے شوہر سے پیرس کے شہری اتنے ناراض ہوئے کہ انہوں نے ایک قید خانہ توڑ ڈالا۔ یہ خبر ہوتے ہوتے ہمارے وی آنا والے جرمن کے حرم میں پھیلی۔ پیرس زنانہ فیشن کا مرکز ہے۔ عورتوں کی ہر فیشن کی ابتدا یہیں سے ہوئی ہے۔ میری محبوبہ کو بھی اس فیشن کا شوق ہوا۔ پھر اس نے طلاق کی کوششوں میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا اور ۱۹۱۸ء میں جب اس کے بوڑھے شوہر نے گھائل ہو کے دم توڑ دیا تو میری محبوبہ نے نوجوان قحبہ کی طرح اپنا نقاب ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور

اپنے شوہر کے گھر سے بھاگ کے پھر اپنے گھر میں رہنے لگی۔ خدا نے اسے پھر سے جوانی دی۔ اب اس کی عمر اٹھارہ سال کی ہے۔''

میں نے اسے دیکھا ہے اور میں جانتی ہوں کہ وہ کتنی حسین ہے۔۔۔'' میری نے کہا۔

''خوب۔ خوب۔ زیدنک بڑی دلچسپ داستان تھی۔'' کراسکلے نے کہا۔

''ہم سب ہروشا کی محبوبہ چیکوسلواکیہ کا جام صحت پئیں۔'' نعیم نے کہا۔

''مگر اب تمہاری نئی محبوبہ کون ہے؟'' ایلس نے پوچھا۔

''میں بتائے دیتا ہوں۔'' یہ کہہ کر جیمز کراسکلے نے ''پیری سوار'' (شام پیرس) کا تازہ پرچہ اٹھایا جو وہیں میز پر پڑا تھا۔ اس میں اسٹالن کی تصویر تھی۔ کراسکلے نے پنسل سے تصویر کو لہنگا پہنا دیا۔ اور پرچہ ایلس کی طرف بڑھایا اور کہا۔ ''یہ ہے ہروشا کی نئی محبوبہ!''

ایلس نے اس کی تعریف پھر اسی امریکی لفظ سے کی جس کا ترجمہ ناممکن ہے۔'' کیوٹ!''

''مگر تمہیں کسی چیک کی عورت سے محبت کیوں نہیں ہوئی؟'' نعیم نے اصرار سے پوچھا۔

''چیک لڑکیاں تو بڑی جمیل ہوتی ہیں۔ خصوصاً دیہاتوں میں اپنے قومی لباس میں۔ میں تو گھنٹوں ان کے لباس کو دیکھا کرتی تھی۔'' میری پاول نے کہا۔

ہروشا نے جواب دیا۔ ''معلوم نہیں کیوں۔ مگر ساتھ بیٹھ کے ہنسنے بولنے کے سوا مجھے عورتوں سے زیادہ دلچسپی نہیں۔''

کراسکلے نے کہا۔ ''اس کی وجہ خدا کو معلوم ہوگی یا فرائڈ کو۔ خدا کا شکر ہے، مجھے تو اس وقت میری اور ایلس بڑی خوبصورت معلوم ہو رہی ہیں۔ کیوں نعیم؟''

اور نعیم نے کہا۔ ''بے شک'' دونوں لڑکیاں مسکرائیں۔

(۵)

اسی رات کو نعیم ایلس کو اس کے بورڈنگ ہاؤس پہنچا کے واپس آیا ہی تھا کہ خادمہ نے اسے اطلاع دی، کوئی ٹیلیفون پر اس سے بات کرنا چاہتا ہے۔

اس نے نیچے اتر کے ریسیور اٹھا کے کہا۔ ''ہلو!''

''پیارے۔ میں ایلس ہوں۔''

''کیا ہے ایلس ڈارلنگ؟''

''کل دس بجے میں جنیوا جا رہی ہوں۔''

''کیا؟''

''کل دس بجے میں جنیوا جا رہی ہوں۔ مجھے ابھی ابھی تار ملا ہے۔ میرے چچا وہاں آئے ہیں۔''

''کون؟''

''میرے چچا۔ وہی جو، ترکی میں۔۔۔ کونسل تھے۔ وہ واپس جا رہے ہیں۔ میں ان سے ملنے جاؤں گی۔''

''کب تک وہاں رہو گی؟''

''ایک دن جنیوا میں۔ پھر اس کے جانے کے بعد دو تین دن سوئٹزر لینڈ میں ذرا گھوموں گی۔۔۔ یعنی لوزان، مونترو وغیرہ۔ میں ہمیشہ سے سوئٹزر لینڈ دیکھنے کی مشتاق ہوں۔ مجھے بڑی خوشی ہو رہی ہے۔''

''میں یہاں اکیلا تمہارے لیے تڑپتا رہوں گا۔''

''مگر کہیں میرے فراق میں میرے آنے سے پہلے مر نہ جانا۔ کسی اور سے دل بہلا لینا۔ جیسے میری۔۔۔''

''ایلس خدا کے لیے۔۔۔''

ٹیلیفون پر ایلس کے قہقہہ کی آواز آئی۔ میری مجھے بہت اچھی معلوم ہوتی ہے۔ بڑی خوبصورت ہے۔ ہے نا؟۔۔۔ کیوں؟''

''چپ۔'' نعیم نے ٹیلیفون پر ہنستے ہوئے کہا۔ ''تمہارے مقابلے میں تو وہ کچھ نہیں معلوم ہوتی۔ اور تم سے مجھے بہت محبت ہے۔''

''بیشک۔ بیشک۔''

''سچ۔ آج تک مجھے کسی اور سے اتنی محبت نہیں ہوئی۔ جتنی تم سے ہے۔''

''سچ؟ اچھا اب شب بخیر۔ دیر ہو رہی ہے۔ اچھے لڑکے کی طرح سو رہو اور میری عدم موجودگی میں

اچھے لڑکے کی طرح رہنا۔''

''مگر تمہاری گاڑی کتنے بجے جا رہی ہے؟''

''مجھے ٹھیک نہیں معلوم۔ کل صبح کو دس یا بارہ بجے۔ کل سویرے معلوم کر لوں گی۔''

''میں اسٹیشن پر تمہیں رخصت کرنے آؤں گا۔''

''شکریہ، پیارے لڑکے۔ شب بخیر۔'' یہ کہہ کر اس نے ٹیلیفون کے آلے کے سامنے بوسے کی سی آواز نکالی۔

''شب بخیر، پیاری۔ آرام سے سونا۔''

آٹھواں باب

انتخاب

باوجود ایلس کی محبت کے اس گہرے اثر کے میری کے لیے بھی نعیم کے دل میں کافی جگہ موجود تھی۔ مرد کی اسی عجیب نفسی کیفیت میں تو تعداد ازدواج کا فلسفہ مضمر ہے۔ وہ برابر میری پاول کو کھانے پر یا تھیٹر کے لیے بلاتا رہا اور اسے کبھی تو کارڈ پر ایک آدھ جوابیہ جملہ لکھا ہوا مل جاتا، یا کبھی کبھی جب وہ زیادہ اصرار سے بلاتا تو اس قسم کے خطوط ملتے:۔

''ڈیر نعیم حسن!

مجھے بڑا افسوس ہے کہ آج تمہارے ساتھ چائے نہ پی سکوں گی۔

کیونکہ پانچ بجے مجھے ایک ضروری جلسے میں شریک ہونا ہے۔

توقع ہے کہ تم سے کل ملاقات ہوگی۔

تمہاری میری!''

یا

''ڈیر حسن!

بڑا افسوس ہے کہ منگل کے دن میں نے دوپہر کے کھانے پر آنے کا وعدہ کر کے تمہیں انتظار

کرایا۔ میں وقت پر اپنے نہ آنے کی اطلاع بھی نہ دے سکی۔ کیونکہ مجھے دفعتاً ورسائی چلا جانا پڑا۔ ہسپانیہ کی کچھ پناہ گزین لڑکیاں یہاں آئی تھیں اور وہ ورسائی دیکھنا چاہتی تھیں۔

میں نے کوشش کی کہ تم آئنسٹی تیوت میں مل جاؤ تاکہ میں معافی چاہ لوں۔ مگر تم ملے نہیں۔

تمہاری میری!''

وہ کھانا کھانے آتی بھی تو بہت ہی خشک قسم کی باتیں ہوتیں۔ اکیلے میں جب وہ نعیم سے ملتی تو اس کا انداز بالکل مشفقانہ اور سنجیدہ ہو جاتا۔ تکبر یا تعصب کا شائبہ بھی نہ ہوتا۔ اور اس سنجیدگی میں بھی ایک سادگی ہوتی۔ پھر بھی دونوں کے درمیان کوئی ایسی چیز حائل تھی جو دونوں کو بے تکلف نہ ہونے دیتی۔ گفتگو بالکل اسی طرح کی ہوتی جیسے اجنبیوں میں ہو۔ اشتمالیت کے متعلق، ہندوستان کے متعلق، یہودیوں کے متعلق۔ مختلف ممالک کا ذکر ہوتا۔ دوستوں کا بھی کبھی کبھی ذکر ہوتا۔ لیکن میری پاول کے طرز عمل میں ایسی جذباتی بے رُخی تھی کہ کبھی ایسی گفتگو نہ ہوتی جو ایک نوجوان مرد اور نوجوان عورت میں ہوتی ہے۔

ایلس کو ساڑھے دس بجے گاردلیاں (اسٹیشن) پہنچا کے نعیم میری کو لنچ کے لیے بلوار سان ژرمیں کے ایک ایسے چھوٹے سے ریستوران میں گیا تھا جہاں مشہور ہے کہ لینن بھی اکثر آیا کرتا تھا۔ وہاں میری کے جاننے والے بھی تھے۔ میری اور نعیم الگ ایک میز پر بیٹھے۔ میری سمجھ دار اور دنیا دار لڑکی کی طرح باتیں کرتی رہی اور لنچ کے خاتمے پر نعیم نے محسوس کیا کہ میری اس سے پہلے کے مقابل اور زیادہ دور ہو گئی ہے۔ ایک شاخ کی طرح اس میں بلا کی لچک تھی، ذرا ہاتھ بڑھاؤ اور وہ شاخ لچک کے ہٹ جاتی تھی۔

(۲)

اس وجہ سے ایلس عزیز تر معلوم ہونے لگی۔ اب وہ دور تھی۔ پی۔ رال۔ ام کا تیز انجن اسے سوئٹزر لینڈ کے پہاڑوں کی طرف اڑائے لیے جا رہا ہو گا۔

اور نعیم نے اپنے دل میں اس کے لیے جگہ سی محسوس کی۔ گویا وہ دل کے اندر سماتی چلی آ رہی ہے۔ اس کی ایک ایک بات اسے یاد آنے لگی۔ وہ تیز امریکی خوشبو جو وہ استعمال کرتی تھی، اس کی ہنسی کا انداز، اس کے لبوں کی مصنوعی سُرخی، اور یہ مصنوعی سُرخی نہ بھی ہوتی تب بھی اس کے ہونٹ بڑے سُرخ معلوم ہوتے، اس کے چمکتے ہوئے ہموار دانت، اور اس کے جسم کی قربت، اس کے ہونٹوں کا مزا، اس

کا لپٹنا، گویا اس کا جسم نعیم کے جسم کا سہارا لے رہا ہے۔

سہ پہر کو وہ ہروشا کے ساتھ لاسورس گیا۔ وہاں کراکسلے اور ہروشا میں موت پر بحث شروع ہوئی۔ نعیم ذرا کھویا کھویا ہی سا رہا اور میکانکی طریقے پر دونوں کی باتیں سنتا رہا۔

کراکسلے آکسفرڈ کے شستہ لہجے میں کہہ رہا تھا'' ۔۔۔ ابھی تک آدمی محض اس ایک چیز کو فتح نہیں کر سکا۔ موت کو۔ یہ اس کی سب سے بڑی ٹریجڈی ہے۔ موت اس کے تمام آلام کا راز ہے۔ اگر موت نہ ہوتی تو قومیں جنگ نہ کرتیں ۔۔۔۔''

اور پھر کراکسلے کی تقریر خلا میں حل ہونے لگی۔ پھر نعیم کے سامنے ایلس کا تصور ابھرا۔ کاش ریل میں وہ اس کے ساتھ ہوتا اور وہ دونوں ڈبے میں اکیلے ہوتے۔ نعیم اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے ریل سے فرانس کے مناظر دیکھتا جاتا ۔۔۔

ہروشا کی آواز سنائی دی ۔۔۔ ''زندگی سے عاجز آتے ۔۔۔۔''

کراکسلے نے جواب دیا۔ ''کیا تم زندگی سے عاجز ہو؟ کیا جب ہم بڈھے ہو جائیں گے تو زندگی سے سیر ہو جائیں گے؟ ہر سال جو گذرتا ہے کتنا افسوس ہوتا ہے کہ زندگی کا ایک سال ختم ہو گیا۔ اور بڈھو ں کو زندگی کیسی پیاری معلوم ہوتی ہے۔ بڈھا موت سے کتنا ڈرتا ہے؟''

ہروشا نے کہا۔ ''پھر بھی بڑھاپے میں موت بن کے آتی ہے۔''

کراکسلے نے جواب میں کہا۔ ''نہیں یہ اس کی سب سے بڑی ٹریجڈی ہے۔ موت نہ آنے والی ہو تو بڑھاپا بھی نہ آئے۔ اگر انسان موت پر فتح پالے تو وہ بڑھاپے کی ضعف کو بھی شکست دے دے گا۔ زندگی کی رَو انسان کے جسمانی زوال کو اس قدر مدہم کر دے گی کہ جتنے برسوں میں انسان اب بڈھا ہو جاتا ہے، اسے بڈھا ہونے میں اتنی ہی صدیاں لگیں گی ۔۔۔۔''

نعیم نے اپنے دل میں کہا کیا خرافات ہے۔ اس نے کہنا چاہا کہ رُوح کی ابدیت کے تصور کی وجہ سے انسان موت پر فتح پا چکا ہے۔ مگر اس نے کچھ نہ کہا۔ کراکسلے ضرور اس کی مشرقیت کی ہنسی اڑاتا۔ اس نے دیوار پر ٹنگی تصویر کو دیکھا۔ پھر سوچنے لگا۔ کیا وجہ تھی کہ اب میری پاول کا تعاقب کرنے میں، اس سے باتیں کرنے میں، اس کے ساتھ کھانا کھانے میں وہ لطف نہیں آتا تھا جو ایلس کے ساتھ رہنے میں آتا تھا۔ میری پاول سے ایک رُکاوٹ سی بڑھتی جا رہی تھی۔ میری میں تو پہلے ہی سے رکاوٹ تھی۔ لیکن یہ

رکاوٹ اسے بری کیوں نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ کیوں میری کے ساتھ بیٹھ کے کھانا کھاتے ہوئے اسے
ایلس کا خیال آیا تھا؟ کیوں اسے یہ خیال آیا کہ ایلس میری سے زیادہ خوبصورت۔۔۔

اپنے اس سلسلۂ خیال سے وہ چونک پڑا۔ جیسے کوئی خواب میں لرز اٹھے۔ اسے معلوم ہوا کہ دفعتاً اس نے اپنے دل کی گہرائی میں کوئی شے دیکھ لی ہے۔ اسے معلوم ہو گیا کہ ایلس اسے میری سے زیادہ خوبصورت معلوم ہونے لگتی ہے۔ حالانکہ یہ بات نہیں۔۔۔ دراصل میری بہت خوبصورت ہے۔ لیکن ایلس اس کی اپنی چیز ہے۔ جیسے ماں کو اپنا ہی بچہ اچھا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے بغداد کی بدکردار خاتون کو اپنا حبشی غلام اچھا معلوم ہوتا ہے۔

ہروشا اور کرا کسلے اس طرح موت پر بحث کر رہے تھے۔

''زورِ حرکتِ حیات؟۔۔۔'' ہروشا نے اپنے پائپ کا ایک کش لیا۔ اور کش بھی طنز کے انداز میں لیا''۔۔۔ یہ زندگی ہے کیا جو محض ایک کارتوس سے بجھائی جا سکتی ہے؟ یہ زورِ حرکتِ حیات کیا کہ اگر درجۂ حرارت ذرا کم ہو جائے تو اس کائنات کا خاتمہ ہو جائے۔''

کرا کسلے نے کہا۔ ''لیکن ارتقائے تخلیق سے کارتوس اور درجۂ حرارت کا توڑ پیدا ہو جائے گا۔''

اور ہروشا نے اب پہلی مرتبہ ذرا جوش سے اپنا پائپ جھٹک کے کہا ''میرے دوست یہ کبھی نہ ہوگا۔ اس وقت فرانس میں کسی گوشۂ تنہائی میں بیٹھا ایک شخص ارتقائے تخلیق کا فسانہ گھڑ رہا ہے اور ایک ہزار کارخانے کارتوس بنا رہے ہیں۔ یہ ہے آپ کا زورِ حرکتِ حیات۔ یہاں برگسوں اور نیٹشے ملتے ہیں۔''

(۳)

اس رات نعیم کو بہت دیر تک نیند نہیں آئی۔ برگسوں یا نیٹشے یا ارتقائے تخلیق یا زورِ حرکتِ حیات یا موت یا نکیرین کے خیال سے نہیں، ایلس کے خیال سے۔ اس کے دل نے رات کے بارہ بجے کے قریب ہار مان لی۔ اس کا حلق خشک تھا۔ اس نے اٹھ کے پانی پیا۔ کھلی ہوئی کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا کی ایک لہر آئی۔ اس کا دماغ تھکا ہوا سا تھا۔ اس نے رات کی تنہائی میں اپنے آپ سے اقرار کیا۔ مجھے جتنی محبت ایلس سے ہے اتنی کسی سے نہیں ہوئی۔ بلقیس ابتدائے شباب کا کھلونا تھی اور میری گل سرخ ہے جو دور

سے بھلا معلوم ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ کبھی اس کی خوشبو سونگھ لی۔ مگر ایلس۔۔۔ اور ایک خیال نے آہستہ سے اس کے دماغ میں جمنا شروع کیا۔ اگر ایلس مجھ سے شادی کرنے پر تیار ہو جائے تو۔۔۔

(۴)

تیسرے روز ایلس کا خط آیا۔

''جنیوا!

پیارے نعیم!

میں نے کل جنیوا میں پہلی رات گذاری۔ جب میں سونے کو لیٹی تو مجھے خیال آیا کہ مہینہ بھر کے بعد پہلی شام تھی جس میں ہم دونوں ایک دوسرے سے الگ تھے جس میں ہم دونوں نے ایک دوسرے کا بوسہ نہیں لیا۔ مجھے پہلی مرتبہ محسوس ہوا کہ مجھے تمہارے ساتھ رہنے کی عادت سی ہو گئی ہے۔ صبح کو جب میں سو کے اٹھی تو اوپر کی منزل سے باجے کی بڑی پیاری آواز آ رہی تھی۔ کوئی وائلن پر ''پیاری نیلی ڈینیوب کے کنارے'' والا راگ بجا رہا تھا۔ میری نظر جھیل پر پڑی اور یہ نغمہ اور بھی اچھا معلوم ہوا۔ ناشتے پر اپنے چچا سے بہت باتیں کیں۔ پھر شہر کی سیر کرنے انہی کے ساتھ گئی۔ آج شام میرے چچا نیپلز روانہ ہوں گے، جہاں سے وہ امریکہ جائیں گے۔

یہاں دھوپ ہے اور نیلا آسمان ہے، اور نیلی جھیل ہے اور میں ہوں، عجیب بات ہے میں یہ محسوس کر رہی ہوں کہ پیرس سے دور ہونے کی وجہ سے میرے خیالات صاف ہو کر میرے سامنے آ رہے ہیں۔ میں ان میں تمیز کر سکتی ہوں۔ معلوم نہیں کیوں یہ احمقانہ خیال میرے دل میں پیدا ہوا کہ تم میرا بڑا خیال کرتے ہو، مجھے بہت چاہتے ہو۔ یہ تو میں جانتی ہوں کہ تمہیں مجھ سے عشق نہیں۔ پھر تمہارا اس طرح میرے ساتھ ساتھ پھرنا، ہر بات میں میرا لحاظ رکھنا تمہاری بڑی مہربانی ہے۔ بار بار تمہارا خیال آتا ہے۔ اب تک جب کبھی تم نے مجھ سے عشق جتایا، میں نے تمہیں جھٹلایا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ یقین کر لوں کہ تمہیں مجھ سے عشق ہے، لیکن یقین نہیں آتا تھا۔ کیونکہ۔۔۔ معلوم نہیں کیوں؟۔۔۔ شاید اس لیے جب تم میری پاول کی طرف دیکھتے ہو تو معلوم ہوتا ہے تمہاری نگاہیں اس کے بالوں میں پھنس کے رہ گئیں۔۔۔ معاف کرنا مجھے ذرا سی جلن معلوم ہوئی۔ حالانکہ میری مجھے بھی بڑی پیاری لگتی ہے۔

معلوم نہیں تم نے میرے متعلق کیا رائے قائم کی؟ مگر میرے پیارے نعیم، میرے متعلق کوئی بری رائے قائم نہ کرنا۔ اس سے میرے دل کو تکلیف ہوگی۔ کسی دن میں ایسی بن جاؤں گی کہ تم میرے متعلق جو رائے قائم کرو گے وہ اچھی ہی ہوگی۔

میرے دل میں پھر ایک خیال آیا۔ یہ خیال کہ یہاں ایک نوجوان اس وقت مجھے گھور رہا ہے۔ اس نے آج لنچ کے وقت میرے چچا سے اور مجھ سے اپنا تعارف کرایا۔ وہ امریکن ہے۔ اس کا قد اونچا ہے، بال سیاہ ہیں اور خوبصورت ہیں۔۔۔ اگر تم جل رہے ہو تو معاف کرنا۔۔۔ اس نے مجھے آج رات ناچنے کی دعوت دی۔ میں نے انکار کر دیا۔ کیوں انکار کر دیا؟ یہ خود میری سمجھ میں نہیں آیا۔ جس طرح پیرس میں میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ تمہارے سوا اور کسی نوجوان کے ساتھ میں کیوں نہیں اِدھر اُدھر پھرتی۔

یہ خط میں تمہیں ہوٹل کے صحن سے چائے پیتے ہی لکھ رہی ہوں۔ چچا کو رخصت کرنے اسٹیشن جاؤں گی۔ پھر آ کے کھانا کھاؤں گی۔ آج رات یہاں گذار کے کل لوزان جاؤں گی۔

تمہیں معلوم ہے کہ اب میں کیوں اور کچھ نہیں لکھ سکتی؟ اس لیے کہ گویا کوئی میرا ہاتھ روک رہا ہے۔ اس لیے کہ میں ڈرتی ہوں کہ میں کہیں وہ بات نہ لکھ جاؤں جو میں چاہتی ہوں کہ تمہیں معلوم نہ ہونے پائے۔ میرے اور تمہارے متعلق ایک بات ایسی ہے جو میں نہیں لکھ سکتی۔ پیارے جب میں پیرس واپس آؤں تو مجھ سے اصرار نہ کرنا کہ میں وہ بات بتادوں۔

مجھے امید ہے کہ جلدی خط لکھو گے۔ بہت بہت پیار۔

ایلس!''

(۵)

نعیم کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

کیا بات ہے جو اس نے نہیں لکھی۔ کون سی ایسی بات ہے جو وہ چھپانا نہیں چاہتی، اور چھپانا بھی چاہتی ہے۔ چھپانا چاہتی تو اس کا ذکر کیوں کرتی، اور چھپانا نہیں چاہتی تو بتادیتی۔

''یقیناً اسے بھی مجھ سے محبت ہے۔''

بار بار نعیم کا دل یہ فقرہ دہرا رہا تھا۔ پہلی بار اسے محبت کا جواب محبت سے ملا تھا۔ پہلی بار ایک اور دل نے دھڑک کر اس کا جواب دیا تھا۔ وہ دوستی جس کی ابتدا تفریحی دست درازی سے ہوئی تھی، اب

بڑھ کر عشق بن گئی تھی اور نعیم نے ایک سرور محسوس کیا۔ اعلیٰ ترین کامیابی کا سرور۔ دور دور کسی قسم کی تلخی کا پتہ نہ تھا۔ کوئی چیز ایسی نہ تھی جو اس سرور میں ذرا بھی خلل ڈال سکتی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کا سرور ساری کائنات پر چھا رہا ہے۔ اسے سڑک پر ٹرام کی گھڑگھڑاہٹ اچھی معلوم ہو رہی تھی۔ کھڑکی سے اسے پیرس کی یہ گلی دس گنی حسین معلوم ہو رہی تھی۔ محبت کا جواب اسے محبت سے ملا تھا۔ اس وقت وہ سارے عالم پر چھایا ہوا تھا۔ کسی تیسری طاقت کا وجود نہیں تھا۔

اس کا دل گا رہا تھا۔ اس کے خون میں باجے بج رہے تھے۔ اس نے فوراً ایلس کے خط کا جواب لکھنا شروع کیا۔

''میری پیاری ایلس!

تمہارے پیارے خط کا بہت بہت شکریہ۔ تمہارا خط ذرا غیر متوقع تھا۔ پہلے تو یہ کہ میری کے متعلق تمہارے دل میں جو شبہ پیدا ہوا وہ بے بنیاد ہے۔ میری تیسری بین الاقوامی جماعت کے لیے بنی ہے اور تم میرے لیے۔

مجھے تم ہی سے محبت ہے اور اتنی محبت ہے کہ جس کی کوئی انتہا نہیں۔ پیاری، تمہارے جانے کے بعد مجھے اس کا اندازہ ہوا کہ مجھے تم سے کس قدر عشق ہے۔ رات بھر مجھے نیند نہیں آئی۔ تم سے ایک راز کی بات کہوں؟ تمہارے مقابل مجھے میری بدشکل معلوم ہوتی ہے۔

وہ کون سی بات ہے جو تم مجھے نہیں لکھ سکتیں؟ خدا کرے وہ بات وہی ہو جو میں سمجھ رہا ہوں۔ اگر میں اسے ٹھیک سمجھا ہوں تو یہ دنیا میرے لیے جنت ہے، اور اگر میں غلط سمجھا ہوں تو میری ناامیدی کی کوئی انتہا نہ ہوگی۔

ایلس میں جانتا ہوں تم نئی دنیا کی ہو اور میں بہت پرانی دنیا کا۔ تمہارے والدین زندہ ہیں اور بہت امیر ہیں۔ پھر بھی میرے دل میں ایک خواہش پیدا ہوئی ہے۔ ایک فضول خواہش جو میں تم سے کبھی بیان نہ کر سکوں گا۔ اس وقت بھی نہیں جب تمہارا سر میرے شانوں پر ہو یا تمہارے لب میرے لبوں سے ملیں۔ کیا تم مجھ سے شادی کر سکو گی؟ میں یہ تم سے لکھ کے پوچھ سکتا ہوں۔ تمہاری موجودگی میں میری زبان یہ سوال نہ کر سکتی۔ یہ ساری زندگی کا معاملہ ہے۔

تمہارا نعیم''

(۶)

ایلس نے یہ جواب دیا:

''پیارے نعیم!

تمہارے خط کا بہت بہت شکریہ۔ میں نے اسے بار بار پڑھا۔ تم نے میرے ساتھ زندگی گذار دینے پر جو آمادگی ظاہر کی ہے اس سے کم از کم یہ تو مجھ پر ثابت ہو گیا کہ واقعتاً تم کو مجھ سے بہت محبت ہے، سچی محبت ہے، میرے نعیم بہت بہت شکریہ لیکن تم نے جو لکھا ہے وہ اتنا غیر متوقع تھا، اس طرح دفعتاً تم نے ایک ایسا سوال کیا جس کے جواب کے لیے میں بالکل تیار نہ تھی کہ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ تمہیں کیا جواب دوں۔ میں سوچ رہی ہوں، برابر سوچ رہی ہوں اور کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی۔

اتنا کہہ سکتی ہوں کہ میں تمہیں جتنا پسند کرتی ہوں، دنیا بھر میں اور کسی کو نہیں کرتی۔ میں جو بات تمہیں اپنے گذشتہ خط میں لکھتے لکھتے رُک گئی تھی، وہ یہی تھی کہ مجھے اپنے آپ پر یہ شبہ ہونے لگا تھا کہ شاید مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔

شاید مجھے بھی تم سے اسی طرح محبت ہے، جس طرح تم کو مجھ سے ہے لیکن ابھی شادی کا سوال میرے لیے ذرا قبل از وقت ہے۔ مجھے اپنی محبت کا کچھ اور یقین ہو جانے دو۔ شاید دو چار سال کے بعد میں تمہارے ساتھ ہندوستان جانے کے خیال کی اپنے آپ کو عادی بنا سکوں، فی الحال تو یہ بہت دشوار معلوم ہوتا ہے لیکن شاید اتنے دن تک تم انتظار نہ کرنا چاہو یا نہ کر سکو۔ ایسی صورت میں میرے پیارے نعیم میری یہ خطا معاف کر دینا۔

مجھ سے ایک بات کا وعدہ کرو، یہ کہ مجھ سے خفا نہ ہو جانا۔ تمہاری دوستی کی میرے دل میں جو قیمت ہے، کسی کی دوستی کی نہیں۔ پھر بھی ہم اسی طرح ملیں، ہنسیں، بولیں۔ ایک دوسرے کو پیار کریں۔ لیکن اپنے خط کے مضمون کو تم بھی فی الحال بھول جاؤ۔ میں بھی بھول جاتی ہوں۔ نعیم میری بات سمجھو۔ سمجھو گے نا؟ میرا وطن بہت دور ہے اور تمہارا وطن بہت دور۔ اس دوری کو رفع کرنے کے لیے شادی سے پہلے ہم دونوں کو ایک دوسرے کے بہت قریب آنا پڑے گا۔ یہ ممکن بھی ہے یا نہیں، میں کہہ نہیں سکتی۔ اس لیے فی الحال تو تم سے شادی کا خیال میں دل میں نہیں لا سکتی۔

پرسوں صبح کو میں پیرس واپس پہنچوں گی۔ تم مجھے لینے اسٹیشن آنا۔ اس دن آنسٹی تیوت سے دوپہر کا کھانا کھانے ہم دونوں کہیں باہر جائیں گے اور تیسرے پہر کو بوآ دبولون چلیں گے۔

پیارے نعیم، تمہارا بہت بہت شکریہ اور بہت بہت پیار۔

تمہاری ایلس!''

(۷)

اس رات ڈیڑھ بجے جب نعیم کروٹیں بدلتے تھک گیا تو اٹھا اور سفید چادر اپنے جسم پر لپیٹی۔ اس غصے اور مایوسی کے عالم میں بھی اسے شرارت سوجھ رہی تھی۔ شاید ہروشا ڈر جائے۔ اس لیے اس نے ڈریسنگ گون نہیں پہنا تھا۔ آہستہ سے اس نے ہروشا کے کمرے کا دروازہ کھولا اور زور سے دروازہ بند کیا۔ اس آواز سے ہروشا یکلخت چونک پڑا۔

''کون ہے؟''

نعیم نے سوچا۔ معلوم نہیں مجھے ریزکا کی رُوح سمجھ رہا ہے یا روڈالف فان ہاپس برگ کی۔ میں اس جگہ ہوتا تو میری شاید گھگی بندھ جاتی۔ سفید چادر میں لپٹی ہوئی شکل کو بھوت نہ بھی سمجھتا تو چور تو ضرور سمجھتا۔

لیکن ہروشا جو صرف ایک ڈکٹیٹر سے ڈرتا تھا، چوروں سے بھی خائف نہ تھا۔ اس نے اٹھ کے بڑے اطمینان سے کہا۔ ''کیا ہے نعیم؟''

''مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔''

''ایلس کی وجہ سے؟''

''ہاں!''

''کیوں۔ کیا بہت یاد آ رہی ہے؟''

''نہیں اس نے لکھا ہے کہ وہ مجھ سے شادی نہیں کرے گی۔ کم از کم فی الحال۔''

''شادی؟ تم اس سے شادی کرنا چاہتے تھے؟''

''ہاں!''

"حماقت کی کوئی انتہا ہوتی ہے۔"

"میں نسبت ہو جانے کے بعد تم سے اس کا ذکر کرنا چاہتا تھا۔"

"ہاں کچھ دنوں سے میں دیکھ رہا تھا کہ تمہاری ذہنی حالت ذرا غیر معمولی ہے۔ لیکن میں نہیں سمجھتا تھا کہ تم اتنی جلدی پھنس جاؤ گے۔"

"اب میں کیا کروں؟"

"جا کے سو رہو۔"

"شکریہ۔ یہ نسخہ تو میں آزما چکا ہوں۔ نیند آ ہی نہیں رہی تھی۔ ہروشا میں بہت پریشان ہوں۔"

"مجھے افسوس ہے۔" ہروشا نے کہا اور آہستہ سے دروازہ کھول کے نعیم سے کہا۔ "ایک عورت کے لیے ساری رات کی نیند خراب کرنا، یہ کون سی عقلمندی ہے۔ جاؤ شب بخیر۔"

اور نعیم پھر صبح تک کروٹیں بدلتا رہا۔

(۸)

صبح سویرے جنیوا سے گاڑی آتی تھی۔ اسٹیشن پر ایلس کو لینے جب نعیم گیا تو وہ ہنستی ہوئی ہشاش بشاش اتری۔ معلوم ہوتا تھا اس درمیان میں کچھ ہوا ہی نہیں۔ جیسے اس نے جنیوا جاتے وقت نعیم کا ہلکا سا بوسہ لیا تھا، اب بھی لیا، لیکن وہ بوسہ اتنا ہلکا تھا کہ نعیم کا دل اندر ہی اندر غصے اور پستی سے کانپنے لگا۔ ٹیکسی میں راستے بھر وہ سوئٹزرلینڈ کا ذکر کرتی رہی۔ اپنے یا نعیم کے خطوط یا ان کے مضمون کی طرف اس نے اشارہ بھی نہیں کیا۔ نعیم بھی "صمم بکم" بیٹھا رہا۔ صرف اس کی خاموشی ترک موالات کر رہی تھی۔ اور اس خاموشی کی طرف ایلس نے کوئی توجہ نہ کی۔

ایلس کو اس کے بورڈنگ ہاؤس چھوڑ کے نعیم نے ٹیکسی کا کرایہ ادا کیا، اور خود زیر زمین ریل سے واپس آیا۔ اپنے کمرے سے کتابیں لیں۔ آنسٹی تیوت پہنچا۔ وہاں ایلس بھی آئی۔ ہروشا ذرا دلچسپی سے ان لوگوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

دوپہر کا کھانا کھانے ایلس، نعیم کے ساتھ زلیزے کے ایک ترکی ریستوران گئی۔ وہاں سے بوآ دو بولون بھی قریب تھا۔

کھانے کا بل بہت اصرار سے ایلس نے ادا کیا۔ دراصل میں نے تمہیں مدعو کیا تھا۔ اپنے خط میں، یاد ہے؟"

"ہاں یاد ہے۔ اور اس خط کی اور بھی بہت سی باتیں یاد ہیں جو مجھ کو ذرا بھی اچھی نہیں معلوم ہوئیں۔"

ایلس نے اس مضمون سے گریز کرنے کے لیے ہلکے سے تہدیدی لہجے میں کہا۔ "نعیم!"

اس پر نعیم خاموش ہو گیا۔ دونوں آہستہ سے اس ریستوران سے نکلے۔ دھوپ اچھی خاصی تھی اور ایلس کے پیلے بالوں پر چمک رہی تھی۔

ایلس نے کہا۔ "دھوپ ذرا تیز ہے۔"

"ٹیکسی میں چلوگی؟" نعیم نے رُوکھے اخلاق سے پوچھا۔

"نہیں۔"

"میٹرو میں؟" نعیم نے اسی لہجے میں پھر سوال کیا۔

"نہیں میں پیدل چلوں گی۔"۔۔۔ نعیم کی طرف اس نے پھر ذرا غور سے دیکھا۔ اب اس نے دیکھا کہ نعیم کے چہرے پر ملال کا کتنا اثر تھا۔ دھوپ میں اس کا غم اس کے چہرے پر چمک رہا تھا۔ اس نے نعیم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ نعیم نے جھٹکا دے کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

"نعیم! یہ تو خوش اخلاقی نہیں۔"

"معاف کرنا۔" نعیم نے تلخی کے ساتھ کہا۔ "خوش اخلاقی تو انسان کرتے ہیں۔ میں تو تمہارے لیے کھلونا ہوں۔ سانولا سا کھلونا۔"

ایلس نے ملامت کے لہجے میں کہا۔ "نعیم!"

کچھ دیر تک دونوں خاموش ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ پھر ایلس نے اپنے ہاتھ سے نعیم کا بازو پکڑ کے اور اس کے قریب ہو کے کہا۔ "نعیم مجھے معاف کرنا۔ میں تمہارا دل نہیں دکھانا چاہتی لیکن حالات کا۔۔۔۔"

نعیم نے تلخی کے ساتھ ذرا پست لہجے میں کہا۔ "کیا یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے معاملات یہاں شاں

زلیزے کے بھرے بازار میں ملے کریں؟''

ایلس خاموش ہوگئی اور اسی طرح نعیم کا بازو پکڑے چلتی رہی۔ دھوپ کی تمازت سے اس کے پیلے پیلے بال گرم ہو رہے تھے۔ لیکن اس کی ہمت نہ پڑی کہ کسی ٹیکسی والے کو اشارے سے بلالیتی۔

(۹)

بوآدو بولون (بولون کا باغ) بڑا خوبصورت باغ ہے۔ اس کا حسن دراصل بہار میں غضب کا ہوتا ہے۔ جب اونچے اونچے درختوں کے درمیان ہلکی ہلکی دُھند چھائی ہوتی ہے تو اس کی نہروں اور چشموں کا پانی ایسا معلوم ہوتا ہے گویا یہ اس کی دھند کی تہ ہے۔ دھوپ میں راستہ طے کر کے جب ایلس اور نعیم اس باغ کے اونچے اونچے درختوں کے سائے میں پہنچے تو معلوم ہوتا تھا کہ ایلس کے پیلے پیلے بال آفتاب کی تیز کرنوں کی زیادتیاں بُھول گئے۔

ایک خاموش چمکتے ہوئے چشمے کے کنارے، ایک بلند بالا درخت کے سائے میں، سبزے پر دونوں بیٹھ گئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس سبزے کی کوئی انتہا نہیں۔ یہاں تک کہ وہ درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو جاتا تھا۔ دور ایک پتلی سی سڑک کی کالی لکیر تھی۔ جس پر تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کوئی موٹر آتی یا دوسری طرف جاتی ہوئی دکھائی دیتی۔ اس وقت بوآ میں لوگ کم تھے۔

نعیم نے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کے ایلس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور ایلس کی انگلیوں کی جوابی گرفت محسوس کی۔

اس کی ساری تلخی اور درشتی اب لجاجت میں بدل چکی تھی۔ اس نے نرمی کے ساتھ پگھلتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ایلس! میری اس وقت کی بدتمیزی کو معاف کرنا۔''

''پیارے کوئی بات نہیں۔'' اور اس کی انگلیوں کی گرفت اور مضبوط ہوگئی۔

نعیم نے اپنے آپ کو سبزے پر گھسیٹا اور اس کے ہونٹوں نے ایلس کی آنکھوں کو ایک بار چوما۔

''پیاری!''

''کیا۔ پیارے؟''

''میں تم سے اس خط کے متعلق باتیں کر سکتا ہوں؟''

ایلس نے جو اب زمین پر دراز تھی، سر کے اشارے سے 'ہاں' کہا۔

''ایلس! مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے۔''

ہمیشہ کی طرح، اس مرتبہ ایلس نے اسے جھٹلایا نہیں۔ ہمدردی سے۔۔۔ محبت سے زیادہ، ہمدردی سے ــــ اس کی نگاہیں نعیم کے چہرے پر پیوست ہوگئیں۔ اس نے نعیم کے پنجے کو پھر آہستہ سے دبایا اور کہا۔ ''ہاں مجھے معلوم ہے۔''

''مجھے اتنی محبت اب تک کسی اور سے نہیں ہوئی۔''

ایلس کے چہرے پر محبت کی ہلکی ہلکی سنجیدگی برس رہی تھی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''اور تم؟ تم محض میرا خیال کرتی ہو۔''

''نہیں۔ اس سے بہت زیادہ نعیم۔ مجھے بھی تم سے لگاؤ ہو گیا ہے۔ بہت، بہت زیادہ۔ جتنا اب تک کسی اور نوجوان سے نہیں ہو سکا۔ معلوم نہیں کیوں۔ تمہیں معلوم ہے کسی اور کے ساتھ میں کبھی تفریح کو نہیں جاتی۔''

''صرف لگاؤ۔''

''شروع شروع میں اسے میں محض لگاؤ سمجھتی تھی۔ ایک طرح کی گہری، سچی دوستی لیکن اس مرتبہ جو میں تم سے کچھ دن جدا رہی، تم مجھے بہت یاد آتے تھے۔۔۔''

نعیم نے کچھ جواب نہیں دیا۔

ایک لمحہ وہ خاموش رہی۔ پھر اس نے کہا۔ ''پہلی رات مجھے دیر تک نیند نہیں آئی اور میں سوچتی رہی۔ رفتہ رفتہ مجھ پر منکشف ہونے لگا کہ دوستی کا اثر اتنا گہرا نہیں ہو سکتا۔ رفتہ رفتہ مجھ پر یہ انکشاف ہونے لگا کہ شاید مجھے تم سے ہلکی ہلکی محبت ہے۔ یہ تو میں نے تمہیں اپنے دوسرے خط میں لکھا تھا۔ کیوں؟''

''ہاں!''

''میں بھی تمہیں چاہتی ہوں۔ پھر تم کیوں ناراض ہو؟''

''تم نے مجھ سے شادی کرنے سے کیوں انکار کیا؟''

''میں نے قطعی انکار تو نہیں کیا۔ میں نے لکھا تھا کہ یہ قبل از وقت ہے۔ ابھی میری عمر زیادہ نہیں

۔مجھے تجربہ کم ہے۔ مجھے اپنے جذبات کا کامل یقین نہیں، اس لیے مجھے ذرا ڈر معلوم ہوا۔"

"مجھ سے؟"

"نہیں۔ بیوقوفی کی باتیں مت کرو۔ تم سے نہیں، شادی سے۔ شادی کے ذکر سے۔۔۔تم نے کچھ اس طرح دفعتاً یہ ذکر چھیڑا، میں اس کے لیے بالکل تیار نہ تھی۔"

نعیم کے چہرے پر پھر وہی ملال کے بادل چھا گئے۔ اس کی آنکھوں سے کچھ ایسی مایوسی ٹپک رہی تھی کہ ایلس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ پکڑ لیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے، ان آنکھوں کی مایوسی سے آزردہ ہو کر کہا۔" پیارے مجھے اس طرح نہ دیکھو۔"

نعیم نے مصنوعی اور طنزیہ اخلاق کے ساتھ کہا۔" پیاری۔ مجھے معاف کرنا۔"

اس کی آنکھوں میں وہی مایوسی تھی۔ اس پر ایلس نے دفعتاً اس کا سر اپنے سینے سے لگا کے اس محبت کے انداز میں کہا جو والدین کو اپنے بچوں سے یا ایک جان نثار دوست کو دوسرے جان نثار دوست سے ہوتی ہے۔" نعیم میں نے انکار تو نہیں کیا ہے۔ میں نے تم سے مہلت مانگی ہے۔ دو سال، چار سال۔ اس عرصے میں تم کو بھی غور کرنے کا موقع مل سکے گا۔"

نعیم نے دو تین منٹ تک اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ایلس کے دھڑکتے ہوئے دل اور اس کے سینے کے اتار چڑھاؤ کو نعیم کا تنفس محسوس کر رہا تھا اور اس کا سخت سینہ نعیم کے جلتے ہوئے چہرے کی حدت کو۔

بالآخر نعیم نے آہستہ سے کہا۔" پیاری۔ میں دنیا میں بالکل تنہا ہوں۔"

اور گویا اس لفظ تنہا کے ساتھ اس کی خود اعتمادی، اس کی ارادیت میں نئے سرے سے جان پڑ گئی۔ وہ اٹھ بیٹھا۔

"ہندوستان میں میرا کوئی قریبی عزیز یعنی ماں، باپ، بھائی بہن زندہ نہیں۔ میں تمہارے لیے اپنا وطن چھوڑ سکتا ہوں ہندوستان میں میرا کوئی دوست نہیں۔ جب سے تم مجھے مل گئیں، مجھے محسوس ہوا کہ اب میں اکیلا نہیں رہا۔ اب کوئی اور بھی ہے جو میرا ساتھ دے گا۔ جب ہر دوشا چیکوسلواکیہ چلا جائے گا تب بھی تم میرے ساتھ رہو گی۔ تمہارے لیے میں ہر چیز چھوڑ دوں گا۔"

ایلس کا دل اب زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ نازک ترین نفسیاتی لمحہ قریب آ رہا تھا۔ اس نے

اندھیرے میں اس لمحہ کو ٹٹولتے ہوئے پوچھا۔" اگر تمہارے ماں، باپ، بھائی، بہن ہوتے تو کیا تم ان کو میرے لیے چھوڑ دیتے؟ کیا تم اس پر بھی تیار ہو جاتے کہ ہندوستان واپس نہ جاتے اور یہیں رہ پڑتے یا میرے ساتھ امریکہ چلتے؟"

نعیم کی زبان سے بے اختیار "ہاں" نکل گیا۔ اسی وقت اس کے دل کے اندر سے کسی باطنی طاقت نے کہا۔" چل جھوٹے۔"

ایلس نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔" نعیم جنیوا میں میں نے سوچا تھا کہ اگر مجھے اپنے ماں باپ کو چھوڑنا پڑے تب بھی میں تمہارے ساتھ رہنے پر آمادہ رہوں گی یا نہیں؟ اور اس وقت مجھے پہلی بار محسوس ہوا تھا کہ تم مجھے اپنے ماں باپ سے زیادہ پیارے ہو۔ نعیم میں تمہارے لیے سب کو چھوڑ دوں گی۔ دیکھ لینا سب کو چھوڑ دوں گی۔ میں تمہارے ساتھ ہندوستان چلوں گی۔ مجھے ہندوستان سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ پھر بھی میں تمہارے ساتھ ہندوستان چلوں گی، لیکن ابھی مجھے مہلت دو۔ مجھے ڈر معلوم ہوتا ہے۔"

"مگر پیاری کیوں؟" نعیم کی آغوش کی گرفت اور مضبوط ہو گئی۔

ایلس نے آہستہ آہستہ اپنے کو چھڑاتے ہوئے کہا۔" معلوم نہیں کیوں۔ شاید عورت کی جبلت جو مجھ میں ہے۔۔۔ ابھی میں یہ سب کچھ اچھی طرح نہیں سمجھی۔ صرف محسوس کر سکتی ہوں۔ مجھے کچھ مہلت دو۔ چار سال نہیں تو دو سال۔ کم سے کم ایک سال۔ جب تم ہندوستان واپس جانے لگو گے تب۔"

نعیم نے مجنونانہ جوش سے اس کے جسم کو اپنی آغوش میں لیا۔ اور اس طرح جیسے کوئی ہارتا ہوا فریق آخری مدافعت کرے، اس نے کہا۔" میں تمہارے لیے زندگی بھر انتظار کرنے کو تیار ہوں۔ مگر میری پیاری، میری جان۔ نسبت ہو جانے میں کیا حرج ہے، مجھے اطمینان تو ہو جائے گا۔"

دونوں کے لب ملے۔ نعیم ان لبوں کو اب تک ہزاروں بار چوم چکا تھا، چوس چکا تھا لیکن آج ان میں وہ نرمی تھی، وہ گداز تھا، وہ لطافت تھی، وہ سحر تھا کہ اسے معلوم ہوتا تھا اس نے آج تک اس عورت کا بوسہ ہی نہیں لیا تھا جو اب اس کی بیوی بننے والی تھی۔ گویا اس عورت کے ہونٹ دل کو تراش کے بنائے گئے ہیں اور ساتھ ہی ایلس کا جسم جو اس کی آغوش میں تھا اسے عزیز معلوم ہونے لگا۔ اتنا عزیز جس کی کوئی انتہا نہ تھی۔ یہ جسم گویا اب اس عورت کا جسم نہ تھا، یہ اسی کے رگ و پوست، اسی کے خون کا لطیف

ترین حصہ تھا جس نے اس کے جسم سے الگ ہو کے اس عورت کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس مرتبہ جب اس کے ہاتھوں نے ایلس کے سخت سخت سینے کو چھوا تو اس کے ہاتھ اس کی تحقیر سی نہیں کر رہے تھے۔ ان کالس انہیں پیار کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ ایلس کے پیلے پیلے بال بھی اس کے اپنے ہی جسم و جان کا ایک حصہ بن گئے تھے۔ اب وہ دنیا میں تنہا نہیں تھا۔

اور وہ خواہش جو ایلس کی دوستی کے ساتھ ظہور میں آئی تھی، ایلس کے جسم، ایلس کے کنوار پن کو فتح کرنے کی خواہش، اب اس کا کہیں نام ونشان بھی نہ تھا۔ ایلس اب بھی کنواری ہی تھی لیکن وہ احترام جو ایک عرصے سے آہستہ آہستہ نعیم کے دل میں پیدا ہو رہا تھا اس ایک لمحے میں جذبۂ پرستش بن گیا۔ اس کی محبوبہ، اس کی ہونے والی بیوی، کسی سے، یہاں تک کہ خود اس سے آلودہ نہیں ہوئی۔ مشرق کا تصورِ عصمت اسے ایلس کے اطراف اس وقت اس طرح چھایا ہوا نظر آ رہا تھا جیسے ماہتاب کے گرد ہالہ۔

اس وقت نعیم کے دل میں کوئی شک نہ تھا۔ جیسے اس وقت آسمان پر تیز، پاک سورج چمک رہا تھا اور کہیں ابر کا کوئی ٹکڑا نظر نہ آتا تھا جس سے یہ نیلی فضا مکدر ہوتی۔

(۱۰)

دونوں نے طے کر لیا تھا کہ نسبت پوشیدہ رہے۔ گذشتہ رات کو جس سرد مہری سے ہروشا نے بجائے چارہ سازی اور غمگساری کے ناصح کی خدمت انجام دی، اس پر نعیم کو اتنا غصہ تھا کہ وہ ہروشا سے اپنی کامیابی کا راز چھپانا چاہتا تھا۔ ایلس اس لیے اس کو پوشیدہ رکھنا چاہتی تھی کہ وہ پہلے اپنے باپ کو اس کی اطلاع کرنا چاہتی تھی۔ اس کے بعد اسے معلوم تھا کہ طوفان آئے گا مگر اس کا بھی یقین تھا کہ طوفان گذر بھی جائے گا۔

دو تین دن دلی محبت کے کیف و سرور میں گذرے۔ خصوصیات سے نعیم کے لیے، اس زمانے میں وہ رومیو اور جیولیٹ پڑھ رہا تھا۔ دنیا کی کوئی ہیروئن جیولیٹ سے زیادہ دلکش، جیولیٹ سے زیادہ ''لطیف'' نہیں۔ ''لطافت'' نرمی، گداز، دل کی نرمی، جسم کی نرمی، رُوح کی نرمی، یہی وہ چیز تھی جو اسے اپنی اور ایلس کی محبت کی اصل معلوم ہوتی تھی۔ کہیں جذبات کی آندھی نہیں تھی، کہیں طوفان نہیں، کہیں طغیانی نہیں، کوئی زور و شور نہیں، کوئی ہلچل نہیں، محبت کی ہوا آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ جیسے بو آدلوم یا قاآنی کی

بحر طویل میں نسیم، نسیم، ہلکی ہلکی ہوا۔ ہر طرف سکون ہی سکون۔ ایسا سکون، ایسا لطیف سکون، ایسی لطافت جو اس کی رُوح نے آج تک محسوس نہیں کی تھی۔ اسے کچھ کچھ اندازہ ہونے لگا کہ صوفیائے کرام جب خدا سے لو لگاتے ہوں گے تو ان کی رُوحیں کیسا سکون، کیسا لطیف سکون محسوس کرتی ہوں گی۔ کائنات کا سارا جوش وخروش، اجزائے کائنات کا سارا تصادم ختم ہو چکا تھا۔ زمین اپنے محور پر سکون کے ساتھ گھوم رہی تھی۔

یکا یک اس جنت کے دروازے پر ابلیس نے دستک دی۔ جنت میں سکون ہے، اور زندگی کی ہر اٹھتی ہوئی موج ابلیس۔ ایک رات کو جب نعیم ایلس کو اس کے بورڈنگ ہاؤس چھوڑ کے واپس آیا تو ایک چھوٹے سے زہریلے سانپ نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

کیا ایلس فی الحقیقت کنواری ہے؟

یا صرف میں بیوقوف بن رہا ہوں؟

اور اس کے جسم میں آہستہ آہستہ زہر پھیلتا گیا۔ پھیلتا گیا۔ رات بھر وہ کروٹیں بدلتا رہا۔ صبح ہوتے ہوتے اس کی آنکھ لگی۔ مگر زہر چڑھتا گیا۔ دن چڑھنے لگا۔

دھوپ میں اس کا جسم اس کے دل سے اپنا حصہ مانگ رہا تھا۔

☆☆☆

نواں باب

امریکہ کا ایک طیارہ

ایک اور طرح کا سانپ ایلس کی جنت کے دروازے پر بھی پھنکار رہا تھا۔ اب تک وہ نعیم کو ایک اجنبی رفیق سمجھ رہی تھی۔ نعیم کے وطن سے اسے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ اب جب نعیم کے ساتھ ہندوستان جانے کا خیال پیدا ہوا تو قدرتی طور پر ہندوستان کے متعلق اسے کھوج ہونے لگی۔ ہندوستان کے متعلق دو تین فلم جو اس زمانے میں پیرس میں دکھائے جا رہے تھے اس نے نعیم کے ساتھ دیکھ ڈالے۔ ان فلموں سے ہندوستان کی زندگی کا ذرا برا ہی اندازہ ہوتا تھا۔ اس کی دلچسپی بڑھتی گئی۔ اس نے کپلنگ کے ناول اور افسانے پڑھنے شروع کیے جو اس زمانے میں فرانس میں بہت مقبول تھے۔ آہستہ آہستہ شادی سے خوف کی وجہ اس کی سمجھ میں آنے لگی۔ دراصل وہ ہندوستان جانے سے ڈرتی تھی۔ تپتے ہوئے میدان، اتنا گرم سورج کہ صرف گرم ہوا سے لوگ وہاں مر جاتے ہیں۔ "رینگتی ہوئی چیزیں" ۔۔۔ یہ فقرہ اس کی ایجاد تھا۔ اس میں چھپکلیاں، بچھو، کیڑے، پتنگے، سانپ سب ہی شامل تھے کیسا عجب ملک ہوگا۔

اور وہاں کے انسان، صرف ایک ہندوستانی سے مل کے وہ ہندوستان کا کیا خاک اندازہ کر سکتی ہے۔ کیا وہ جھونپڑوں میں رہتے ہیں۔ کیا جیسا انگریزوں کا خیال ہے، صرف راجاؤں مہاراجوں کو رہنے کے

مکانات ملتے ہیں۔ باقی سب جنگلوں، جھونپڑوں، بلیوں کے گھروں میں رہتے ہیں۔ کیا وہاں مرد ظالم ہوتے ہیں اور عورتوں کو بند کر دیتے ہیں، انہیں مارتے ہیں، کیا وہاں ایک ایک مرد کئی شادیاں کرتا ہے۔ نعیم کا کس طبقے سے تعلق ہے؟ مجھے کیسے لوگوں میں رہنا ہوگا؟ کیا وہاں لوگ اس سے نفرت کریں گے؟ اور نفرت کریں گے تو میں کس حد تک اسے برداشت کر سکوں گی؟ میں کتنے سال میں ایک بار امریکہ جا سکوں گی؟

نعیم نے اسے کپلنگ اور اس قسم کے دوسرے مصنفین کی زد سے بچانے کے لیے ای۔ ایم۔ فارسٹر کی "سفرِ ہند" پڑھنے کو دی۔ اس سے اسے ہندوستان کے تمدن کا خفیف سا اندازہ تو ضرور ہوا مگر زیادہ تسلی نہیں ہوئی۔ اس کتاب سے بھی یہی نتیجہ نکلتا تھا کہ سفیدوں اور سانولوں کی دوستی ہندوستان میں نہیں نبھ سکتی۔

یہ نعیم کی خوش قسمتی تھی کہ اس وقت ایلس اور نعیم کے دونوں انگریز دوست جیمز کراکسلے اور میری پاول بہت فراخ دل تھے۔ میری پاول نے تو ایلس کو صاف صاف یہ مشورہ دیا کہ جس طرح تم سمجھتی ہو کہ تم خوش رہ سکو گی، وہی راہ اختیار کرو۔ انسان دنیا کے ہر ملک میں خوش رہ سکتا ہے، ہندوستان یا امریکہ کی کوئی قید نہیں۔ میری پاول نے کراکسلے یا ہروشا سے اس کا ذکر نہیں کیا۔ کراکسلے یوں ہندوستانیوں کی تعریف ہی کیا کرتا تھا۔ اس اشتراکی اور اشتمالی پس منظر میں ایلس کو ذرا تسکین معلوم ہوئی۔

میری پاول نے ایلس کو یہ رائے بھی دی تھی کہ اپنے والد کو ضرور لکھ دینا۔ ان سے چھپانا بیوقوفی ہوگی اور دیر یا سویر، انہیں تمہاری اس نسبت کا حال معلوم ہو جائے گا۔

(۲)

اس ہفتے نعیم کی نیند پھر غائب ہو گئی۔ رات کو تین تین چار چار بجے تک وہ نہ سوتا۔ کچھ کچھ تو اسے یہ خیال ستا رہا تھا کہ کہیں ایلس ہندوستان سے بدگمان نہ ہو جائے لیکن اس خیال کی حیثیت محض ثانوی تھی۔ آہستہ آہستہ لیکن مضبوطی سے شک اس کے دل میں جا گزیں ہو رہا تھا۔ شک ۔۔۔ جو دلوں اور روحوں کو گھن کی طرح کھا جاتا ہے۔ کہیں وہ غلطی تو نہیں کر رہا ہے؟ کیا ایلس اس سے وفاداری کرے گی؟ کہیں اس کا بھی تو مسز چند کا سا حال نہ ہوگا؟

اور اب بھی، اب بھی وہ کنواری ہے یا نہیں؟ یا وہ اسے دھوکا دے رہی ہے اور وہ بے وقوف بن رہا ہے؟ اس نے بے چینی سے بستر پر کروٹ بدلی۔ کیا وہ سچ مچ کنواری ہے؟ وہ لطیفہ جو اسے شجاعت نے سنایا تھا۔ "ایک اجنبی کئی گھنٹے سے ٹریفالگر اسکوائر میں نیلسن کے مجسمے کے سامنے ٹہل رہا تھا۔ لندن کا ایک خاموش اور باوقار پولیس مین اسے دیکھتا رہا، دیکھتا رہا۔ آخر جب رات کے بارہ بج گئے تو اس نے پوچھا۔ "آپ کیا ڈھونڈ رہے ہیں؟ اجنبی نوجوان نے کہا۔ "میں کسی کنواری کا منتظر ہوں۔" پولیس مین نے کہا۔ "یہ پہچان لینا تو بہت آسان ہے کہ کوئی لڑکی کنواری ہے یا نہیں۔ کیونکہ جب انگلستان کی کوئی کنواری لڑکی اس جگہ سے گذرتی ہے تو نیلسن کا مجسمہ اپنی ٹوپی اتار کے جھک کر اس کی تعظیم کرتا ہے، اور یہ دونوں پتھر کے شیر چیختے ہیں۔"

جو راستہ اس نے چنا ہے وہ مناسب بھی ہے؟ کیا وہ زندگی سے یہی چاہتا تھا؟ یہ کہ وہ کسی ایک لڑکی کا ہو جائے اور پنجاب یا مدراس کے کسی ضلع کے مستقر پر اس کے ساتھ اپنی زندگی گذار دے۔ سال میں ایک بار چھٹی لے کر اسے خرید و فروخت اور سیر کرانے بمبئی یا دہلی لے جائے اور جب اس پر کسی انگریز یا کسی فیشن ایبل ہندوستانی کی للچائی ہوئی نظر پڑے تو جل کے کباب ہو جائے۔ پھر وہ ایلس کے ساتھ اپنے مستقر کو واپس ہو۔ اور پھر چاندنی رات اور گرمی، یا سردیاں اور کمرے کی چار دیواری اور جھینگروں کی آواز۔

اور بلقیس؟ کیا بلقیس کا ملنا اب بالکل ناممکن ہے؟ ہرگز نہیں۔ جب وہ ہندوستان واپس ہوگا تو اس کے قدموں کے نیچے ہندوستان کی مٹی تھرائے گی۔ اس سے زیادہ قابل اور تیز دماغ نوجوان جنہوں نے اپنے قومی یا اشتراکی جنون میں آئی۔ سی۔ ایس کی طرف توجہ نہیں کی اور پھر پچھتا کے یونی ورسٹیوں میں پروفیسر ہو گئے یا آل انڈیا ریڈیو میں ملازم ہو گئے، اس کی طرف حسد سے دیکھیں گے۔ اس وقت خانم قدموں پر گر کے اپنی لڑکی کا اس سے بیاہ کریں گی۔ مگر۔۔۔ مگر۔۔۔ اب تو یہ سارے تصورات قبل از وقت تھے۔ لُوور کے تصویر خانے سے کسی نے مونالیسا کی تصویر چرا لی تھی۔ اس کی جگہ میٹرو گولڈن میئر کمپنی کی ایک حسینہ، ایک ستارۂ سنیما کی تصویر تھی جس کے بال پیلے تھے۔۔۔۔

ایلس شادی ہونے کے بعد ضد کر کے ضرور سال دو سال میں ایک آدھ مرتبہ امریکہ جایا کرے گی اور نوکری کی وجہ سے وہ اس کے ساتھ نہ جا سکے گا اور وہ اسے روک بھی تو نہ سکے گا۔ کیونکہ ایلس کو اپنے

باپ کا کچھ حصہ تو ملے گا۔ پھر؟۔۔۔ پھر؟ اور اسے برائٹن کا ایک واقعہ یاد آ گیا جہاں وہ آکسفرڈ سے ہفتے کے ختم پر گیا تھا۔ وہاں ایک ہندوستانی کی منکوحہ جو چند ماہ کے لیے ہندوستان سے آئی تھی، ایک انگریز لڑکے سے لپٹی ہوئی سمندر کے کنارے کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ اور اس کے جسم کا ریشہ ریشہ کہہ رہا تھا۔ میں سفید چمڑے سے وصال کے لیے ترس گئی ہوں۔ چونکہ وہ اسی ہوٹل میں تھی جس میں نعیم ٹھہرا تھا، اس لیے اس نے اسے پہچان لیا تھا۔

اب مشورہ لینے کے لیے نعیم نے پہلی بار کسی ہندوستانی سے قربت کی ضرورت محسوس کی۔ بہت سے بد دماغ اور غلط خیال ہندوستانی طالب علموں کی طرح اس کا بھی یہ اصول تھا کہ ہندوستان واپس جا کے تو اپنے ہم وطنوں میں ساری عمر گذارنا ہی ہے، اس سے یورپ میں جس قدر بچو اچھا ہے۔ اس کے دوست سب کے سب انگریز، یورپین اور امریکی تھے۔

اس نے شجاعت کو ایک خط لکھا اور اسے ریوے زیوی میں ایک کیفے میں چائے پر بلایا۔ شجاعت سے اس کی زیادہ دوستی نہ تھی۔ مگر چونکہ پیرس کے ہندوستانیوں کے حلقے میں شجاعت کی حیثیت مرکز کی سی تھی اور وہ ہر ایک کی تھوڑی بہت مدد کرتا تھا اس لیے محض ذہنی اور نظری مشورہ لینے میں نعیم نے کوئی ہرج نہ سمجھا۔

شجاعت نے کہا۔ "بھئی دو صورتیں ہیں۔ اگر تم بیوی سے عصمت، عفت وغیرہ کے طالب ہو تو یہاں مت پھنسو۔ ہندوستان میں تمہیں اپنے مطلب کی گھر والی مل جائے گی، دب کے رہے گی، جتنا چاہنا اتنا فیشن کرانا اس سے زیادہ نہ بڑھنے دینا۔ ایک آدھ وقت مار بیٹھو گے تب بھی بیچاری خاموش ہو جائے گی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اگر تم کو واقعی اس امریکن لڑکی سے محبت ہے تو محض محبت کی خاطر شادی کرو اور عصمت، عفت کو ڈالو چولہے میں، ان ڈھکوسلوں میں رکھا ہی کیا ہے۔ اگر لڑکی شریف ہے تو ممکن ہے ٹھیک طرح رہے۔ اگر نہیں رہی تو الگ ہو جانا۔ یہی نا کہ آدھی تنخواہ کٹوا لے گی، تم تو کہتے ہو کہ شریف ہے اور گھر کی کھاتی پیتی ہے۔ تم کو بیوقوف بنانے کے لیے تو شادی کر نہیں رہی ہے۔ تم خود اس سے شادی کرنا چاہتے ہو۔ اس لیے اگر الگ ہوئی تو آدھی تنخواہ بھی نہیں کٹوائے گی۔ پھر کیا ہے مزے ہی مزے ہیں۔"

بہت دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد شجاعت نے پھر نعیم سے کہا۔ "بھئی میں تو کسی یورپین یا امریکن لڑکی کے اتنی عمر تک کنواری رہنے کا قائل نہیں، لیکن اگر تم کو اطمینان ہی کرنا ہے تو کر کیوں نہیں

لیتے؟''

(۳)

اسی شام کو نعیم ایلس کو فولی برژیر لے گیا۔ محض اپنے حملے کے لیے نفسیاتی ماحول کو ٹھیک بنانے۔ وہاں سے ایک نائٹ کلب کو جہاں تقریباً بالکل برہنہ لڑکیاں ناچ رہی تھیں اور ایک شخص بڑی جاندار آواز میں شہوت انگیز فرانسیسی گیت گا رہا تھا۔ ایلس کو اس نظارے سے ذرا گھبراہٹ معلوم ہونے لگی اور نعیم ڈرا کہ کہیں نفسیاتی اثر اُلٹا نہ ہو۔ وہ ایلس کو اپنے کمرے میں لایا۔ اس وقت رات کے دو بج چکے تھے لیکن نسبت کے بعد سے ایلس کبھی کبھی بہت رات گئے تک نعیم کے یہاں رہتی۔

ایلس نے گھر جانے پر اصرار کیا۔ نعیم نے کہا۔ ''بہت دیر ہو چکی ہے۔ کوئی ٹیکسی ملے گی نہیں، پیدل چلیں تو دیر لگے گی۔ تم یہاں میرے پلنگ پر سو جاؤ۔ میں فرش پر سو جاتا ہوں۔''

فرش پر سونے کا تو محض بہانہ تھا۔ جب پلنگ پر اس کا منگیتر اس سے لپٹ رہا تھا تو نیند اور شامپین کے اثر میں وہ اسے ہٹاتی کیسے؟ اس نے شروع شروع میں نعیم کے بوسوں کا جواب بوسوں سے دیا۔ پھر جب نعیم کے ہاتھ اسے بہت بے قابو کرنے لگے تو اس نے اسے ہٹانا چاہا۔ اس سے کہا بھی کہ 'جاؤ۔ اب سو جاؤ۔'' جب اس نے دیکھا کہ نعیم اس پر بھی نہیں مانتا اور ہاتھوں کی جگہ اس کا جسم زیادتی کرنے پر تلا ہوا ہے تو اس نے بڑی منت سے کہا۔ ''پیارے۔ شادی سے پہلے نہیں۔ میں تمہاری خوشامد کرتی ہوں، ابھی نہیں، شادی سے پہلے نہیں۔''

لیکن خود اس کا جسم اور اس کے خون کی حدت، نعیم سے اور شامپین کے اثر سے سازش کرنے لگے۔ وہ سسکیاں لے کے رونے لگی۔

وہ ساری رات اس نے ایلس کے ساتھ گذاری۔ ایلس کے آنسو جو جسمانی اور ذہنی تکلیف سے نکلے تھے رُک گئے۔ وہ بے خیالی میں نعیم کے بوسے لیتی رہی اور لپٹتی رہی۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔

صبح کو جب وہ جانے لگی تو نعیم نے اس سے کہا۔ ''جو کچھ ہوا اس کا تمہیں افسوس ہے؟''

اس نے پیار سے نعیم کی طرف دیکھ کے کہا۔ ''نعیم پیارے میں ڈر رہی تھی۔''

نعیم نے اس کا ہاتھ چوم کے کہا۔ ''اس خیال سے کہ کہیں بچہ نہ ہو؟ ایسا معلوم ہوا تو ہم فوراً شادی

کر لیں گے۔''

اس نے پھیکی سی مسکراہٹ سے جواب دیا۔ ''شکریہ ڈارلنگ۔''

نعیم نے کہا۔ ''اور آئندہ سے میں بڑی احتیاط کروں گا۔''

ایلس نے آہستہ سے ''ہاں'' کہا۔ اس کا ہاتھ اسی طرح نعیم کے ہاتھ میں تھا۔ پھر وہ یک لخت اس کی طرف مخاطب ہوئی۔ اس کے پیلے بالوں نے ریشمی نور کا ایک نیم دائرہ سا ہوا میں بنایا اور پھر اپنی اپنی جگہ جم گئے۔ اس نے کہا۔ ''مجھے کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ بڑی قدامت پسندی کی بات ہے۔۔۔ لیکن ۔۔۔ لیکن مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ اب مجھ میں وہ پاکی باقی نہیں رہی۔''

پاکدامنی کا تصور محض مشرق کی میراث نہیں۔

(۴)

لیکن ایلس کے دل میں ہندوستان کے متعلق شکوک بڑھتے ہی گئے۔ بُولوارو زاتالیاں میں جس امریکی خاندان میں وہ آتی جاتی تھی، وہاں اس نے اپنی نسبت کا راز تو نہ بتایا تھا لیکن اس تاریخی رات کے بعد جو دن آیا اس میں ایک عجیب اتفاق پیش آیا۔ ایسے ہی اتفاقات زندگی کے اہم ترین مسائل پر بڑے گہرے اثرات ڈالتے ہیں۔ اس امریکی خاندان نے لنچ پر ایک پنشن یافتہ انگریز لفٹنٹ کرنل کو بلایا تھا جو ساری زندگی ہندوستان میں گذار چکا تھا۔

ایلس نے لفٹنٹ کرنل سے پوچھا۔ ''ہندوستان تو بڑا ہی دلچسپ ملک ہو گا۔''

ایلس کی میزبان نے اپنی مچھلی ختم کر کے کانٹا رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں ہمیشہ ہندوستان جانے کی تمنا کرتی رہی۔ بتائیے کیسا ملک ہے؟''

لفٹنٹ کرنل ریمز نے کہا۔ ''مجھے ہندوستان بہت پسند ہے۔ اعلیٰ درجے کا شکار، بنگلے، نوکر چاکر، پہاڑی اسٹیشن۔ میری رجمنٹ تقریباً ہندوستان کے ہر حصے میں رہ چکی ہے۔''

یہ لفٹنٹ کرنل کسی طرح بھی کرنل بلمپ سے مشابہ معلوم نہ ہوتا تھا۔ نہ بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ نہ انداز گفتگو میں پختہ صاحبیت تھی۔ بلند قد، داڑھی مونچھیں صاف، آنکھوں میں البتہ ذرا تیز تیز چمک۔ ایلس نے دل میں کہا۔ ''یہ متعصب نہیں ہو سکتا۔''

پھر اس نے پوچھا۔ وہاں گرمی بہت ہوتی ہوگی۔"

"بہت" کرنل ریمزے نے جواب دیا۔ "ایک بار گرمیوں کا موسم مجھے راولپنڈی میں گذارنا پڑا تھا۔ میرا سارا جسم جھلس گیا۔"

"کیا مصیبت ہوگی؟" امریکی میزبان خاتون نے کہا۔

ایلس نے اس اظہار ہمدردی کو نظر انداز کر کے کہا۔ "راولپنڈی کہاں ہے؟"

"پنجاب میں۔" کرنل ریمزے نے کہا۔ "پنجاب ہندوستان کے شمال مغرب میں ایک صوبہ ہے۔ میں بتاؤں اسے پنجاب کیوں کہتے ہیں۔ اردو اور پشتو میں پنج کہتے ہیں پانچ کو۔ آب کہتے ہیں ندی۔ اس صوبے میں پانچ ندیاں بہتی ہیں۔"

"کتنی دلچسپی کی بات ہے۔" امریکن میزبان نے ہمت افزائی کرتے ہوئے کہا۔

پھر ایلس نے اسی طرح یک لخت سوال کیا۔ "اور حیدر آباد کہاں ہے؟"

"کون سا ہائی ڈراباڈ؟" کرنل ریمزے نے پوچھا۔ "ایک ہائی ڈراباڈ سندھ میں ہے اور ایک ڈکن میں۔ ڈکن پشتو میں ساؤتھ (جنوب) کو کہتے ہیں۔"

اس پُر معلومات تصریح کے بعد ایلس کی ہمت نہ پڑی کہ وہ ہندوستان کے متعلق مزید جغرافیائی معلومات حاصل کرے۔

لیکن اب کرنل کی باری تھی۔ اس نے شکار کے قصے اور اپنی رجمنٹ کے کارنامے شروع کیے۔ جن میں بدمعاش دیسیوں کی شرارتوں کا ذکر تھا۔ "ان بدمعاش کالی چمڑی والوں کو ذرا سر چڑھاؤ تو مصیبت ہوجاتی ہے۔"

ایلس نے احتجاج کے طور پر کہا۔ "یہ تو ہندوستان کے غریب اور جاہل طبقے کا حال ہوگا لیکن وہاں متوسط طبقے کے لوگ تو بڑے شائستہ ہوں گے۔"

لیکن اس کا کیا علاج کہ انگریز کرنل جس نے ساری عمر ہندوستان میں گذاری تھی وہ متوسط طبقے کے ہندوستانیوں کے وجود کا قائل ہی نہ تھا۔ "کچھ بابو لوگ ضرور ہماری نقل کرتے ہیں۔" ان بابوؤں کے سوا کسانوں اور راجاؤں کے درمیان اس نے ہندوستان میں کسی مخلوق کو نہ دیکھا تھا۔

پھر وہ مہاراجاؤں کے ساتھ اپنے شکار کے قصے سنانے لگا۔ کس طرح دو ڈیڑھ ڈیڑھ سو، دو دو سو

بیویوں کے حرم رکھتے ہیں۔ اور یہ راجاؤں ہی پر کیا موقوف ہے، ہندوستان میں شاید ہی کوئی آدمی ہو جس کی دو تین بیویاں نہ ہوں۔

ایلس نے کہا۔ "میں تو سمجھتی تھی کہ ہندوستان میں عورتیں کم ہیں۔ جب ہی تو ہندوستانی نوجوان غیر ملکوں کی عورتوں سے شادیاں کرتے ہیں۔"

کرنل ریمزے نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور کچھ جواب نہیں دیا۔ اب وہ ایلس کی دلچسپی کا راز سمجھ گیا تھا۔

لیکن ایلس وہاں سے نکلی تو سوچ میں تھی۔

(۵)

سہ پہر کو ایلس نے نعیم سے اس ملاقات کا اور ہندوستان کے متعلق کرنل ریمزے کے بیانات کا ذکر کیا۔

"تم جانتی ہو کہ یہ سب جھوٹ ہے۔"

"ہاں پیارے۔ بالکل جھوٹ۔ میں جانتی ہوں جتنی نفرت تم لوگ ان لوگوں سے کرتے ہو بجا ہے۔"

نعیم نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ ایک لمحہ کے لیے اس کی پلکیں جھپک گئیں۔ اس کے دلی شکوک نعیم پر آئینہ ہوگئے۔

اسی وقت ٹیلیفون کر کے نعیم نے شجاعت اور اس کی البانوی محبوبہ حلیمہ کو رات کے کھانے پر شان زلیزے کے ترکی ریستوران میں مدعو کیا۔ شاید اس کے سوا ایک اور ہندوستانی نوجوان سے مل کے ایلس کی رائے بدلے۔

رات کے کھانے پر ایلس کو شجاعت کی باتوں سے اچھی خاصی دلچسپی ہوگئی۔ اس نے ہندوستان کے شہروں، دیہاتوں اور قصبوں کا ذکر کیا۔ وہاں کے سیاسی حالات کا، جس میں مجھ سے گاندھی جی نے یوں کہا اور میں نے مسٹر نہرو سے کہا کہ اصل غدار آپ ہیں، اور اس قسم کی اور بھی رائیں تھیں۔ لیکن ظاہر ہے ایلس کو وہاں کی سیاسیات سے کیا دلچسپی ہوتی۔ اس نے وہاں کی زندگی کے متعلق پوچھنا چاہا۔

"کیا ہندوستانی لڑکیوں کو لڑکوں سے ملنے کا موقع نہیں دیا جاتا؟"

"وہاں تو دو الگ الگ کیمپ ہیں۔" شجاعت نے کہا۔"ایک میں لڑکے۔ ایک میں لڑکیاں۔ جب کوئی لڑکا برسرِ روزگار ہوجاتا ہے۔۔۔ جس سے زیادہ تر سرکاری نوکری مراد ہے۔۔۔ تو جتنی اس کی بازاری قیمت ہوتی ہے، اسی قیمت کے لحاظ سے اسے ایک لڑکی مل جاتی ہے۔"

"محبت کے بغیر؟" ایلس نے ذرا دلچسپی سے کہا۔

"وہاں محبت ذرا کم کی جاتی ہے۔ اس کو بدمعاشی سمجھتے ہیں۔ ہاں اب کہیں کہیں بعض تعلیم یافتہ خاندانوں میں شادی سے پہلے بھی ذرا راہ ورسم ہوجاتی ہے۔"

حلیمہ نے کہا۔"البانیہ میں تو اب بھی وہی شادی مزے کی سمجھی جاتی ہے۔ جس میں کوئی نوجوان سردار کسی اور قبیلے کی دوشیزہ کو اٹھا لائے۔ اور پھر دو ایک پشت تک دونوں قبیلے ایک دوسرے کی جان کے دشمن رہیں۔"

ایلس مسکرائی۔ پھر اس نے شجاعت سے پوچھا۔"کیا وہاں لڑکے لڑکیاں شادی سے پہلے عموماً ایک دوسرے سے ملتے بھی نہیں؟"

شجاعت نے کہا۔"ملنا تو ایک طرف۔ اسی (۸۰) فی صدی صورتوں میں تو وہ ایک دوسرے کو شادی کے دن پہلی بار دیکھتے ہیں۔"

"کتنا رومانٹک منظر ہوتا ہوگا۔" حلیمہ خانم نے کہا۔

"ہاں بڑا ہی ڈرامائی۔" ایلس نے کہا، جواب اس گفتگو سے اور ہندوستان سے ایک غیر ذاتی دلچسپی لینے لگی تھی۔

نعیم جواب تک خاموش تھا یا کبھی کبھی حلیمہ سے ایک آدھ بات کرلیتا تھا، ایلس کے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ ایلس نے اب یہ دیکھ لیا۔

اس نے اپنا ہاتھ نعیم کے ہاتھ پر رکھا۔"اگر اس طرح ڈرامائی طور پر شادی ہی کے دن میں تم کو پہلی بار دیکھتی، تب بھی شاید میں عمر بھر تمہیں سے محبت کرتی۔" اس کے لہجے میں محبت اور طنز دونوں برابر برابر تھے۔

نعیم سوچنے لگا۔ شجاعت کو یہ سب تفصیلات بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی مگر وہ جو کہہ رہا تھا سچ تھا

اور سچ بولنے سے کس کو کون روک سکتا ہے۔

(۶)

ایلس نے اپنے والد کو اطلاع دی تھی، اس کے جواب میں اسے ایک تار ملا "ابھی عجلت نہ کرنا۔ میں طیارے پر پیرس آرہا ہوں۔ تم سے اور تمہارے ہندوستانی نوجوان سے گفتگو کروں گا۔"

ایلس نے وہ تار نعیم کو دے دیا، اور نعیم کی گود میں بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ سے کیانتی کا گلاس لے کے پینے لگی۔ گویا اس کا باپ، یہ تار، نعیم، اس کی گود، کیانتی کا گلاس سب غیر متعلق چیزیں تھیں جن پر اس کا اختیار نہیں۔ جیسے صبح شام، رات دن، گرمی، سردی، پانی، ہوا، جس کے درمیان اسے رہنا ہے۔

نعیم نے اس وقت یہ محسوس کیا، ایلس اس کے اور اپنے باپ کے درمیان بلا ارادہ اور متزلزل کھڑی ہے۔ جو زور سے جھنکا دے کر بلائے گا اس کے ساتھ وہ چلی جائے گی یا امریکہ یا ہندوستان۔

(۷)

ہروشا نعیم کی بے رُخی کی وجہ سے شاکی رہنے لگا تھا۔ نعیم کو تسلی دینے کے بجائے جب اس نے اپنے کمرے سے چلتا کیا تھا، ہروشا کے نزدیک محض ایک مذاق تھا اور اسے اس کی تکلیف تھی کہ نعیم نے اس کا اتنا اثر لیا۔

ایک شام کو ایلس پہلے بال بنوانے ریویرو ولی جارہی تھی۔ پھر اسے میری پاول کے ساتھ کہیں جانا تھا۔ آج کل ان دونوں لڑکیوں میں بڑی دوستی ہوگئی تھی۔ ایلس کو اس وقت ہمدردی اور رازداری کے لیے ایک سہیلی کی ضرورت بھی بہت سخت تھی۔ اور اب میری سے رشک باقی نہیں رہا تھا تو اس کے بجائے ایسا خلوص پیدا ہوگیا تھا جو شباب ہی کا حصہ ہے۔

وہ شام خالی تھی۔ اس لیے نعیم نے ہروشا کے کمرے کا رُخ کیا۔ دونوں نے اس درمیان میں اپنے تعلقات کی ناخوشگواری کا ذکر نہیں کیا۔ مصافحے کے ساتھ ہی ایک طرح کی گرم جوشی سے تمام غلط فہمیاں دور ہوگئیں۔

نعیم نے ہروشا سے کہا۔"میں تمہیں ایک خبر سنانا چاہتا ہوں۔ ایلس سے میری نسبت ہوگئی ہے۔"

"مبارک۔ میرے دوست" کہہ کر ہروشا نے بڑے اخلاق سے ہاتھ ملایا، اور پھر اپنی جگہ بیٹھ کے پائپ پینے لگا۔ "مجھے ذرا ذرا شک ضرور ہو رہا تھا کہ معاملہ سنجیدہ ہوتا جا رہا ہے۔"

"ہاں، ہم دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہے۔"

"بے شک، بے شک۔" ہروشا نے کہا۔

نعیم کو ذرا جھنجلاہٹ معلوم ہوئی۔ اب بھی ہروشا اس کا مذاق اُڑا رہا تھا۔ اسی وقت دروازہ کسی نے آہستہ سے کھٹکھٹایا۔ یہ کراکسلے تھے۔

ہروشا نے کہا: "میں نے کراکسلے کے ساتھ پلاس دے ترتر اور موں مارتر رنڈی خانے نہیں، پہاڑی چلنے کا وعدہ کیا تھا۔ چلتے ہو تم بھی؟"

"چلو" نعیم نے کہا۔

زمین دوز ریل میں کراکسلے نے نعیم سے اس کی اور ایلس کی نسبت کے متعلق پوچھا اور مبارک باد دی۔ "مجھے یقین ہے۔ تم دونوں بہت خوش رہو گے۔ بیوی تمہیں بڑی خوبصورت ملی۔"

"ہاں اس ٹیڑھی ٹانگوں والی ٹھگنی سی مخلوق میں جس کو عورت کہتے ہیں، وہ ایسی بری نہیں۔" ہروشا نے پائپ کی راکھ جھڑک کے رائے دی۔

موں مارتر کی پہاڑی سے تینوں نے پیرس کو دیکھا۔ یہ شہر جو، ان کے قدموں کے نیچے جگمگا رہا تھا، اس کی میلی میلی دیواریں، اور اس کی کھڑکیاں جو لندن کی کھڑکیوں سے کہیں زیادہ بدشکل معلوم ہوتی ہیں لیکن جن میں قدامت کی بے نیازانہ شان ہے، اور ان کے آباد اور بارونق محلے۔ اس کی روشوں پر بساطیوں اور کتاب فروشوں کی دکانیں، اس کی سڑکوں پر شہریوں کے لباس، اور ان کی مجموعی آوازوں کا ایک ہلکا سا شور۔ پیرس، دنیا کا حسین ترین شہر۔

وہاں سے تینوں دوست پلاس دے ترتر پہنچے۔ یہاں کے جھونپڑیوں جیسے رنگین مکانات جو معلوم نہیں کتنی صدیوں قبل بنے تھے، ہروشا کو بڑے ہی دلکش معلوم ہوتے تھے۔

نعیم نے کہا۔ "ان پرانے جھونپڑوں جیسے مکانوں میں مجھے تو کوئی خاص بات نہیں معلوم ہوتی۔ ایسے کھنڈر تو ہمارے ہندوستان میں بہت ہیں۔"

"دنیا میں صرف ایک پلاس دے ترتر ہے اور وہ یہ ہے۔" ہروشا نے کہا۔

"اور ہم شام کا کھانا یہیں کسی ریستوران میں کھائیں گے۔" کراکسلے نے کہا۔

"بہت ٹھیک۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ ہمارے ساتھ کوئی عورت نہیں۔" ہروشا نے کہا۔

نعیم مسکرایا۔ وہ سب ایک چھوٹے سے مکان میں پہنچے جس کا حدود اربعہ اور اندر کا جغرافیہ تقریباً ایسا ہی تھا جیسے لکھنؤ کے قریب کے کسی دیہات کے زمیندار کے گھر کا۔ یوں کہئے کہ وہ ردولی شریف اور پومپی آئی کے فن ہائے تعمیر کے امتزاج کا نمونہ معلوم ہوتا تھا۔ ریستوران کا فرنیچر اعلیٰ ترین قسم کا تھا۔ ایک دالان میں ایک آرکسٹرا رومانی نغمے بجا رہا تھا۔ سارا مقام اجنبی سیاحوں اور بالخصوص امریکی سیاحوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ایک اور ہندوستانی نوجوان کے ساتھ ایک سویدستانی (جو کم از کم اپنے انگریزی لہجے سے سویدستانی معلوم ہو رہی تھی) لڑکی کھانا کھا رہی تھی۔ اس کو دیکھ کر ہروشا نے افسوس کا اظہار کیا کہ اس کے ڈھلتے ہوئے سینے سے شباب پھسلتا جا رہا ہے، پھر بھی وہ نعیم کے اس ہم وطن کو کس کامیابی سے بیوقوف بنا رہی ہے۔

(۸)

جب نعیم اپنے کمرے میں واپس پہنچا تو فضا میں اوائل ستمبر کی رات کی ٹھنڈک تھی۔ میز پر ایک پرزہ پر کچھ لکھا ہوا تھا۔ یہ ایلس کی چٹھی تھی۔ "میرے والد آگئے ہیں اور تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ تم سیدھے اوتل ویبری آؤ۔ میں بھی وہیں جا رہی ہوں۔ پیار۔ ایلس!"

اس وقت اس چٹھی کو پا کے وہ ذرا پریشان ہوا۔ بظاہر پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ ایلس کے والد تو بہرحال آنے والے تھے۔ ان کی مخالفت بھی یقینی تھی۔ ایلس پھر بار بار یقین دلاتی رہی تھی کہ وہ اپنے والدین سے بڑھ کے اسے چاہتی تھی لیکن فتح کی اُمید ذرا کم معلوم ہوتی تھی۔

اس نے بجائے میترو سے جانے کے ٹیکسی لی تاکہ جلد پہنچ سکے۔ اوتل ویبری روشنیوں اور شراب کے گلاسوں سے جگمگا رہا تھا۔ امیر فیشن ایبل بوڑھیاں، شانے ہلا ہلا کے باتیں کرنے والے فرانسیسی، شانے ہلا ہلا کے ناواقفیت کا اظہار کرنے والے خادم، اعلیٰ ترین قسم اور قیمت کے ڈنر جیکٹ پہنے ہوئے انگریز جن کے ایک ہاتھ میں گلاس ہوتا اور دوسرا ہاتھ پتلون کی جیب میں اور ان کا اعلیٰ پبلک اسکول کا لہجہ۔۔۔ ان سب کو دیکھتا ہوا نعیم ہوٹل کے کاؤنٹر کے قریب بڑھا کہ ایلس کے والد مسٹر کلاڈل کے

کرے کا نمبر پوچھے۔

لیکن اس اثنا میں ایلس نے اسے دیکھ لیا تھا۔ جو دور دیوار کے قریب اپنے والد کے پاس بیٹھی تھی۔ وہ اسے بلانے کے لیے تیزی سے آئی۔ نعیم نے ایلس کی آواز سنی۔ اس کا سارا خون کنپٹیوں میں کھنچ کر آ گیا۔ مسٹر کلاڈل کے پاس جاتے ہوئے اسے آئی۔ سی۔ ایس کے انٹرویو اور میڈیکل بورڈ کے لیے جانا یاد آ گیا۔ انتخاب سے پہلے دل کس تیزی سے دھڑکتا ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ ذرا سی لغزش ذرا سی کمزوری اس وقت خطرناک ہے۔ ایلس کے ساتھ اس ہندوستانی نوجوان کو آتا دیکھ کے مسٹر کلاڈل کی نگاہوں نے سر سے پیر تک نعیم کا جائزہ لیا۔ سختی سے نہیں، انتہائی متانت کے ساتھ۔ پھر وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا قد بلند تھا اور بال ایلس کے جیسے تھے، پیلے بال تھے، چہرے پر اور ہاتھوں کی جلد پر بھورے بھورے سے دھبے تھے جو نعیم نے اکثر امریکنوں کی جلد پر دیکھے تھے۔ خندہ پیشانی سے اور بڑی ہی مہربان مسکراہٹ سے اس نے نعیم کا خیر مقدم کیا۔ شاید وہ جانتا تھا کہ اس کے طرز عمل کی ذرا سی بھی سختی ایلس کو ہمیشہ کے لیے اس نوجوان کے سپرد کر دے گی۔ بہر حال نعیم کے دل میں یہی خیال گذرا۔

ایلس نے تعارف کرایا۔ ''میرے والد۔ اور یہ نعیم ہے۔''

کلاڈل نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا، نہ سرد مہری سے اور نہ گرم جوشی سے۔ اس کی نگاہیں نعیم کے چہرے میں پیوست ہوئی جا رہی تھیں۔ آخر جوہری کی نظر تھی۔ ''آپ سے مل کے بہت خوشی ہوئی۔ جب سے مجھے ایلس نے اپنے فیصلے کی اطلاع دی ہے، میں آپ سے ملنا چاہتا تھا۔ ۔ ۔ کوئی چیز پیو گے؟''

نعیم نے معافی چاہتے ہوئے کہا۔ ''نہیں۔ میں ابھی کھانا کھا کے آیا ہوں۔''

''پھر بھی کچھ۔ کافی ہی سہی؟'' اور انہوں نے گارسوں کو تینوں کے لیے کافی لانے کو کہا۔

نعیم نے اب ذرا غور سے ایلس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ باوجود عصبی اور تقریباً مصنوعی مسکراہٹ کے اس پر ہلکی سی سراسیمگی کے آثار تھے۔

دو تین منٹ تک مکمل خاموشی رہی۔ نعیم نے محسوس کیا کہ پھر سارا خون کھنچ کر اس کی کنپٹی میں آ رہا ہے۔

بالآخر ایلس سے نہ رہا گیا۔ یہ مکمل، نا قابل بیان، نا قابل برداشت خاموشی دو تین منٹ اور رہتی تو وہ چیخ پڑتی۔ ''نعیم میری والدہ بیمار ہیں۔''

نعیم نے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے۔''

کافی آ گئی۔ ایلس نے کافی بنانی شروع کی۔

نعیم نے پھر پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟ مرض کیا ہے؟''

مسٹر کلاڈل نے کہا۔ ''اعصاب کی خرابی۔''

پھر دو تین منٹ تک خاموشی طاری رہی۔ پھر یک لخت مسٹر کلاڈل نے کہا۔ ''اب تو ہندوستان میں گرمیوں کا موسم ختم ہو چکا ہوگا۔''

نعیم نے کہا۔ ''جی ہاں! ستمبر میں بالعموم سارے ہندوستان میں گرمی ختم ہو جاتی ہے، جنوب تو جون میں ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔''

مسٹر کلاڈل نے مسکرا کے کہا۔ ''ہاں مجھے وہاں کے جون کی گرمی خوب یاد ہے۔''

''کیا آپ ہندوستان گئے تھے؟''

''ہاں والد کو ہندوستان بہت پسند آیا تھا۔ ہم بچپن میں قصے سنا کرتے تھے۔'' ایلس نے کہا۔ ''کیوں ابا تم وہاں ہاتھی پر بھی بیٹھے تھے نا۔ کیوں ابا۔ ہم سب لوگوں کو اس کا بڑا فخر ہے۔ ابا کی ہاتھی پر ایک تصویر بھی ہے۔''

''آپ کتنے دن ہندوستان میں رہے؟''

''چند ہفتے۔'' مسٹر کلاڈل نے ایک سگار نکال کے جلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''کوئی اٹھارہ سال ہوئے ہیں، جنگ کے بعد پورے ایشیا بھر میں پھرتا رہا۔ جواہرات جمع کرتا اور خریدتا ہوا۔ ہندوستان، چین، جاوا، سمرقند، ایران۔''

''بڑا دلچسپ سفر رہا ہوگا۔''

''بڑا دلچسپ۔''

''ہندوستان آپ کو پسند آیا؟''

''ہاں بہت۔ اور اگر گرمیاں نہ ہوتیں تو اور پسند آتا۔ میرا پروگرام ایسا تھا کہ غلط موسم میں مجھے وہاں جانا پڑا لیکن کشمیر پہنچ کے مجھے وہاں کی گرمی کا معاوضہ مل گیا۔''

پھر ایلس نے پوچھا۔ ''ابا۔ کیا وہاں آپ ہندوستانیوں سے ملے؟''

"ہاں کئی سے بعض مشہور لوگوں سے بھی، جو اب اور بھی زیادہ مشہور ہیں، جیسے موہن داس گاندھی لیکن زیادہ تر میرا سابقہ تاجروں ہی سے رہا۔ ہندوستانی مجھے بہت پسند آئے۔ سادہ اور مہمان نواز۔"

اس کے بعد نعیم کی جھجک اور وہ امید سے زیادہ بیم کی کیفیت کم ہو گئی۔ اور وہ زیادہ بے تکلفی سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ یہاں تک کہ جب نفسیاتی موقعہ آ گیا تو مسٹر کلاڈل نے دفعتاً یہ پوچھا۔

"کتنے عرصے سے آپ ایلس کو جانتے ہیں؟"

"اب کوئی ڈھائی مہینے ہوئے ہوں گے۔"

ایلس نے کہا۔ "لیکن وقت کی بجائے خود کوئی اہمیت نہیں۔"

"بیشک۔ بیشک میری پیاری بیٹی۔ وقت کو مدت سے تو میں بھی نہیں تول رہا ہوں۔ میں تم دونوں کے فیصلے کی پوری عزت کرتا ہوں اور اس میں دخل نہیں دینا چاہتا لیکن کچھ اور باتیں ہیں۔۔۔۔"

نعیم نے ایلس کے چہرے پر بجائے مقابلے کے تذبذب کے آثار دیکھے، اور اس کا دل بیٹھ گیا۔

مسٹر کلاڈل نے کہنا شروع کیا۔ "پیرس عجیب مقام ہے۔ یہاں کی زندگی شامپین کے اثر کی سی ہے۔ یہاں انسان اکثر اپنا وسیع تر ماحول بھول جاتا ہے۔ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے جذباتی قدم اکثر یہاں متزلزل ہو جاتے ہیں۔ خود مجھ پر یہ گذر چکی ہے۔ ایلس تمہاری ماں سے شادی کرنے سے پہلے اسی پیرس میں میں ایک فرانسیسی لڑکی سے شادی کرنے کا وعدہ کر چکا تھا۔"

"پھر؟" ایلس نے پوچھا۔ نعیم نے محسوس کیا کہ وہ بہت غور سے اپنے باپ کا ایک ایک لفظ سن رہی ہے۔

"پھر امریکہ واپس آ گیا۔ اس سے وعدہ کر کے کہ سال بھر بعد آ کے شادی کروں گا اور اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ لیکن سنسناٹی میں چند ہی مہینے گذرے تھے کہ فرانس اور پیرس اور اس لڑکی کا خیال شامپین کے نشے کی طرح زائل ہونے لگا۔ خط و کتابت کم ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ جب میں نے عزت نفس کے تقاضے سے مجبور ہو کے نسبت توڑنے کا خط اسے لکھا تو معلوم ہوا کہ پندرہ دن ہوئے اس کی شادی ہو چکی ہے۔ ایلس، تمہاری والدہ اب بھی کبھی کبھی اس واقعہ کا مذاق اڑاتی ہیں۔"

"لیکن ڈیڈی اگر آپ دونوں کو واقعتاً ایک دوسرے سے محبت ہوتی۔۔۔ تو وہ ایک دوسرے سے دور ہو جانے کے بعد بھی باقی رہتی۔"

"بالکل ٹھیک۔ ٹھیک میری پیاری بیٹی۔ یہی تو محبت کے اصلی ہونے کی پہچان ہے۔ اگر وہ اصلی ہے تو سنسناٹی ہو یا پیرس، اس میں فرق نہیں آنے پائے گا۔ وقت اور مسافت اسے گھٹا نہیں سکیں گے۔ یہی تو محبت کا امتحان ہے۔ کیا تم اس میں پوری اتر سکو گی؟"

"میں نعیم کو ہمیشہ چاہتی رہوں گی۔" ایلس نے اپنے باپ سے آہستہ سے کہا اور اس کے ہاتھ نے میز کے نیچے نعیم کا ہاتھ ڈھونڈھ کے مضبوط پکڑ لیا۔

"وقت اور مسافت ہی تمہارے دعوے کو سچ یا جھوٹ ثابت کر سکتے ہیں۔۔۔" مسٹر کلاڈل نے مسکرا کے جواب دیا۔۔۔ وہ مڑ کے بڑی متانت اور شفقت سے نعیم سے مخاطب ہوئے۔ "مسٹر نعیم حسن! آپ کے خلاف میرے پاس کوئی چیز نہیں۔ رنگ کی تفریق کا میں قائل نہیں ہوں۔ میرے آباؤ اجداد ابراہیم لنکن کی طرف سے حبشیوں کو آزادی دلانے کے لیے لڑے تھے۔ اس کے علاوہ میں ہندوستانیوں کو سفید نسل ہی کی ایک شاخ سمجھتا ہوں۔ اس لیے یہ نہ سمجھنا کہ میں نسلی تعصب کی وجہ سے دخل دینا چاہتا ہوں۔۔۔"

"جی۔" نعیم نے آہستہ سے کہا۔ ایسا تذبذب اس نے فضا میں اس سے پہلے کبھی نہیں محسوس کیا تھا۔

"مجھے اپنی لڑکی سے بہت محبت ہے۔ اور میں اب تک اس کی ہر آرزو پوری کرتا رہا۔ اس کی ماں بھی اسے بہت چاہتی ہیں۔" مسٹر کلاڈل اپنی واسکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے۔ "اس لیے ہمیں اس کے مستقبل سے بہت دلچسپی ہے۔ اس کی جو خوشی ہو اس میں ہم دخل نہ دیں گے بشرطیکہ ہمیں اس کا یقین ہو جائے کہ فی الحقیقت اس کی یہی خوشی ہے۔"

"آپ کی صاحبزادی خود اس کا اقرار کر چکی ہیں۔ کیوں ایلس؟"

"ہاں مجھے تم ہی سے محبت ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ ہم دونوں بہت خوش رہیں گے۔"

"بے شک۔ بے شک۔" اس کے باپ نے اس اطمینان سے مسکرا کے جواب دیا گویا وہ اس کے الفاظ کا یقین نہیں کرتا۔

برافروختہ ہو کے ایلس نے جواب دیا۔ "ڈیڈی۔ آپ میرے ساتھ اس طرح پیش نہیں آ سکتے جیسے کسی ڈھائی برس کے بچے کے ساتھ۔"

"نہیں۔ میری بیٹی۔ میں جانتا ہوں تم بڑی ہو گئی ہو۔" اس نے دلاسا دینے کے لیے کہا۔

اور اگر آپ مجھے روپیہ وغیرہ دینا نہیں چاہتے تو مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔ نعیم کی تنخواہ میں ہم دونوں کی گزر ہو جائے گی۔"

"یہ سن کے مجھے بڑی خوشی ہوئی۔" اس کے باپ نے جواب دیا۔ "اگر میں تمہارا باپ نہ ہوتا تو مجھے یقین بھی آ جاتا کہ تم نے جو فیصلہ کیا ہے وہ وہی فیصلہ ہے جو تمہیں کرنا چاہئے تھا۔ تمہارے حصے کا روپیہ ہر صورت میں تمہیں ملے گا۔ اس کا تم یقین رکھو۔ تمہارا یہ خیال بھی غلط ہے کہ میں یا تمہاری والدہ تمہاری اس نسبت کے مخالف ہیں۔ ہمیں محض شک ہے۔۔۔۔"

"شک۔ شک۔ شک۔" ایلس نے کہا۔ "ڈیڈی آپ اسی طرح کی باتیں کرتے رہے تو میں چیخنے لگوں گی۔"

ایلس کے اس جواب کی پروا کیے بغیر مسٹر کلاڈل نے نعیم سے مخاطب ہو کے کہا۔ "اس دس منٹ کے عرصے میں تمہارے متعلق میں نے صرف ایک رائے قائم کی ہے اور وہ یہ کہ تم شریف ہو۔ اس لیے میں تم سے اپیل کرتا ہوں۔ تمہیں ایلس سے پہلی بار ملے کتنے دن ہوئے؟"

"تقریباً ڈھائی مہینے۔" نعیم نے کہا۔

"اب تم ہی بتاؤ۔ کیا صرف ڈھائی مہینے کی واقفیت اس کے لیے کافی ہے کہ دونوں ساری عمر ساتھ رہنے کا تصفیہ کر لو؟ اور پھر وہ بھی ایک ایسے ملک میں جو تم دونوں میں سے ہر ایک کے لیے اجنبی ہے۔"

نعیم نے ذرا تلخ لہجے میں جواب دیا۔ "لیکن معاف کیجئے گا۔ وقت کی مقدار واقفیت کے جانچنے کا صحیح پیمانہ نہیں ہے۔ بہت سے لوگوں کو آپ سالہا سال سے جانتے ہوں گے، ان سے آپ اچھی طرح واقف نہ ہو سکے ہوں گے لیکن چند ایسے بھی آپ کے دوست ہوں گے جن کو بہت کم عرصے میں آپ بہت اچھی طرح جان گئے ہوں گے۔"

"بالکل ٹھیک، بالکل ٹھیک۔ میں کب کہتا ہوں کہ یہ ممکن نہیں۔ نہ میں نے یہ کہا کہ تم دونوں کو ایک دوسرے سے محبت نہیں۔ میں تم دونوں سے محض یہ درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے اپنی محبت کی آزمائش کر لینے دو۔ اس کی آزمائش کر لینے دو کہ تمہاری محبت عمر بھر باقی رہے گی۔ پھر تمہاری نسبت اور شادی کی سب سے زیادہ خوشی مجھ ہی کو ہو گی۔

"اور ڈیڈی آپ کی آزمائش کیا ہے؟" ایلس نے اس لہجہ میں سوال کیا گویا وہ دنیا کے ہر امتحان کے لیے تیار تھی۔

اس کے باپ نے کہا۔ "ایلس! میرا امتحان یہ ہے۔ تم میرے ساتھ ہوائی جہاز پر کل ہی امریکہ چلو۔ سنسناٹی میں اپنی ماں سے ملو۔ اپنے پرانے دوستوں کے ساتھ چھ ماہ گذارو۔ اس درمیان میں تم نعیم سے خط و کتابت کر سکتی ہو۔ اگر چھ ماہ بعد بھی تم کو اپنے اس نوجوان سے ویسی ہی محبت رہے جیسی اب ہے تو میں یہ سمجھوں گا کہ تم اس پہلے امتحان میں کامیاب ہو گئیں۔"

نعیم کا دل بیٹھنے لگا۔ اوقیانوس کا پانی بڑا ٹھنڈا ہوتا ہے۔ جب دو دلوں کے درمیان ایسا بحرِ ذخار حائل رہے تو ممکن ہے دلوں کی آگ ٹھنڈی پڑ جائے۔ نہیں، اس کا ٹھنڈا پڑ جانا یقینی ہے۔ سنسناٹی میں ایلس پھر ان نوجوانوں سے ملے گی جو اسکول اور کالج میں اس کے ساتھ پڑھ چکے ہوں گے۔ اس کے بچپن کے دوست اور رفیق، اس کے ہمسائے۔ وہ ان کے ساتھ ہنسے گی، بولے گی، ناچے گی۔ اور رفتہ رفتہ وہ پیرس کے اس واقعے کو اور خود اس کو ایک خواب سمجھنے لگے گی۔

ایلس اب تک کسی نتیجے پر نہ پہنچی تھی۔ برابر سوچ رہی تھی۔

اس کے والد کی نگاہیں اس کا مذاق اڑا رہی تھیں۔ اس کی تمام تر نفسیاتی گہرائیاں، تمام نامحسوس کیفیتیں اس دنیادار کے سامنے روشن تھیں۔

اس کے باپ نے کہا۔ "ایلس تم امتحان سے ڈرتی ہو؟"

نعیم کہنا چاہتا تھا کہ آپ اپنی لڑکی کی نفسیاتی کمزوری سے بے جا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ مگر الفاظ اس کی زبان تک نہ آ سکے۔ اس کا خون کھول رہا تھا۔

"ڈیڈی۔ میں تمہارے کسی امتحان سے نہیں ڈرتی۔" ایلس نے کہا۔ "میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔ تم کل جاؤ گے تو کل سہی۔ اور میں تمہیں بتا دوں گی۔"

"ایلس۔ یہ غضب نہ کرنا۔" نعیم نے بے اختیار ہو کے کہا۔

"نعیم۔ تم۔ تم بھی یہ سمجھتے ہو کہ میری محبت چھ مہینے میں مر جائے گی؟ تم، جسے میں نے سب کچھ دے ڈالا۔"

"پیاری ایلس! مجھے معاف کرنا۔" نعیم نے کہا۔ لیکن اس کا دل اوقیانوس میں میلوں نیچے تہ کی

طرف ڈوبا جاتا تھا گویا اس پر کئی من سیسے کا وزن ہو اور اوقیانوس کی سطح پر امریکہ جانے والے جہاز جارہے تھے۔ "نارمنڈی" اور معلوم نہیں کتنے خوبصورت، خوبصورت جہاز جن کے عرشوں پر رات بھر ناچ ہوتا ہے۔ اور جن کے حوضوں میں ننگی پیٹھ والی امیرزادیاں نہایا کرتی ہیں۔ اور ان سے اُوپر خاموش طائروں کی طرح اُڑتے ہوئے طیارے۔

مسٹر کلاڈل نے اس خاموشی کو توڑا۔ "ایلس! میں خوش ہوں کہ تم نے میرے چیلنج کو منظور کیا۔ میں تم دونوں سے اس کا وعدہ کرتا ہوں کہ اگر چھ ماہ بعد ایلس فیصلے پر اڑی رہی تو میں اس کو خود یہاں لا کے پہنچا جاؤں گا۔ میرے عزیز نوجوان تم ناراض تو نہیں ہوئے؟"

نعیم نے میز سے اٹھ کے کہا۔ "مسٹر کلاڈل اس وقت تو فتح آپ کی ہوئی ہے، میرے ناراض ہونے یا نہ ہونے کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔ فیصلہ ایلس کے اختیار میں تھا۔ اب مجھے اجازت ہو۔"

ایلس بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ "ڈیڈی! مجھے کل تو آپ کے ساتھ جانا ہی ہے۔ میں آج رات کے دو تین گھنٹے نعیم کے ساتھ ادھر اُدھر پھر کے گذارنا چاہتی ہوں۔ آپ برا تو نہیں مانیں گے؟"

"بالکل نہیں۔" مسٹر کلاڈل نے کہا۔ وہ اپنی لڑکی سے اتنی اچھی طرح واقف تھے کہ انہیں یقین تھا، اب یہ نوجوان ہندوستانی ایلس کی کتنی ہی خوشامد کیوں نہ کرے وہ امریکہ جانے کا وعدہ نہ توڑے گی۔

مسٹر کلاڈل نے نعیم کا ہاتھ گرم جوشی سے دبایا لیکن ان کی آنکھوں سے ایک قسم کی بے رحم ذہانت برستی تھی۔

نعیم کا بازو پکڑے ایلس ہوٹل سے باہر آئی۔

نعیم نے پوچھا۔ "کہاں چلوگی؟ ڈوم یا کوپول؟"

ایلس نے اس سے لپٹ کے کہا۔ نہیں پیارے تمہارے کمرے۔" اور وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

(۹)

دوسرے دن جب ایک طیارہ ایلس کو مغرب کی طرف اڑائے لیے جارہا تھا اور نظر سے غائب ہو رہا تھا، نعیم نے محسوس کیا کہ گویا وہ خود اس طیارے سے ریشمی چھتری کے ذریعے ابھی ابھی اترا ہے۔

ایلس اس پر کیسے چھا گئی تھی، وہ زندگی کو بھول سا گیا تھا اور اب جو وہ ناامیدی اور مایوسی سے اس غائب ہوتے ہوئے طیارے کو دیکھ رہا تھا، تو اسے معلوم ہوا کہ زندگی، تیز رو، وحشت ناک زندگی، خالق زندگی، ظالم زندگی، انسان، اس کے بنائے ہوئے مکانات کی ہوا سے کھڑکھڑانے والی کھڑکیاں، تیز چلتی ہوئی موٹریں، اس کے دوستوں کے ہنستے ہوئے، بناتے ہوئے، تسلی دیتے ہوئے چہرے، لڑکیاں، ہزاروں لڑکیاں، ان کے جسموں کی لچک، اس کے سائے، ان کی رفتار، ان کی پنڈلیاں ان کے سینے، اور کاندھے ہلا ہلا کر باتیں کرتے ہوئے فرانسیسی اور خوبصورت پیرس، پیرس کے باغات، عجائب خانے، اور لندن اور ہندوستان اور حیدرآباد، اور حیدرآباد کی سیمنٹ کی سڑکیں اور سیندھی پینے والے امراء، اور فرانس میں شامپین پینے والے سیاح اور ہزاروں لاکھوں طالب علم۔۔۔ ان سب کے درمیان اب وہ پھر تنہا رہ گیا۔ بالکل تنہا۔ اس کا دل بار بار شک کر رہا تھا کہ ایلس اب کبھی واپس نہ آئے گی۔ وہ کبھی اپنے امتحان میں پوری نہ اترے گی۔

(۱۰)

اسی توال میں بے شمار سڑکیں آکر ملتی ہیں، اور بیسیوں موٹریں تیزی سے اِدھر اُدھر گذرتی ہیں۔ اور سڑک کے پار جاتے جاتے موٹروں کے اس رواں اور تیز ہجوم میں جب نعیم ذرا ٹھٹکا تو ہرو شانے اس کا ہاتھ پکڑ کے اور ذرا گھسیٹ کے کہا۔ "سڑک کے پار جاتے ہوئے تم ہمیشہ اس قدر ڈرتے کیوں ہو؟ تم نہ ٹھہروگے تو موٹر خود ٹھہر جائے گی۔ اور یوں راستے میں کھڑے ہو جاؤ گے تو کسی ٹیکسی کا ڈرائیور موٹر ٹھہرا کے کوئی نامناسب سا الفاظ کہہ دے گا۔"

اس پر نعیم نے مسکرا کے اپنے دل میں کہا۔ "کون کہتا ہے کہ میں دنیا میں بالکل اکیلا ہوں۔"

✓

دسواں باب

گریز

اسی روز شام کو راج کمار، ریوساں دینی میں اعجاز کے کمرے میں اپنی سالگرہ کی تقریب میں پارٹی دے رہے تھے۔ نعیم، جس کو ایلس کی یاد بری طرح ستا رہی تھی، اپنے آپ سے بھاگ کر کہیں پناہ لینا چاہتا تھا۔ وہ سب سے پہلے ریوساں دینی پہنچا۔ وقت سے آدھا گھنٹہ پہلے۔ میزبان اور اس کے قریبی دوستوں کے سوا ابھی تک اور کوئی نہ آیا تھا۔ شجاعت وہاں تھا۔ بہت تپاک سے ملا اور ایلس کے جانے کا حال سن کے کہنے لگا۔ ''اچھا ہی ہوا۔ کہاں کا جھول پال رہے ہو۔ کیوں اس مصیبت میں مبتلا ہوتے ہو۔''

اعجاز صاحب شغل فرما رہے تھے اور گہری سوچ میں تھے۔ بورژوا تمدن سے گریز فرمانے کے لیے بادۂ جام سے غم غلط کر رہے تھے۔ حلیمہ خانم البانیہ کے جرنیلوں کی تعریف کر رہی تھی۔ علی پاشا کی بائرن نے بڑی ستائش کی ہے۔ اس پر اعجاز صاحب کہہ رہے تھے۔ ''یہ سب چور تھے۔ ڈاکو تھے۔ خواہ وہ علی پاشا ہوں یا خود لارڈ بائرن، اس کمینے بورژوا شاعر کا بھی عجب حال تھا۔ جمہوریت کی صدا بلند کرتے رہے اور یونان کا تاج پیش کیا گیا تو قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے۔'' راج کمار خادماؤں سے ہنستے بولتے

اور ان کی کمر میں ہاتھ ڈال ڈال کے پارٹی کے ساز و سامان کی تیاری کر رہے تھے۔ برف سے بھری ہوئی بالٹیوں میں شامپین کی بوتلیں رکھی جا رہی تھیں، ان کی سویدی محبوبہ بلیگا برج اشتروم جس کی عمر تیس کی ہو گی اور چہرے سے پینتیس کی معلوم ہو رہی تھی، انہیں مدد دے رہی تھی اور نوجوان فرانسیسی خادماؤں کی طرف ان کا رجحان دیکھ کے بار بار پیار سے کہتی۔ ''ڈارلنگ تم بڑے شریر ہو۔''

پھر مہمان آنے شروع ہوئے۔ غازی الدین صاحب کے ساتھ دو لڑکیاں تھیں۔ ایک پستہ قد، سیاہ بالوں والی، اور ایک اور لڑکی جس کی صورت اگرچہ پھیکی پھیکی تھی لیکن اس میں نمک تھا۔ غازی الدین سے نعیم آکسفرڈ اور لندن میں مل چکا تھا۔ وہ لندن میں جغرافیہ کی ڈگری کے لیے پھر رہے تھے۔ میڈا ویل میں انہوں نے اور ایک پنجابی لڑکے ورما نے ایک ساتھ فلیٹ لے رکھا تھا۔ اس پستہ قد لڑکی کا تعارف انہوں نے ''گرٹروڈ سیم سن'' کہہ کے کرایا۔ پھر نعیم سے اردو میں کہا۔ ''میں اس کو آدھی کہتا ہوں۔ اس کا قد اوسط انسان کے نصف کے برابر ہے۔ مگر بڑی گرم ہے'' دوسری کا تعارف انہوں نے ''مے رابنسن'' کہہ کے کرایا۔ پھر انگریزی ہی میں پوچھا۔ ''بتاؤ یہ کس قوم سے ہے؟''

یہ لڑکی انگریزی بلا کسی غیر ملکی لہجے کے بولتی تھی۔ نعیم نے کہا۔ ''انگریز!''

اس لڑکی نے جواب دیا۔ ''میں اتنی ہی انگریز ہوں، جتنے آپ ہیں۔ میرے والد غرب الہند کے رہنے والے حبشی ہیں اور میری ماں نیوزی لینڈ کی۔ مجھے اپنے باپ پر فخر ہے۔''

اس لڑکی کے بازو بہت گداز تھے، سینہ چوڑا تھا، اور ہونٹ پتلے تھے۔ لیکن نعیم باوجود اس لڑکی کے اس بیان کے سوچ رہا تھا کہ غازی الدین نے اس کی نسل اور قوم کا ذکر چھیڑا ہی کیوں؟ ممکن ہے اسے برا معلوم ہوا ہو۔ اس بدمذاقی کی ضرورت ہی کیا تھی۔

مے رابنسن، اپنے چھوٹے قد والی انگریز ساتھی سے کہہ رہی تھی'' ۔۔۔ نہیں، ہم میں سے بعض کو رنگ کا بڑا احساس ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں جو لڑکیاں ذرا سانولی ہوتی ہیں وہ کالی لڑکیوں کو بڑی حقارت سے دیکھتی ہیں۔ میں بالکل سفید ہوں۔ مگر مجھے اس کا احساس نہیں۔''

اور غازی الدین نعیم سے کہہ رہا تھا۔ ''یار یہ دونوں لڑکیاں بڑے مزے کی ہیں۔ ان دونوں کو ساتھ ساتھ سنبھالنا مشکل ہے۔ ایک کو تم لے جاؤ۔ تمہارے ساتھ اور کوئی تو نہیں؟ ۔۔۔ جس کو چاہو لے جاؤ۔ اگر حبشن کا مزہ ابھی تک نہ چکھا ہو تو مے کو لے جاؤ اور پھر سفید حبشن اتنی گرم ہے۔ آرٹ اسکول میں

پڑھتی ہے۔۔۔ مگر یار، ان حبشیوں کی ہم سے تم سے تسلی نہیں ہوتی، انہیں تو حبشی ہی چاہیے۔ جس یورپین لڑکی کو ایک بار کسی حبشی کا مزا لگتا ہے، پھر وہ اسے نہیں چھوڑتی۔''

اتنے میں ڈاکٹر راجندر ناتھ آئے۔ اٹھائیس سال کی عمر۔ لندن میں ڈاکٹری پڑھ چکے تھے اور اب پیرس کے مدرسۂ طبیہ میں درس لے رہے تھے۔ گہرا سانولا رنگ، میانہ قد، لیکن چہرے کے خدوخال مناسب اور خوبصورت، ہنستے تھے تو گالوں میں گڑھے پڑتے تھے۔ اکثر ہفتے کے ختم پر تفریح کے لیے آکسفورڈ آتے تھے اور ان کی نعیم سے ملاقات تھی۔

پھر راجہ ہمت نواز ونت آئے۔ جہاز کے ساتھ کے بعد سے اب تک نعیم سے ان کی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ آتے ہی لپٹ گئے۔ ان کے ساتھ ایک لڑکی تھی۔ بڑی ہی خوبصورت۔ ایک یونانی مجسمہ سا جس میں جان تھی اور جس کے منہ سے بو آتی تھی۔ مون پرناس کے ایک چھوٹے سے نائٹ کلب میں ننگی ناچا کرتی تھی۔ راجہ صاحب اسے وہاں سے اڑا لائے تھے۔ نعیم سے کہنے لگے۔ ''بڑی زوردار پٹھیا ہے۔''

راجہ صاحب کے آتے ہی پارٹی گویا شروع ہوگئی۔ گراموفون پر انہوں نے ریکارڈ رکھا۔ اپنی پٹھیا جس کا نام ''ژارژت'' تھا۔۔۔ کو گھسیٹ کر ناچنا شروع کیا۔ ریکارڈ بج رہا تھا اور ایک فرانسیسی گیت کے ساتھ ناچ کے سُر بلند ہو رہے تھے۔

''ہمیشہ۔ ہمیشہ محبت۔۔۔۔''

اوروں نے بھی ناچنا شروع کیا۔

شجاعت نعیم سے کہہ رہا تھا۔۔۔ ''اور یہ آپ کے ایرانی، ترکی، البانوی، مراقشی، مصری مسلمان سب بڑے پاجی ہوتے ہیں۔ آپ تو ان کو اپنا بھائی سمجھ کے جان دیتے ہیں اور یہ اپنے گورے رنگ کی وجہ سے اپنے آپ کو میڈی ٹرے نین نسل کا اور سفید فام سمجھتے ہیں۔ یہ آپ کی پان اسلامیت صرف ہندوستان کی حد تک ہے۔۔۔ مجھ سے ایک مصری صاحب سے ملاقات ہے، جو عرصے تک ہم سب کو دھوکا دیتے رہے کہ اطالوی ہیں۔ اطالوی ذرا اچھی بول لیتے ہیں۔۔۔ مگر تم کچھ پیو گے نہیں؟''

ایک جوڑا اور آیا۔ ترویدی ایک غریب طالب علم، جو کوارتیے لاتاں میں ایک ریستوران میں کام کرتا تھا۔ اور اس کے ساتھ ایک بلند قامت، سرخ ہونٹوں والی یہودی لڑکی جس کے ہاتھ میں جواہر لال کی سوانح

عمری تھی۔

شجاعت نے نعیم سے ان دونوں کا تعارف کرایا۔

نعیم نے اس یہودی لڑکی سے پوچھا۔ ''کیوں جواہر لال کی سوانح عمری آپ کو پسند نہیں آئی؟''

''ترویدی نے مجھے کل ہی یہ کتاب دی ہے۔ ہم یہودیوں کی اور آپ لوگوں کی حالت اور مشکلیں بڑی حد تک ملتی جلتی ہیں۔ مجھے ترویدی کے ساتھ رہنے سے یہی معلوم ہوا۔''

''آپ یہودی ہیں؟''

''میں جرمنی سے بھاگ کے آئی ہوں اور یہودن ہوں۔ جب سے اس چوہے ہٹلر کا راج شروع ہوا ہے ہم گھر سے بے گھر ہو رہے ہیں، اور آپ لوگ اپنے گھروں میں خادم ہیں۔۔۔۔''

اس موقع پر شجاعت نے کہا۔ ''مسٹر نعیم حسن آئی۔ سی۔ ایس ہیں اور ان کا شمار خادموں میں نہیں حاکموں میں ہے۔''

پھر قاضی صاحب آئے۔ احمد آباد کے رہنے والے تھے، چیچک رُو تھے اور جسم دوہرا تو نہیں تھا، ڈیوڑھا ضرور تھا۔ ان سے بھی نعیم اس سے پہلے مل چکا تھا۔ ان کے ساتھ ایک بدشکل اور کم رُو سے پستہ قامت نوجوان تھے۔ قاضی ہاشم نے ان کا تعارف ''فریاد اکبرآبادی'' کہہ کے کرایا۔ ان دونوں کے ساتھ سنہرے بالوں والی ایک بڑی خوبصورت اور بلند قامت لڑکی تھی۔ قاضی ہاشم نے نعیم سے ان کا تعارف کرایا۔۔۔ ''یہ مس برتھا اکسل سن ہیں۔ سویڈن کی رہنے والی ہیں۔ یہ میرے دوست مسٹر نعیم حسن ہیں۔'' برتھا اکسل سن ہاتھ ملاتے وقت شہزادیوں کی طرح مسکرائی۔

یہ پہلی لڑکی تھی جو اس پورے مجمع میں شریف اور اعلیٰ طبقے کی معلوم ہو رہی تھی۔ راجہ ہمت نواز ونت نے ناچتے ناچتے اسے گھور کے دیکھا۔ اور اس کی آنکھیں بھی ایک منٹ کے لیے ان کے مردانہ حسن کی طرف کھنچیں۔ پھر اس کے چہرے پر شرافت کی نقاب پڑ گئی۔

غازی الدین، فریاد اکبرآبادی کو دیکھتے ہی گرٹروڈ کا ہاتھ پکڑ کر اسے گھسیٹتے ہوئے لپکے۔ وہ ان کے ساتھ ناچ رہی تھی اور ناچ میں یہ جوڑا معلوم بھی عجیب ہو رہا تھا کیونکہ وہ غازی الدین کے قد سے ایک چوتھائی کم تھی۔ غازی الدین نے جلدی سے ایک دوسرے کا تعارف کرایا۔ ''گرٹروڈ۔ مسٹر فریاد۔ یہ شاعر بھی ہیں۔ کیمبرج میں تاریخ پڑھ رہے ہیں۔'' پھر اردو میں فریاد سے کہا۔ ''اماں اسے چھوڑتا نہیں۔

سیدھی تمہارے کمرے تک ساتھ جائے گی۔ مجھے ان دونوں کو سنبھالنا مشکل ہو رہا ہے اور میں سوچ رہا تھا کہ اس پارٹی میں کوئی نئی مل جائے تو اچھا ہے۔ اس کو لے جاؤ۔ تمہارا اس کا جوڑا بھی ہے۔''

فریاد نے اس سے کہا۔ ''تم بڑے بیہودہ ہو یار!'' پھر گرزوڈے سے کہا۔ ''آپ ناچیں گی؟''

اور نعیم اس تھلکتے سے جوڑے کو چلتے اور ناچتے دیکھتا رہا۔

غازی الدین نے اس سے مخاطب ہو کے کہا۔ ''نعیم تم ابھی تک نہیں ناچے؟'' شجاعت نے جو حلیمہ خانم کے ساتھ ناچتا ہوا قریب سے گزرا، کہا ابھی تک معلوم ہوتا ہے کہ ان پر رقص کی کیفیت طاری نہیں ہوئی۔

غازی الدین نے کہا۔ ''اس کیفیت وبفیت کا میں قائل نہیں۔ یہی حال ہمارے قاضی صاحب کا ہے۔ جب تک کسی لڑکی سے عشق نہ ہو جائے، اسے چائے پر بھی نہیں بلاتے۔''

قاضی صاحب نے کہا۔ ''جب تک مجھے کسی لڑکی سے محبت نہ ہو اور وہ بھی اس محبت کا تھوڑا بہت جواب نہ دے، مجھے اس کے ساتھ کہیں آنے جانے میں بھی کوئی لطف نہیں آتا۔ جنس سے آپ عشق و محبت کے عنصر کو نکال لیجیے، باقی کیا رہ جاتا ہے۔۔۔ حیوانیت، محض حیوانی۔ اس میں ہمارے ہندوستانی نوجوانوں کو لطف آتا ہوگا۔ جنھوں نے انگلستان آنے سے پہلے کبھی عورت کی صورت نہیں دیکھی لیکن اس حیوانیت میں مزا ہی کیا خاک ہے۔۔۔ عشق کی چاشنی سے عورت مرد کے ساتھ میں روحانیت پیدا ہو جاتی ہے۔ عشق کی وجہ سے انسان عاقل، حیوان نہیں رہتا۔ وہ حیوانی مدارج سے کہیں آگے پہنچ جاتا ہے۔۔۔ چنانچہ جب سے مجھے برتھا سے محبت ہوئی ہے، میرے نفس میں ایک طرح کی پاکیزگی پیدا ہوگئی ہے۔۔۔ کیوں برتھا؟'' یہ کہہ کے جھینپ کر قاضی صاحب نے پلٹ کے اپنی سویدی حسینہ کی طرف دیکھا جو، اب راجہ ہمت نواز ونت کے ساتھ ناچ رہی تھی۔ اور ہمت نواز ونت کی نائٹ کلب والی ننگی ناچنے والی رقاصہ غازی کے ساتھ۔

اور گراموفون کا رکارڈ بج رہا تھا۔

''دو کے لیے چائے اور چائے کے لیے دو۔''

اور رقص کرنے والے جوڑے تھرک رہے تھے، اور لپٹ رہے تھے، اور ہنس رہے تھے۔ باتیں کر رہے تھے اور ناچ رہے تھے۔ سینوں سے سینے مل رہے تھے اور کبھی ایشیا کے ہونٹ یورپ کے

رخساروں یا سنہری بالوں سے مس کرتے۔ اور کچھ لوگ قہقہے لگا رہے تھے، اور شامپین کے گلاسوں پر بجلی کی روشنی ہیروں کی طرح چمک رہی تھی۔

اگر برتھا بھی ان زندگی کا لطف اٹھانے والوں اور اٹھانے والیوں میں نہ ہوتی تو قاضی صاحب نعیم کو اقبال کا وہ شعر سناتے جو نہیں یاد آ گیا تھا ۔

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم
عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوزِ دم بدم

لیکن اب یہ شعر ذرا بے محل سا تھا۔

اور گراموفون کا رکارڈ تو بج رہا تھا:

''دو کے لیے چائے اور چائے کے لیے دو۔''

نعیم شرارت سے مسکرایا۔ اور پھر گفتگو کا رُخ بدلنے کے لیے اس نے قاضی ہاشم سے کہا۔ ''عورتیں شام کے لباس میں بڑی اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟''

''میرے خیال میں ساڑی سے بڑھ کر دنیا میں اور کوئی لباس نہیں۔ لیکن آپ ناچے گا نہیں؟ میرے ساتھ وقت کیوں ضائع کر رہے ہیں۔ میں تو پیدا ہی محبت کرنے اور غم اٹھانے کے لیے ہوا ہوں۔ عشق اور درد کا ساتھ ہے۔۔۔ لیکن آپ ناچئے، اور میرے ساتھ باتیں کر کے وقت نہ ضائع کیجیے۔

در محفل خود بار مدہ ہم چو منے را
افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را

خیر اقبال کا شعر پڑھنے کا موقع نہ تھا، نہ سہی۔ یہ فارسی شعر پڑھ کے قاضی صاحب نے کچھ دل کی بھڑاس نکال لی۔

پھر نعیم کے دل میں کھٹک شروع ہوئی۔ شامپین اور رقص، اور ایشیا اور یورپ اس امتزاج عاشقانہ کے ماحول میں اسے پھر ایلس یاد آئی، اور اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی۔ اس نے پھر اپنے آپ سے گریز کرنے کے لیے، اس میز کے پاس پہنچ کے جس کے گرد راج کمار، حلیمہ خانم اور اعجاز بیٹھے پی رہے تھے، دو گلاس پیے، اور پھر ہلکے سرور سے مسلح ہو کے اس نے سر کے اشارے سے حلیمہ خانم سے

رقص کی درخواست کی۔

وہ ناچ رہا تھا کہ کچھ لوگ اور آئے۔ دو ہندوستانی لڑکیاں تھیں۔ ایک سانولی اور بدشکل، دوسری سانولی اور قبول صورت۔ دونوں کا میزبان سے تعارف کرایا گیا۔ بڑی سانولی اور بدشکل بہن کا نام کوکب زمان تھا، چھوٹی کا نام خورشید زمان۔ دونوں یو۔ پی کے کسی ڈپٹی کلکٹر صاحب کی لڑکیاں تھیں۔ ان کے ساتھ ایک اور لڑکا تھا، لمبا تڑنگا، ایبٹ آباد کا رہنے والا۔ نعیم ناچنے میں اس کا نام نہ سن سکا۔

ناچتے میں نعیم نے محسوس کیا کہ حلیمہ خانم کا جسم جس کی جنبش میں فرانسیسیوں سے بڑھ کے فرانسیسیت تھی، رقص کے ہر موڑ پر دو دو تین جگہ سے چٹکتا۔

''البانیہ بڑا خوبصورت ملک ہوگا؟''

''ہاں بڑا خوبصورت ملک ہے، آپ بھی ضرور تشریف لائیے۔''

''وہاں کی عورتیں تو بڑی خوبصورت ہوتی ہیں۔''

''شکریہ!''

پھر حلیمہ خانم نے پوچھا۔ ''آپ کی امریکن دوست کہاں ہیں؟''

''وہ امریکہ واپس چلی گئی۔ اس کی ماں بیمار ہے۔''

تھوڑی دیر کے بعد نعیم نے محسوس کیا کہ شجاعت کی آنکھیں ان دونوں کا تعاقب کر رہی ہیں۔ وہ اور زیادہ تکلف اور دوری سے ناچنے لگا۔ اس نے حلیمہ سے کہا۔ ''کیا اب بھی آپ کے ملک میں قبیلوں کی ایسی رقابت ہے اور لوگ دوسرے قبیلوں کی لڑکیاں اٹھا لے جاتے ہیں؟''

''ہاں۔ مگر کیا آپ کے ہندوستان میں یہ نہیں ہوتا؟''

''ہوتا کیوں نہیں۔ میں محض اس لیے پوچھ رہا تھا کہ میرے خیال میں اس قسم کی زندگی بڑی رومانی ہوگی۔''

''بے حد!'' اور یہ کہہ کر حلیمہ ہنسی۔

دوسرا ناچ پال جونس تھا۔ عورتیں ایک دائرہ بنائے گھوم رہی تھیں، اور ان کے اطراف ایک وسیع تر دائرہ بنائے ہوئے مرد، کہ دفعتاً باجا رُکا۔ ہنسی اور قہقہوں کی ملی جلی آوازیں آئیں۔ جو جس کے سامنے رُکی ناچ کے لیے اس کے حصے میں آئی۔ نعیم کے حصے میں پستہ قد، گرٹروڈ ہیم سن آئی۔ اس کے ساتھ چند منٹ

ناچنا بھی مشکل تھا۔

گرٹروڈ نے خود ہی پوچھا۔ ''آپ یہیں پیرس میں پڑھتے ہیں؟''

''ہاں تعطیلات میں یہاں پڑھ رہا ہوں۔'' نعیم نے جواب دیا۔ ''فرانسیسی زبان اور ادب لیکن دراصل میں آکسفرڈ میں پڑھتا ہوں۔''

''آکسفرڈ۔ کیا کہنے۔'' کالے بالوں والی، کالی آنکھوں والی، پستہ قد لڑکی نے جواب دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ کہنے لگی۔ ''آپ کو آرٹ سے دلچسپی ہے؟''

''ہے تو ضرور لیکن جب سے میں پیرس آیا ہوں مجھ پر سکتے کی سی کیفیت ہے۔ یہاں لُوور، لکسم بُرگ میوزے رودان میں اتنے بہت سے آرٹ کے خزانے ہیں کہ میں بالکل مبہوت سا ہو گیا ہوں اور اچھی طرح مطالعے کرنے اور پڑھنے کی صلاحیت جیسے بالکل سلب ہو گئی ہے۔''

''میں جب پہلے پہل پیرس آئی تو میرا بھی یہی حال ہوا تھا۔'' گرٹروڈ نے ہنس کے کہا۔ ''آج کل میں بچوں کی استعداد مصوری پر کام کر رہی ہوں۔ میں نے بچوں کی بنائی ہوئی بہت سی تصویریں جمع کی ہیں۔۔۔''

''بڑا ہی دلچسپ ذخیرہ ہوگا۔'' نعیم نے جواب دیا۔ باجا پھر ایک جھنکار کے ساتھ رُکا۔ نعیم نے اپنی ہم رقص کا سر کے اشارے سے شکریہ ادا کیا اور پھر پال جونس کے گھومنے والے دائرے میں شامل ہو گیا۔

اب کے اس کے حصے میں چیچک رو قاضی صاحب کی محبوبہ طناز برتھا اکسل سن آئی۔ ان سب لڑکیوں میں وہی ایک ایسی تھی جس سے وہ جان پہچان بڑھانا چاہتا تھا۔

اس بلند قامت، خوش رو، زریں بالوں والی، سفید حسینہ کے ساتھ ناچتے میں اسے پہلی بار یہ محسوس ہوا کہ دنیا میں ایلس کے سوا اور بھی عورتیں ہیں۔ یہ عجیب احساس تھا۔ آج صبح ایلس کے جانے کے بعد سے اب تک میری پاول اسے ایک بار بھی یاد نہ آئی تھی۔ بلقیس کا خیال البتہ کئی بار آیا۔ مگر ہر بار دل سے نکل گیا، جیسے ہوا کا جھونکا آیا اور نکل گیا۔

اس نے برتھا سے پوچھا۔ ''آپ سویڈن کے کس حصے کی رہنے والی ہیں؟''

وہی شہزادیوں کا سا ذی وقار تبسم اس کے لبوں پر نمودار ہوا۔ اس کے دانت ہموار اور بے حد سفید

تھے اور جب نعیم کے مقابل اس نے اپنے سر کو خفیف سی جنبش دی تو اس کے سنہرے بال اس کی گردن اور اس کے شانوں پر سونے کی موجوں کی طرح لہرا گئے۔ اس کی آنکھیں ہلکی نیلی تھیں۔

"معاف کیجئے میں نے سنا نہیں۔"

"میں پوچھ رہا تھا کہ آپ سویڈن کے کس شہر کی رہنے والی ہیں؟"

"اسٹاک ہولم کی۔" اس نے شائستہ اور متبسم انداز سے جواب دیا۔ "آپ کبھی سویڈن گئے ہیں۔"

"نہیں، جانا بہت چاہتا ہوں۔"

"ایک بار تو اسکنڈی نیویا ضرور جائیے۔ یورپ بھر سے ہم لوگوں کے ملک بہت مختلف ہیں۔"

"جی ہاں، وہاں سنہرے بالوں والی، نیلی آنکھوں والی پریاں رہتی ہیں۔"

اس تعریف پر وہ ہنسی۔ ہنسی کی جنبش سے اس کے پھیپھڑے اور اس کا سینہ اس طرح متحرک تھے کہ گویا یہ بھی ایک ادائے دلبری تھی۔

ناچتے میں نعیم نے اس کے جسم کو آہستہ سے کھینچ کے اور قریب کر لیا۔ قاضی صاحب جو سفید جبشن کے ساتھ ناچ رہے تھے ان کی آنکھیں پیچ و تاب کھا کھا کے رہ گئیں۔

"میں نے اسٹاک ہولم کی بڑی تعریف سُنی ہے۔"

"ہاں ہمارا شہر سات جزیروں پر آباد ہے۔ اس کے ایک طرف جھیلیں ہیں اور دوسری طرف سمندر۔"

"اور اس شہر کی دوشیزاؤں کی آنکھیں سمندر کے پانی کی طرح نیلی ہوتی ہیں۔ اور ان کے چہروں پر آرزو اور یاس کا سا نور ہوتا ہے۔"

"کیا آپ شاعر بھی ہیں؟" اس نے خوشی کی ہنسی ہنس کے کہا اور اس کے سارے جسم پر ہنسی کی اس جنبش کا اثر ہوا۔

"نہیں تو۔" یہ کہہ کے نعیم نے اسے اپنے سے اور قریب کر لیا۔ اب یہ دونوں سینہ بہ سینہ ناچ رہے تھے۔ اور ان کے جسم گویا پیوست ہوئے جا رہے تھے۔ ایلس سے وفا کا خیال ہتھوڑے کی طرح بار بار نعیم کے دماغ پر پڑ رہا تھا۔ مگر اس کے ہاتھ برتھا کی کمر کے گرد تھے اور برتھا کی سنہری زلفیں اس کے

رخساروں اور اس کی گردن سے مس کر رہی تھیں۔

یک لخت باجا رُکا اور یہ سحر ٹوٹ گیا۔ نعیم کی سمجھ میں نہ آیا کہ آئندہ لمحہ میں کیا ہونا چاہیے۔ برتھا کی نسوانیت البتہ اگلے لمحے کا پروگرام بنا رہی تھی۔ اس پال جونس کے بعد کسی اور کے ساتھ ناچنے کے خیال سے اور خصوصاً اپنے دوست قاضی صاحب سے وہ گریز کرنا چاہتی تھی۔

"آپ کو کاک ٹیل بنانا آتا ہے؟" اس نے نعیم سے پوچھا۔

"نہیں۔"

"آپ کی طبیعت چاہتی ہو تو چلئے۔ میری ایک خاص ایجاد ہے۔ دیکھئے میں ابھی بناتی ہوں۔"

اور دیوار کے پاس اس میز کی طرف بڑھ کے جس پر شراب کی بوتلیں چنی ہوئی تھیں اور جس کے پاس بیٹھے اعجاز پیتے جا رہے تھے اور انگلستان کی مزدور جماعت اور فرانس کے نام نہاد اشتراکیوں کو گالیاں دے رہے تھے کہ یہی اصلی غدار ہیں جو مزدوروں کو دھوکا دیتے ہیں، برتھا نے کاک ٹیل بنانی شروع کی۔

"آپ کو میرا نام یاد ہے؟" نعیم نے پوچھا۔

برتھا پھر اپنی باوقار دلکش ہنسی ہنس کے کہنے لگی۔ "میں ذرا سوچوں تو سہی۔۔۔ حسن، یہی نام ہے نا؟" یہ کہہ کے اس نے کاک ٹیل نعیم کے حوالے کیا۔ دونوں دیوار کے سہارے کھڑے ہو کر آہستہ آہستہ پینے لگے۔

"لیکن آپ کو یاد کیسے رہا؟"

"حسن ایک ڈراما بھی تو ہے۔ انگریز مصنف جیمز الرائے فلیکر کا۔ میں جس زمانے میں انگلستان میں پڑھتی تھی، اسے اسٹیج بھی کیا گیا تھا۔

"محض اسی وجہ سے آپ کو میرا نام یاد رہا؟ ورنہ یاد نہ رہتا؟"

برتھا نے کہا۔ "نہیں شاید یوں بھی میں آپ کا نام نہ بھولتی۔ میرا نام آپ کو یاد ہے؟"

"برتھا اکسل سن۔" نعیم نے ہنس کے کہا۔

"آپ کا حافظہ بڑا اچھا ہے۔" وہ ہنس کے کہنے لگی۔ کاک ٹیل کے گلاس پر بجلی کی روشنی کی شعاع چمک رہی تھی اور برتھا کی آنکھیں بھی چمک رہی تھیں، اور کسی طرف دیکھ رہی تھیں۔ نعیم نے اس کی نگاہ کا

تعاقب کیا۔ وہ راجہ ہمت نواز ونت کی طرف دیکھ رہی تھی۔ راجہ کی نظر بار بار اپنی ہم رقص سے بچ کر اس پر پڑتی۔

نعیم نے ایلس سے اس چند لمحے کی بے وفائی پر اپنے دل کی ملامت سنی۔ پھر اس نوخیز رومان کی جگہ منجھے ہوئے طنز نے لے لی۔

نعیم نے کہا۔ "جی ہاں۔ برتھا اکسل سن تو فلیکر کے کسی ڈرامے میں نہیں۔"

وہ پھر ہنسی۔ پال جونس کا یہ رقص بھی ختم ہو چکا تھا۔ راجہ ہمت نواز ونت تیر کی طرح ان دونوں کی طرف آئے۔ برتھا نے ان سے پوچھا۔ "آپ بھی یہ کاک ٹیل پئیں گے؟" انہوں نے کہا۔ "ضرور۔ شکریہ۔" برتھا کاک ٹیل بنانے لگی تو راجہ صاحب نعیم کی طرف مڑے۔ "یار نعیم۔ کیا زوردار چھپا ہے۔ قسم ہے لیکن اگر تجھے زیادہ پسند ہے تو تُو لے لے۔ دوست سے بڑھ کر تو میں کسی کو نہیں سمجھتا۔ لیکن تیرے پاس کوئی اور ہو تو چھوڑ دے۔ میں اسے پکڑ لیتا ہوں۔ اور یار بڑے اچھے خاندان کی لڑکی ہے۔ اس کا باپ پروفیسر ہے۔ یار میں ان دو کوڑی کی رنڈیوں سے تھک گیا۔"

نعیم نے کہا۔ "شوق سے راجہ۔ میں تمہارے حق میں دست بردار ہوتا ہوں۔ مگر قاضی صاحب تمہیں مار ہی ڈالیں گے۔"

راجہ نے کاندھے ہلا کے "اونہہ" کہا۔ اتنے میں برتھا نے کاک ٹیل کا گلاس اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس درمیان میں قاضی ہاشم صاحب بھی خراماں خراماں وہیں پہنچ گئے۔ نعیم نے راجہ ہمت نواز سے ان کا تعارف کرایا۔

قاضی صاحب نے آہستہ سے نعیم سے کہا۔ "مجھے اس وقت بے اختیار ایک مصرع یاد آگیا:

بن گیا رقیب آخر، تھا جو رازداں اپنا

نعیم کو ہنسی آگئی۔ قاضی صاحب اور برافروختہ ہوئے۔ نعیم نے کہا۔ "قاضی صاحب کسی عاشق نے اپنے معشوق کے متعلق کیا خوب لکھا ہے ؎

تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا

یہ کہہ کے نعیم وہاں سے ٹل گیا کہ راجہ صاحب اور قاضی صاحب سویڈن کے گنج جمال و زریں بال کا قضیہ خود طے کر لیں گے۔ اس نے اپنے میزبان سے رخصت چاہی۔ راج کمار نے کہا۔ "ابھی سے؟ ابھی

تو ایک ہی بجا ہے۔"

"مجھے ذرا نیند آرہی ہے۔" نعیم نے جواب دیا۔ "بہت شکریہ۔ آپ کی سالگرہیں اور بہت سی آئیں۔"

شجاعت سے رخصت ہونے کے بعد اس نے اور دو ایک سے ہاتھ ملایا۔ اب اگلا ناچ شروع ہونے والا تھا اور اس مرتبہ قاضی صاحب اپنی محبوبہ طناز کے ساتھ ناچنے پر تلے ہوئے تھے۔ اس کی نگاہیں راجہ کے مردانہ حسن کا لاکھ تعاقب کریں، چیز تو وہ ان کی تھی۔ برتھا اپنے چیچک رُو عاشق کے ساتھ ناچنے اٹھ رہی تھیں کہ نعیم اس سے رخصت ہونے پہنچا۔ اس نے جلدی سے بٹوا کھولا اور اپنی ناک پر پاؤڈر لگانے لگی۔ پھر "شب بخیر" کہہ کے اس نے نعیم سے مصافحہ کرنے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ نعیم نے جب ہاتھ ملایا تو اپنے اور اس کے ہاتھ کے درمیان اس نے کاغذ کے ایک سخت سے ٹکڑے کو محسوس کیا، جسے اس نے فوراً اپنی مٹھی میں بند کرلیا۔ اب بھی اسے یقین نہیں تھا کہ برتھا کی نیلی آنکھیں اس کی طرف مائل تھیں یا راجہ ہمت نواز ونت کی طرف یا قاضی کی طرف یا تینوں کی طرف ؎

تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا

اسے نیلی آنکھوں کے ہرجائی پن کے مقابل ایلس کی وفاداری یاد آئی۔ اور باہر نکلتے ہوئے اس نے دیکھا کہ کارڈ پر برتھا کا سویڈن اور پیرس کا پتہ تھا۔

اور کمرے سے رقص کی، ہنسی کی، چھیڑ چھاڑ کی آواز آرہی تھی۔ یہاں تک کہ بند دروازے کے باہر تک بھی رکارڈ باجے کے ساتھ یہ گیت گا رہا تھا۔ یہ پیغام سنا رہا تھا:

"دو کے لیے چائے اور چائے کے لیے دو"

(۲)

باقی رات کا بڑا حصہ ایلس کی یاد میں اس نے پیرس کی سڑکوں پر پھرتے گذارا۔ راتوں کو شہر کی سڑکوں پر پھرنا بھی ایک عجیب کیفیت رکھتا ہے۔ اندر انسان اپنے آپ سے ڈرتا ہے، اور باہر شہر کی خاموش دنیا سے۔ خاموش روشنیاں، اخباروں میں لپٹتے ہوئے آدمی، مکانوں کی کھلی ہوئی کھڑکیاں، کسی کسی کھڑکی میں روشنی، پولیس والے کے قدموں کی چاپ، اور دو دو تین تین آدمیوں کی ٹولیاں جو تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد باتیں کرتی گذر جاتیں۔ شریفوں کی ٹولیاں اور بدمعاشوں کی ٹولیاں اور رنڈیوں کے کھلکھلاتے

ہوئے جوتوں کی آوازیں۔ ''شیری۔ وو لے ڈو فیرا موار اوک موآ۔'' اور بودلیر کا مصرع ''شہر، خوابوں سے بھرا ہوا شہر۔'' سناٹا اور اس سناٹے میں وہ آہٹیں جن کی وجہ سے انسان کبھی کبھی دیووں سے بھی زیادہ خوفناک اور ظالم معلوم ہوتے ہیں۔ اس وقت اس بظاہر خاموش شہر میں، اس دنیا کے سب سے حسین شہر میں معلوم نہیں کتنے جوڑے ہم آغوش ہوں گے، کتنے بچے پیدا ہو رہے ہوں گے، کتنے لوگ مر رہے ہوں گے۔ پیدائش، افزائش نسل اور موت، اور پھر اس بے مقصد ڈرامے میں بیکاری اور بھوک۔ اخباروں میں لپٹے ہوئے کھانستے ہوئے جسموں کے آر پار ہو جانے والی تیز ہوا۔ اور آج ہی صبح کو ایک طیارہ ایلس کو اڑا لے گیا تھا۔ چھ ماہ کے لیے یا عمر بھر کے لیے؟ اس کی یاد ہمیشہ ستائے گی؟ یا بر تھا یا میری پاول یا کوئی اور اس کی جگہ لے لے گی؟ اور بلقیس سات سمندر پار کا وہ نقطۂ موہوم جس کی گردش سے جذبات کا پہلا دائرہ وہ بنا۔

''اور اب ستمبر کا پہلا ہفتہ ختم ہو رہا ہے۔ تعلیمی سال شروع ہونے ہی والا ہے۔ ایلس تو چلی گئی۔ میں ابھی سے انگلستان کیوں نہ چلا جاؤں؟ اب پیرس میں رکھا ہی کیا ہے۔ یہ جگمگاتی ہوئی لال روشنیوں والا شہر۔ یہ برہنہ جسموں والا شہر۔ یہ شہر جو میرے ہم وطنوں، میرے مہربان سست عناصر کو جس قدر راس آتا ہے اور کوئی شہر راس نہیں آتا۔۔۔۔۔

اسی شہر میں لوور بھی ہے اور قومی کتب خانہ بھی۔ یورپ کی قدیم ترین یونیورسٹی بھی ہے اور دنیا بھر سے چنے ہوئے آرٹ کے نادر ترین نمونے بھی۔ پھر بھی میرے ہم وطنوں کے قدموں مارتر کی طرف ہی کیوں اٹھتے ہیں۔ برہنہ جسموں کی خیر گی کیوں ان کے دماغوں پر اس قدر چھائی ہوئی ہے۔ اور اب تو کرا کسلے اور ہروشا بھی جا رہے ہیں۔ میں یہاں کچھ دن اور رہا تو اپنے انہی ہم وطنوں کے ساتھ گذر کرنی پڑے گی۔ میں ہروشا کے ساتھ کیوں نہ چلا جاؤں۔ رہائن لینڈ کو بھی لگے ہاتھوں دیکھ ہی لوں۔''

اور اس رات کو تنہا ٹہلتے ٹہلتے سفر کا جنون نعیم کے دماغ پر چھانے لگا۔ سفر ہی میں اپنی ذات اس کی سمجھ میں اچھی طرح آتی۔ سفر ہی میں زندگی کا لطف اور حسن اس کی آنکھوں میں بچتا۔ سفر میں وہ گویا اپنے آپ کو پا لیتا۔ قیدِ مقام میں اس کے حواس خوابیدہ سے ہو جاتے۔ زندگی اس کے پاس سے ہو کر گذر جاتی اور اسے خبر نہ ہوتی۔ شاید سفر ہی اس اندرونی شدید دلی تکلیف کا ازالہ کر سکے جو ایلس کے چلے جانے

سے پیدا ہوئی۔ شاید سفر ہی سے یہ خلا پُر ہو۔ تعلیمی سال کے لیے وہ وقت پر نہ پہنچ سکے تو کیا ہرج ہے۔ کسی بہانے دو ہفتے کی رخصت سہی۔ پھر اس نے ٹہلتے ٹہلتے سفر کا پروگرام بھی بنانا شروع کیا۔ کولون تک تو ہر صورت میں ہروشا کا ساتھ ہوگا۔ ہروشا کو وہ مجبور کرے گا کہ میونک اور وی آنا کے راستے پر رک جائے۔ ورنہ وہ خود اکیلا کم سے کم میونک تو ہو آئے گا۔ پروشیا جانے کے لیے کافی وقت نہیں لیکن جنوبی جرمنی کی سیر تو ہو جائے گی اور اگر کرا کسلے بھی ساتھ چلنے پر تیار ہو جائے تو کیا کہنے۔

(۳)

اور تین چار روز کے بعد کرا کسلے، نعیم اور ہروشا ریل گاڑی کے ایک تیسرے درجے کے ڈبے میں کولون جا رہے تھے۔ جب ریل اس سرحد پر رکی جس پر سے دنیا کی انتہائی طاقتور فوجیں گذری ہیں اور جس کے اطراف میں دنیا کی خونریز ترین لڑائیاں ہوئی ہیں، تو پلیٹ فارم سے آلہ مکبر الصوت نے کڑک کے جرمن، فرانسیسی اور انگریزی میں اعلانات سنائے کہ جس کے پاس جتنی نقدی ہو وہ پاسپورٹ افسر کو بتا دے۔ پاسپورٹ کا امتحان ہوا، مہریں لگیں اور گاڑی نے پھر حرکت کی۔

جب گاڑی کولون پہنچی تو رات کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا چکا تھا اور مسلسل بارش ہو رہی تھی۔ اس موسم میں شہر کی روشنیاں اور ٹیوٹانی رسم الخط میں دوکانوں کے برقی نام بھی دھندلے معلوم ہو رہے تھے۔ ہوٹل شوا تیسر ہوف میں کرا کسلے نے پہلے سے کمرے محفوظ کرا لیے تھے۔

رات اور مسلسل بارش میں نعیم نے محسوس کیا کہ اب وہ پیرس سے اور اس ماحول سے جس میں ایلس کے بغیر ایک ناقابلِ برداشت خلا تھا باہر آ چکا ہے۔ ہوٹل کی سیڑھیوں اور راستے پر باتیں کرنے والوں کی زبان مختلف تھی۔ صفائی تھی۔ ستھرا پن تھا۔ بھدا پن تھا۔ مگر اب نعیم نے اپنے کو ذرا آزاد محسوس کیا۔۔۔۔ پیرس کے طلسم سے آزاد۔

صبح کو پھر وہی لگاتار بارش لیکن اس بارش کے باوجود کولون کی سیر ضروری تھی کیونکہ دو تین دن کے اندر ہروشا تو اپنے وطن کو روانہ ہونے والا تھا۔ لیکن کرا کسلے بھی زیادہ نہ ٹھہر سکتا تھا۔ دریائے رہائن کا صرف تھوڑا ہی سا حصہ پُل سے نظر آتا تھا۔ باقی دھند سے چھپا ہوا تھا۔ راٹ ہاوز (ٹاؤن ہال) دیکھ کے ان لوگوں نے ایک کیفے میں چائے پی۔ وہاں گھنٹہ بھر تک باتوں میں وقت گذارا۔ رہائن کے قریب ایک ریستوران میں کھانا کھایا۔ جرمن غذا بہت بھاری تھی۔ بڑے بڑے کٹ لٹ اور ان کے

ساتھ بڑے بڑے آلو۔ پھر گھر واپس آئے۔ چار بجے پانی رُک چکا تھا۔ کافی پی کے پھر باہر نکلے اور کولون کے اس مشہور و معروف آہنی پُل کو دیکھنے لگے، جس پر گذشتہ جنگِ عظیم کے بعد اتحادیوں کے فوجی جوتوں کی چاپ کی آواز جرمنوں کے دل چھیدتی تھی۔ رہائن پر سے اب دھند کا بادل چھٹ چکا تھا اور شفاف دھوپ میں میلے رنگ کی عمارتوں کی چھتیں چمک رہی تھیں۔ دریائے رہائن اس وقت فی الحقیقت حسین معلوم ہو رہا تھا۔ وہ دریا جس سے قرونِ وسطیٰ کی پوری رومانیت وابستہ ہے جس کے کنارے قلعے ابھی تک جرمن فروسیت اور جرمن شاعری کی نشانیوں کے طور پر باقی ہیں۔ کولون کا کلیسائے اعظم بھی ان لوگوں نے دیکھا، جو یورپ کے چند انتہائی شاندار کلیساؤں میں سے ہے۔ ہروشا نے جرمن یہودی شاعر ہائنے کی وہ مشہور معروف نظم سنائی جس میں اس نے عظیم اور مقدس کولون کے کلیسائے اعظم کا ذکر کیا ہے، جس کا عکس پانی پر پڑتا ہے۔ اس کلیسا میں حضرت مریم کی ایک تصویر ہے جس کو دیکھ کر شاعر کو اپنی محبوبہ یاد آتی ہے۔

دوسرے دن موسم خوشگوار رہا اور اگرچہ دو تین گھنٹے ابر رہا لیکن بیچ بیچ میں دھوپ چمکتی رہی۔ کشتی میں یہ تینوں اُوپر شمال ڈوسل دورف گئے جو رہائن لینڈ کے صنعتی مرکزوں میں سے ہے۔ کشتی کے کنارے تیرہ چودہ برس کی دو جرمن لڑکیاں عرشے پر کٹہرے کا سہارا لگائے کھڑی تھیں۔ ان کے صاف ستھرے اور خاکی بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ اور ان کا لباس کٹہرے سے اُلجھ رہا تھا۔

جرمن عورتیں بالعموم گداز تھیں، بلکہ کسی قدر بھدی۔ گوشت اور آلو اور بیئر کے زیادہ استعمال کی وجہ سے چربی کی تہ کی تہ چڑھی ہوئی اور مردوں میں ہر چوتھا یا پانچواں یونیفارم میں۔ بازو پر سواستکا کا نشان جس سے جرمنی آنے سے پہلے نعیم کو انتہائی نفرت تھی مگر اب وہ اس کا عادی ہو چلا تھا۔

نعیم کو پہلے تو یہ خیال تھا کہ جرمنی میں جس نسلی تعصب کی تبلیغ کی جا رہی ہے اس کی وجہ سے وہاں کے لوگ ہندوستانیوں کو بھی بہت ذلیل سمجھتے ہوں گے لیکن کرا کسلے اور ہروشا دونوں نے یقین دلایا کہ یہ نام نہاد نسلی تعصب دراصل معاشی تعصب ہے۔ انگلستان کے معاشی حالات کا تقاضا یہ ہے کہ ہندوستانیوں اور حبشیوں سے تعصب کیا جائے اور جرمنی کے حالات کا اقتضا یہ ہے کہ یہودیوں سے تعصب ہو۔ ہاں قانون تمام غیر آریائیوں سے شادی بیاہ کی روک کرتا ہے لیکن ہندوستانی یہاں ہیں کتنے؟ اور نازی قانون بھی کبھی چشم پوشی بھی کر جاتا ہے۔

ڈوسل دورف کی جدید وضع کی عمارتوں کے درمیان لمبی چوڑی سڑکوں پر یہ تینوں گھومتے رہے۔ اس شہر کا نقشہ اور اس کی تعمیر جدید قسم کی تھی۔ کولون میں اور اس میں وہی فرق تھا جو قرونِ وسطیٰ اور عصرِ جدید میں ہے، پھر بھی ان دونوں شہروں کی زندگی، ان کی روحِ عمل، ان کا فلسفہ حیات، ان کا طرز اور تمدن بالکل ایک تھا۔ عمارتیں پُرانی ہو جاتی ہیں اور نئی بھی بنتی ہیں لیکن دونوں میں رہنے والا انسان اس صورت میں ایک ہی تھا۔

اگلے روز ریل پر ری ما گن گئے۔ یہ کولون سے جنوب میں رہائن کے کنارے ایک گاؤں ہے۔ پہاڑی پر ایک چھوٹا سا کلیسا اور زیارت گاہ ہے۔ ندی کا پاٹ چوڑا ہے اور کناروں کا منظر دلکش۔ آج موسم بھی بڑا دلفریب تھا۔ گزشتہ دو دنوں کی سردی کے بجائے موسم میں ایک ہلکی سی خوشگوار خنکی تھی۔

دوپہر کا کھانا کھا کے یہ تینوں ندی کے کنارے کنارے چلے۔ سامنے رہائن کا بڑا پُل تھا اور اس پُل پر لڑکوں کا جمِ غفیر تھا۔ لڑکوں نے بہت کم اس سے پہلے کسی گندمی رنگ کے باشندے کو اس اطمینان سے اپنے گھروں کے پاس چہل قدمی کرتے دیکھا ہوگا۔ نعیم کے ایک طرف کرا کسلے تھا اور دوسری طرف ہروشا۔ یہ دونوں معمولی سفری کپڑے پہنے تھے۔ صرف نعیم عام ہندوستانی طالب علموں کی طرح اس موقع پر بھی بھاری سُوٹ پہنے تھا۔ ایک لڑکے نے جس کے ذہن میں شاید الف لیلیٰ کے قصے گھوم رہے تھے، چلّا کے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”یہ دیکھو عرب شہزادہ آ رہا ہے۔“

پُل سے تینوں ندی کے اس پار پہنچے اور ندی کے کنارے کنارے، بہت دُور چلے گئے۔ اس وقت اس دریا پر عجب بہار تھی۔ دھوپ میں اس کا پانی چمک رہا تھا۔ اس کا پاٹ چوڑا تھا اور پُرشکوہ اطمینان کے ساتھ اس کا پانی بہہ رہا تھا۔ اس پانی کے کنارے کتنے بڑے بڑے فاتحوں کے سر جھکے، کتنے ہیرو اپنی جان پر کھیل گئے۔ کتنی سنہری بالوں والی لڑکیاں اپنے عاشقوں کے ساتھ جان بچا کے بھاگیں۔ یہ سب افسانے جرمن شاعری اور رہائن کا مشترکہ ترکہ ہیں۔

اس درمیان میں یہ تینوں ٹہلتے ٹہلتے ایک اور گاؤں میں پہنچے۔ ایک چھوٹی سی سڑک پر ایک یہودی نما شخص، ایک سنہرے بالوں والی جرمن لڑکی کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے جا رہا تھا۔ کرا کسلے نے کہا۔ ”مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا۔“

اس گاؤں میں رہائن پر کوئی پُل نہ تھا۔ سڑک پانی کے پاس ایک چبوترے پر ختم ہو جاتی تھی۔ ایک

بڑی سی کشتی لوگوں کو اس پار سے اس پار پہنچاتی تھی۔ کشتی کی ساخت ایسی تھی کہ موٹریں تک اس میں آ جاتیں۔ اس کشتی سے یہ تینوں اور کچھ اور مسافر اور ان کی موٹر دوسرے کنارے پہنچے۔

رات کو تینوں اسی گاؤں کے چھوٹے سے ریستوران میں کھانا کھانے گئے جس میں یہ ٹھہرے تھے۔ اس وجہ سے کہ یہ لوگ انگریزی میں بات چیت کر رہے تھے، ری ماگن کے کچھ لوگوں نے جو وہاں بیئر پینے آئے تھے، ان سے انگریزی میں "گڈ ایوننگ" کہا۔ غالباً اس سے زیادہ انگریزی ان میں سے کسی کو آتی بھی نہ تھی۔ یہ بھی ٹیوٹانی اخلاق کا اظہار تھا۔ جب نعیم نے جرمنی کے باشندوں کے اخلاق کی تعریف کی تو کرا کسلے نے کہا۔ "میں تو تم سے کہتا ہی تھا۔ یہ بھاری بھدے جرمن بالعموم بے ضرر ہوتے ہیں۔ جب تک یہ بیئر پیتے رہتے ہیں یہ بالکل محفوظ ہیں، لیکن جہاں انہوں نے سوچنا شروع کیا تو ہوا میں اُڑتے ہیں، اور ان کی مابعد الطبیعات کسی کی سمجھ میں نہیں آتی۔ یا زمین پر کھیلنے لگتے ہیں اور اسی لیے ہتھیار اور سیاسی اسکیمیں بناتے ہیں یا سمندر میں غوطہ لگاتے ہیں اور یو بوٹ بناتے ہیں لیکن صلح کے ایام میں یہ تو بالکل بے ضرر ہیں۔"

اس پر ہروشا نے کہا۔ "یہ ذرا یہودیوں کے دل سے پوچھو۔"

رات کو ری ماگن میں آرام لے کر صبح کو تینوں دوست اسٹیشن پہنچے۔ نعیم برخرد شا کے اس ڈرامے کا نام یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا جس کا پہلا منظر ری ماگن میں ہے کہ اتنے میں ریل آ گئی۔ رہائن کے کنارے ریل سے عجیب ہی منظر دکھائی دیتا ہے۔ چوڑے پاٹ والے آہستہ خرام دریا کے دونوں جانب ریلیں اور سڑکیں، چھوٹے چھوٹے گاؤں اور قصبے، ان کی سڑکوں پر اور ندی کے پانی پر سورج کی چمک۔ یہاں تک کہ گاڑی سینٹ گوار پہنچی جو غالباً رہائن کی تمام چھوٹی چھوٹی آبادیوں میں سب سے زیادہ خوبصورت ہے۔ یہاں اتر کے تینوں نے سارا دن پھرنے میں گذارا۔ بہت دُور تک ندی کے کنارے پھرتے رہے۔ ایک کشتی لے کے ندی کو پار کیا اور دوسرے کنارے پر بہت دُور تک پھرتے رہے۔

چاندنی رات تھی۔ ہلکی سی چاندنی لیکن رہائن پر اس کی بہار عجب ہی ہوتی ہے۔ جس چھوٹے سے ہوٹل میں یہ کھانا کھا رہے تھے وہاں کی بیس سالہ خادمہ نے کھڑکی سے چاندنی میں رہائن کے منظر کی طرف اشارہ کر کے کہا "اس وقت لورے لائی بڑی خوبصورت معلوم ہو رہی ہوگی۔" کرا کسلے نے کہا۔

"ہاں، بیشک، مگر جب تک ہمارے ساتھ کوئی چھوٹی سی خوبصورت لڑکی نہ ہو ہم بھلا کیا لطف اٹھا سکتے ہیں۔ ہاں رہائن کی کوئی بیٹی ہمیں لورے لائی کی سیر کرائے تو دوسری بات ہے۔"

اس پر وہ خادمہ ہنسی۔

کرا کسلے نے کہا۔ "تم نہیں چل سکتیں؟"

اس لڑکی نے کہا۔ "مالک کی اجازت کے بغیر کیسے جا سکتی ہوں۔"

کرا کسلے نے کہا۔ "میں اس سے پوچھ لوں؟"

لڑکی نے جواب دیا۔ "اگر آپ چاہیں تو پوچھ لیجئے۔"

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"تھیا۔"

"کیسا پیارا نام ہے۔"

"آپ انگریز ہیں؟"

"ہاں میرا نام جیمز ہے اور یہ میرا دوست ہے۔ اس کا نام نعیم ہے!"

"یہ بھی انگریز ہے؟" تھیا نے بھولے پن سے کہا۔

"نہیں ہندوستانی۔ عرب، حبشی جو چاہے سمجھ لو۔" کرا کسلے نے جواب دیا۔

اتنے میں ایک اور میز سے ایک بھاری بھرکم جرمن عورت نے تھیا کو پکارا اور وہ اس کا حکم سننے چلی گئی۔

رات کے دس بجے کے قریب تھیا کو چھٹی ہوئی اور وہ ان تینوں دوستوں کے ساتھ چاندنی رات میں اس سڑک پر ٹہلنے آئی جو لورے لائی کی چٹان کو جاتی تھی۔ کبھی کبھی کوئی سائیکل پاس سے گذرتی اور سائیکل والا حیرت سے اس عجیب گروہ کو دیکھتا۔ ایک نوجوان پائپ پیتا ہوا دنیا بھر سے بے خبر، ایک شخص ہلکی سانولی رنگت اور کالے چکنے بال اور غیر یورپی چال والا، ایک خوبصورت سا غیر ملکی، غالباً انگریز اور اس کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے ایک جرمن لڑکی جس کا لہجہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ مزدور طبقے کی ہے۔

لورے لائی کی چٹان جیسی خوبصورت چیزیں رب العالمین نے بہت کم بنائی ہیں۔ جب رہائن اس حصے سے گذرتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ جادو کا خطہ ہے۔ آہستہ آہستہ تمکنت اور عظمت سے بہنے

والی ندی کے قریب یہ بڑی سی چٹان۔ ندی کے اس پار سے ایک کھڑکھڑاتی ہوئی آواز چاندنی میں نیم عیاں اور نیم مبہم گردوپیش کا وہ منظر کہ جس کا یاد رکھنا مشکل ہے اور جس کا بیان کرنا ناممکن۔ اس چٹان اور اس مقام سے جرمن شاعری اور جرمن ادب کے ہزاروں رومان وابستہ ہیں۔ اس جادو کی چٹان پر آج بھی وہی حسن چھایا پڑتا ہے جس نے سینکڑوں برس قبل جرمن شاعروں کو مسحور کیا ہے۔

ہروشا اور نعیم ذرا الگ بیٹھے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ تھیا کراکسلے کی آغوش میں تھی اور کراکسلے آہستہ آہستہ اس سے باتیں کر رہا تھا۔ بیچ بیچ میں ان دونوں کے ہنسنے کی آواز آتی اور پھر باتوں کی ۔۔۔ عاشقی کی باتوں کی مبہم سی آواز۔ نعیم نیم رشک اور نیم دلچسپی سے ان دونوں کو اس منظر کے پس منظر کے ساتھ دیکھ رہا تھا کہ اتنے میں تھیا کے ہنسنے اور پھر گنگنانے کی آواز آئی اور پھر اس کی آواز نغمہ بن گئی اور اس نے ایک پرانا جرمن گیت گانا شروع کیا جو سینکڑوں سال سے جرمن لڑکیاں اپنے عاشقوں کو سناتی آئی ہیں۔

ہروشا نے اس متروک زبان میں لکھے ہوئے گیت کا خلاصہ سمجھایا۔ لڑکی کہتی ہے کہ "تم مجھے سب سے پیارے ہو، یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔ رات کے وقت آؤ۔ آدھی رات کے قریب آؤ۔ میرا باپ سوتا ہوگا۔ میری ماں سوتی ہوگی۔ میں اکیلی سوتی ہوں۔ کمرے کے دروازے کو کھٹکھٹاؤ۔ کنڈی کو ہلاؤ۔ میرا باپ یہ سمجھے گا ۔۔۔ میری ماں یہ سمجھے گی کہ یہ ہوا کا شور ہے۔"

جب وہ گیت ختم کر چکی تو ہروشا نے تعریف کی۔ نعیم نے بھی تعریف میں ایک آدھ جملہ کہا اور کراکسلے نے جس کا ہاتھ تھیا کی کمر میں تھا، اسے لپٹا کے اس کا بوسہ لیا، اور پھر رہائن کی باجبروت روانی اور چاندنی کے نکھار اور چٹان کے جادو اور دور کسی ریل کی گھڑگھڑاہٹ کے پس منظر سے ابھر کر تھیا کی سریلی آواز نے ایک گیت گانا شروع کیا جو مقابلتاً جدید زبان میں تھا اور جسے نعیم بھی بلا ترجمے کے سمجھ سکتا تھا۔

"میں ایک لڑکی کو جانتا ہوں جو بڑی حسین اور خوبصورت ہے۔
مجھے اس کے ساتھ سونے کی بڑی تمنا ہے
اس کا گھر رہائن سے دور نہیں

کاش میرے پیر مجھے وہاں تک بہا لے جا سکتے
آہ خدایا! کاش رہائن اتنا چھوٹا ہوتا
کہ میں تیر کے اس کے پاس جا سکتا ۔۔۔"

دوسری صبح کو کراکسلے تھیا سے لپٹ کے اور نعیم کو صبح بخیر کہہ کے کولون واپس جانے والی ریل میں ہروشا کے ساتھ سوار ہو گیا۔ اسے سیدھا انگلستان واپس ہونا تھا اور اس کا اسے افسوس تھا کہ نعیم کے ساتھ وہ میونک تک نہیں جا سکتا۔ اور ہروشا کی تعطیلات بالکل ختم ہو چکی تھیں۔ کولون سے اسے برلن ہوتے ہوئے پراگ جانا تھا۔ جہاں چار دن کے بعد اسے چیکوسلواکیہ کے دفتر وزارت خارجہ میں ایک عہدے کا جائزہ لینا تھا۔

تھیا بھی ریل کے جانے کے بعد نعیم سے ہاتھ ملا کے رخصت ہوئی اور نعیم اپنی ٹرین کا انتظار کرنے لگا جو اسے جنوب کی طرف لے جانے والی تھی۔

اس نئی ٹرین سے بھی وہ رہائن کا منظر دیکھتا رہا۔ تین عورتیں مقابل کی نشست پر بیٹھی تھیں۔ ایک بہت مہذب، ادھیڑ عمر کا جرمن اس کے قریب بیٹھا تھا اور اس سے اس کے وطن اور اس کے سفر کے متعلق باتیں کرتا رہا تھا۔ پھر وہ خاموش ہو گیا اور منظر دیکھتے دیکھتے نعیم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ایلس کے خیال سے دل میں اس نے درد کی ایسی کسک محسوس کی گویا اس کے بغیر زندگی نامکمل سی تھی۔ ہروشا اور کراکسلے کے جانے کے بعد پھر تنہائی کے احساس نے اس کے دل پر ہتھوڑے چلانے شروع کئے۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ سفر ایک گریز کی سی کیفیت ہے۔ زندگی سے، تنہائی سے اور اپنے آپ سے۔ اور یہ سفر ہے کیا؟ نئے پس منظروں میں اپنے آپ کو بھلا دینے کی کوشش، جیسے زندگی کا سفر۔ تنہائی سے تنہائی کا علاج۔ ایلس واپس آئے گی یا نہ آئے گی۔ اب تک اس کا ایک خط بھی نہ مل سکا تھا۔ لیکن آج ہائیڈل برگ میں اس کے خطوط ملیں گے۔ پیرس سے وہاں بھیج دیئے گئے ہوں گے۔

ایک طرح کی اعصابی کمزوری نعیم پر حاوی ہونے لگی۔ تین عورتیں سامنے کی نشست پر باتیں کر رہی تھیں۔ وہ سوچنے لگا کب تک میں اس طرح گریز کرتا رہوں گا۔ کب تک یہ ذہنی اور جذباتی انتشار باقی رہے گا۔ اور کوئی ترکیبی نتیجہ، کوئی امتزاج میری روح اور ذہن اور جسم کی فضا میں نہ ابھرے گا۔ کب

تک میں زندگی سے بچ بچ کے خوابوں کی دنیا میں، عاشقی میں پناہ لیتا رہوں گا اور عاشقی بھی خالص جذباتی عاشقی جس میں کوئی ذہنی اطمینان نہیں۔

مائن تس میں گاڑی بدل کے وہ ہائیڈل برگ جانے والی ریل میں سوار ہوا۔ غروب آفتاب سے دو گھنٹہ پہلے نعیم ہائیڈل برگ پہنچا۔ پہاڑوں پر ہلکی سی لہر تھی اور خزاں نے ان پہاڑیوں پر آتے ہوئے درختوں کے رنگ پر زردی سی پھیر دی تھی جو دھوپ کی پیلی سی چمک میں بڑی دلکش معلوم ہوتی تھی۔ ان پہاڑوں کے بیچ میں نیکر بہتا ہے، جس کے متعلق اقبال نے ایک بڑی دلکش نظم لکھی ہے۔ مکانوں کا رنگ صوفیانہ تھا۔ اس کی وضع قدیم، شہر کا نقشہ قرونِ وسطیٰ کا، اور صفائی بیسویں صدی کی۔ دور درختوں کے جھنڈ میں قلعے کا منظر۔ کیا کوئی قصبہ اتنا خوبصورت بھی ہو سکتا ہے؟

اپنا سوٹ کیس لیے وہ اس خوبصورت شہر کی سڑکوں پر راستہ پوچھتا ہوا بڑھا۔ ہر چوتھا آدمی یونیفارم پہنے تھا۔ ایک نوجوان افسر سے اس نے ''لانڈہاوز اشتراسا'' کا پتہ پوچھا اور وہ اسے اپنے ساتھ روزاشتاگ مایر کے مکان تک لے آیا۔ نعیم اس قوم کے اخلاق کا گرویدہ ہوتا جا رہا تھا۔ یہ بااخلاق، مہذب قوم، یہ سادگی پسند اور صاحب دماغ قوم کیونکر ''میری جدوجہد'' کے دام میں اسیر ہو سکتی ہے۔ کیا فطرتِ انسانی میں اس قدر تضاد ممکن ہے؟ اٹھارہ برس کی ایک لڑکی باہر جانے کے کپڑے پہنے ہوئے سیڑھیوں سے اتری۔ روزاشتاگ مایر یہی تھی۔ اس کا نام روزا تھا اور اس کی صورت بھی گلاب ہی ایسی تھی۔ گول گلاب کی طرح سرخ چہرہ، گداز لب، گہری نیلی آنکھیں، بھورے سرخی مائل بال، شرمیلی آنکھیں، سفید خوشنما دانت، چھوٹی سی آریائی ناک، میانہ قد اور سڈول جسم۔ چہرے سے شرافت اور حسن یکساں ظاہر۔

نعیم نے ٹوپی اتار کے کہا۔ ''میں فراؤ اشتاگ مایر یا فرائے لائن اشتاگ مایر سے مل سکتا ہوں؟''

''میں ہی فرائے لائن اشتاگ مایر ہوں!''

''میرا نام حسن ہے، نعیم حسن، کیا آپ کو مسٹر کرا کسلے کا خط ملا تھا۔۔۔؟''

''جی ہاں!'' اس نے ہاتھ بڑھا کے ہاتھ ملایا۔ ''آپ کا کمرہ تیار ہے۔ میں آپ کو راستہ دکھائے دیتی ہوں۔'' زینے پر اس نے پوچھا۔ ''کرا کسلے کیسے ہیں؟''

''اچھے ہیں۔'' نعیم نے جواب دیا۔ ''آج ہی صبح وہ لندن واپس گئے ہیں۔ آپ انہیں اچھی طرح

جانتی ہیں؟'' نعیم نے ٹوٹی پھوٹی جرمن میں گفتگو کرنے کی کوشش کی۔

''جی ہاں۔ گذشتہ سال گرمیوں میں جب وہ یہاں یونیورسٹی میں پڑھتے تھے تو ہمارے ہی یہاں رہتے تھے۔۔۔۔ یہ ہے آپ کا کمرہ۔'' اس نے ایک کمرے کا دروازہ کھول کر کہا۔ کمرے میں شاہ بلوط کا بھاری بھرکم، پرانی وضع کا مگر خوبصورت فرنیچر تھا۔ ایک بڑی سی مسہری، بڑا سا سنگار میز، منہ ہاتھ دھونے کا میز۔ سرے پر بہت بڑا آتشدان تھا۔

''آپ چائے پئیں گے؟'' روزا نے پوچھا۔

''نہیں میں راستے میں پی چکا ہوں۔ شکریہ۔'' نعیم نے کہا۔

''تو اگر آپ اجازت دیں تو میں جاؤں۔ مجھے اپنی والدہ کے ساتھ جانا ہے۔''

''ضرور۔ بہت شکریہ۔''

کپڑے بدل کے نعیم پال لانکس سے ملنے نکلا۔ یہ ایک مصور تھا جس کے نام کرا کسلے نے نعیم کو ایک خط دیا تھا۔ بان ہوف اشتراسا یعنی اسٹیشن کی سڑک پر اس کا مکان تھا۔ ایک بڑے سے پھاٹک سے نعیم اندر داخل ہوا۔ پھاٹک کے دونوں طرف اندر بڑے بڑے دالان تھے۔ اس کے بعد ایک چھوٹا سا صحن تھا، اور صحن کے اطراف دو منزلہ مکان تھا۔ نعیم کو یہ مکان کچھ ایسا ہی معلوم ہوا جیسے ہندوستان خصوصاً یو۔پی کے پرانے شرفا کے مکانات۔ بائیں طرف کے دالان میں ایک آرام کرسی پر ایک بڑھیا لیٹی ہوئی تھی۔ ایک بوڑھا بید کی کرسی پر بیٹھا، عینک لگائے اخبار پڑھ رہا تھا۔ اس کی مونچھیں بڑی بڑی تھیں۔

نعیم نے پوچھا۔ ''کیا ہر پال لانکس یہیں رہتے ہیں؟''

اس اثنا میں پینتیس چالیس سال کی ایک دبلی پتلی عورت بھی ایک کمرے سے باہر نکل آئی۔ بوڑھے نے اپنی عینک اتاری۔ ان تینوں کے چہروں پر انسانیت اور شفقت سی جھلکنے لگی۔ اور بوڑھے نے کہا۔

''آپ پال سے ملنا چاہتے ہیں؟ اس کی شادی ہو گئی ہے۔ اس نے الگ گھر لے لیا ہے۔''

بڑھیا نے پوچھا۔ ''آپ اسے جانتے ہیں؟''

نعیم نے کہا۔ ''میرے پاس ان کے نام ایک تعارفی خط ہے۔''

چالیس سالہ عورت نے کہا۔ ''میں پال کی بہن ہوں۔ یہ میرے والد ہیں۔ اور یہ میری والدہ ''۔ نعیم نے سب سے ہاتھ ملایا۔ بوڑھے نے اپنی کرسی خالی کر کے نعیم کو اس پر زبردستی بٹھایا اور اندر سے اپنے لیے ایک کرسی نکال لایا۔ نعیم نے پال کے نام خط اس کی بہن کو دے دیا۔

''آپ ہندوستانی ہیں؟'' اس نے کہا۔

''جی ہاں!''

اور ماں باپ اور ان کی چالیس سال کی بیٹی ہندوستان کی عظمت کی تعریف کرتے رہے اور ہندوستان کے متعلق سوالات کرتے رہے۔ بہت اصرار کر کے انہوں نے نعیم کو چائے پلائی۔ بڑھیا نے ایک بڑا سا کیک اس کے حوالے کیا اور بڑا اصرار کیا کہ اسے اپنے ساتھ لے جائے۔

پھر تامس کک کے دفتر پہنچ کے اس نے پوچھا کہ اس کے لیے کوئی خط وغیرہ ہے۔ ایلس کے دو خطوط اسے ملے۔ نیکر کے پرانے پُل کی طرف جاتے ہوئے اس نے آہستہ آہستہ لفافے کو چاک کیا۔ پہلے خط میں والہانہ محبت کے اظہار کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ دوسرا خط سنسنائی سے لکھا تھا۔ اس کا لہجہ معتدل تھا۔ اپنی ماں کی صحت کا ذکر، اپنے تمام دوستوں کا ذکر، گھر آنے کی خوشی کا ذکر۔ اور آخر میں یہ کہ سب سے زیادہ وہ نعیم کو چاہتی ہے۔

نیکر کے پرانے پل سے نعیم غروب آفتاب کے وقت قلعہ کا منظر دیکھ رہا تھا۔ صنوبروں میں جڑا ہوا قلعہ۔ اور ایک پہاڑ کا طویل سایہ دوسرے پہاڑ پر۔ مکانوں پر ایک خاموشی سی طاری تھی۔ ان رنگین خوبصورت رومانی جرمن مکانوں پر آتشدانوں کا دھواں فضا میں پھیل رہا تھا۔ نیکر کا خرام اتنا ہی آہستہ آہستہ اب بھی تھا، جیسا اقبال نے اسے اپنی طالب علمی کے زمانے میں یہاں دیکھا تھا۔ شاید اسی پُل سے، شاید یہیں کہیں کھڑے ہو کے اقبال نے گہری ہوتی ہوئی شام کو ہائیڈل برگ کے پہاڑوں اور مکانوں اور نیکر کی روانی کی خاموشی کا لطف اٹھایا ہوگا۔

اس کا دل مطمئن تھا۔ ایلس کے دونوں خطوط محبت میں ڈوبے تھے اور ہائیڈل برگ اور اس کے دل کی طرح پرسکون تھے۔ ہائیڈل برگ کے دونوں طرف پہاڑ خاموش تھے۔ اور چوڑی ہوتی ہوئی وادی جوان پہاڑوں کے ساتھ ساتھ میدانوں میں حل ہو جاتی ہے اور نیکر کو رائن تک پہنچا دیتی ہے، وہ بھی خاموش تھی۔ شہر کی روشنیاں مکانوں کی کھڑکیوں سے جھانک رہی تھیں۔

نعیم نے ہوٹل برگن ہوف میں کھانا کھایا۔ جہاں کھانا مہنگا تھا۔ پھر اشتائیگ مائر کے پانسیاں واپس آیا۔ زینے پر اسے روزا ملی جو اپنی ماں کے ساتھ نیچے اتر رہی تھی۔ اس نے اپنی ماں کا تعارف کرایا۔ فراؤ اشتائیگ مائر کی عمر کوئی پچاس سال کی تھی۔ مگر نعیم نے اس عمر کی ایسی خوبصورت عورتیں بہت کم دیکھی تھیں۔ اس کے مقابلے میں اس کی اٹھارہ سالہ لڑکی پھیکی معلوم ہوتی تھی۔ نعیم سوچنے لگا کہ فراؤ تھیا اشتائیگ مائر جوانی میں کس قدر خوبصورت ہوگی۔

دوسرے روز اس نے ناشتہ کے بعد ایلس کو ایک لمبا چوڑا نامۂ شوق لکھا۔ پھر اس سڑک پر سیر کرنے کو نکلا جو نیکر کے کنارے کنارے چلی گئی۔ ایک کلیسا کو دیکھا، ایک مرہٹہ طالب علم ملا جو ہند آریائی السنہ پر تحقیق کر رہا تھا۔ مگر جسے اتنا بھی معلوم نہ تھا کہ اردو زبان سنسکرت سے نکلی ہے یا سامی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اسی مرہٹے کے ساتھ یونی ورسٹی کی لائبریری دیکھی۔ یونی ورسٹی کی پرانی عمارت دیکھی، جس کو دیکھ کر آکسفرڈ یاد آتا تھا۔ نئی عمارت دیکھی جو امریکی طالب علموں کی فیاضی سے بنی تھی۔ لڑکوں کا قید خانہ دیکھا اور دارلمطالعہ دیکھا۔ پھر اسی ہندوستانی کے ساتھ ''فلسفیوں کی روش'' پر چہل قدمی کی۔ یہ پہاڑ پر ایک چوڑی سی روش ہے۔ اس پر سے نیکر اور ہائیڈل برگ اور قلعے کا منظر بڑا حسین معلوم ہوتا ہے۔ ایک بجے تک آفتاب بڑا خوشگوار تھا۔ نیچے اتر کے اوپٹ اشتراسا میں ایک چھوٹے سے ریستوران میں کھانا کھایا اور گھر کی راہ لی۔

چار بجے تک نعیم جرمن قواعد زبان دیکھتا رہا۔ جرمن بولنے میں اسے اچھا خاصہ تکلف ہوتا تھا۔ چار بجے روزا نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ نعیم نے اٹھ کے دروازہ کھولا تو روزا کافی کی کشتی لیے ہوئے کھڑی تھی۔ نعیم نے اس کے ہاتھ سے کشتی لے لی۔ چھتوں پر دھوپ سنہری بہار دکھلا رہی تھی۔ نعیم نے موسم کی تعریف کر کے گفتگو کا سلسلہ شروع کیا اور روزا کو قلعہ ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ روزا تیار ہوگئی اور کپڑے بدلنے چلی گئی۔

ہائیڈل برگ کے پرانے قلعے کا رہبر مسافروں کی جمگھٹ میں ہر کمرے اور کمرے کی ہر دلچسپ چیز کے متعلق تقریر کر رہا تھا۔ کبھی کبھی روزا بھی نعیم کو کچھ سمجھاتی۔ معلوم نہیں اس وقت نعیم کو دنیا کی ہر عورت کیوں بدشکل معلوم ہو رہی تھی۔ غلغلی سی جانور، عورت، جس کی خاطر مرد اس قدر بھٹکتا ہے۔ یہ اس کا سینہ، اس کے سینے کا ابھار، سخت ہو یا نرم، خوشنما ہو یا گرا ہوا اور بدنما۔ اور سب چوپاؤں کے بھی تو تھن ہوتے ہیں۔ بچوں کو دودھ پلانے کے لیے۔ ہروشا کی شوپن ہاوریت اس پر بڑی بدمزگی سے طاری

ہو رہی تھی اور اس وقت جنسِ لطیف سے اسے بڑی نفرت معلوم ہو رہی تھی۔ شرمیلی اور حسین روزا بھی اس وقت اسے چوپایہ معلوم ہو رہی تھی۔ دو تھنوں والا چوپایہ جو کپڑے پہنے پچھلی ٹانگوں کے بل کھڑا ہے کہ اتنے میں ایک موٹی بھدی سی جرمن خاتون یہ دیکھ کر کہ روزا نعیم کی رہبری کر رہی ہے، روزا سے مخاطب ہو کے کہنے لگی۔ ''کیسی حسین رہبر ہو۔'' اس پر روزا ذرا شرمائی اور اس کے گلاب سے گالوں پر سرخی دوڑ گئی۔ نعیم کو پھر وہ ایسی ہی حسین معلوم ہوئی جیسی پہلی نظر میں گل سرخ معلوم ہوئی تھی۔ اور عورتوں اور چوپایوں کا فرق اس پر ظاہر ہو گیا۔ تیسرے دن جب وہ ہائیڈل برگ سے رخصت ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔ پال لائکس اس سے ملنے آیا۔ ادھیڑ عمر کا دبلا آدمی تھا۔ پچکا چہرہ اور دانت خراب۔ پال لائکس روزا کے حسن و جمال کی تعریف کر کے اسے چھیڑتا رہا اور نعیم سے معافی مانگتا رہا۔ یہاں تک کہ ریل کا وقت آ گیا اور دونوں نے اسے اسٹیشن پہنچا دیا۔ اسٹیشن پر بھی وہ روزا کو کرا کسلے کے متعلق ستاتا رہا کہ اسے کرا کسلے سے عشق ہے۔

چند گھنٹوں کے بعد گاڑی اشتت گارٹ پہنچی جو ورتم برگ کا مرکز ہے، اور ان تمام شہروں سے بہت مختلف ہے جو نعیم نے اب تک دیکھے تھے۔ اس کا طرز تعمیر جدید ہے اور شہر خود بخود اگا نہیں ایک خاکے پر تعمیر ہوا ہے۔

ہوٹل سے نعیم نے ڈورو تھیا پفائی فر کو ٹیلیفون کیا جس کے نام ہروشا نے اسے خط دیا تھا۔ ڈورو تھیا نے پانچ بجے آنے کا وعدہ کیا۔ ابھی وقت بہت تھا۔ اس لیے دوپہر کا کھانا کھا کے نعیم شہر دیکھنے اور گھومنے نکل گیا۔ موسم پست تھا۔ ابر چھایا ہوا تھا۔ اس نے ''نیا قلعہ'' دیکھا جس کی عمارت بڑی ہی خوبصورت تھی، اور کمروں کی آرائش قابل دید۔ اس نے نپولین کی خواب گاہ دیکھی۔ پھر پرانا قلعہ اور اس کا تہ خانہ دیکھا۔ یہ تہ خانہ جرمن تاریخ میں اتنی ہی اہمیت رکھتے ہیں، جتنی جرمن زندگی میں بیئر۔ یا جرمن سیاسی مظاہر میں سواستکا اور فس کی چال۔

ہوٹل واپس آ کے نعیم نے کافی پی۔ اتنے میں ہوٹل کے نوجوان ملازم نے آ کے اطلاع دی۔ ''ایک خاتون آپ سے ملنے آئی ہیں۔'' نعیم کمرۂ ملاقات میں گیا۔ فرائے لائن پفائیفر کی عمر تیس کے قریب تھی۔ جسم گٹھا ہوا، قد میانہ، چہرہ گول اور سر کے بال ہلکے بھورے، بہت ہی ہنس مکھ عورت تھی، بات چیت لبھانے والی۔ نعیم نے اسے رات کے کھانے کی دعوت دی، اور ریستوران اور غذا کا انتخاب اسی پر چھوڑا۔ ڈورو تھیا نے صوبہ ورتم برگ کی خاص چیزیں منگوائیں جن میں ایک سموسا نما نمکین روٹی تھی۔ کھانے کے بعد

ڈورو تھیا رخصت ہوئی۔ ایک اثر پرست نقاش سے اس کی دوستی، غالباً معاشقہ تھا۔ کھانے کے وقت نعیم سے برابر اس کی تصویروں کا ذکر کرتی رہی اور کہتی رہی کہ اس کا دوست ایک دن دنیا کے عظیم ترین مصوروں میں شمار کیا جائے گا۔ نعیم نے دل میں خیال کیا کہ عورت جس مرد سے محبت کرتی ہے وہ اسے اکثر بہت بڑا سمجھنے لگتی ہے۔ اس کی نسوانیت اپنے محبوب کی انا کو اس کامل اطاعت کے ساتھ تسلیم کر لیتی ہے کہ حیرت معلوم ہوتی ہے۔

اس کے جانے کے بعد نعیم ایک سینما گھر میں جا گھسا جہاں ایک فلم دکھایا جا رہا تھا جو شلر کے ڈرامے ''قزاق'' سے ماخوذ تھا۔ نازی جرمنی میں شلر کی جو عزت تھی وہ گوئٹے تک کی نہ تھی اور لیسنگ جیسے انسانیت پرستوں اور نسلی تعصب مٹانے والوں کا تو ذکر ہی کیا تھا۔ نعیم نے سینما ہال میں بیٹھے بیٹھے غور کیا۔ دوکانوں کی کھڑکیوں میں شلر اور گوئٹے وغیرہ کے بعد سب سے زیادہ افراط کنوٹ ہامزون کے ناولوں کی تھی۔ یہ ناروستانی نازی اس زمانے میں جرمنی میں اتنا مقبول تھا کہ کبھی اپنے وطن میں بھی وہ اتنا مقبول نہ ہوا۔ اس کی لڑکی الینور جرمن فلموں میں کام کرتی تھی۔ گرہارٹ ہاوپٹ مان نے بھی نازیت کے آگے سر تسلیم خم کر دیا تھا۔ ہاں غیر یہودی ادیبوں میں تو ماس مان نے البتہ جرمنی اور جرمنی کی دی ہوئی عزت کو لات ماردی تھی۔ تو ماس مان کا ''جادو کا پہاڑ'' کیا عجیب و غریب کتاب تھی۔ اس صدی کا اور کونسا ناول اس کا مقابلہ کر سکتا ہے؟ شاید ''ژاں کرستوف''۔ ژاں کرستوف میں رہائن کی سی پر جبروت اور بے جھجک روانی تھی۔ رہائن کی چوڑائی تھی اور وہ روئداد اور قصہ کی بندشوں کو بہاتا ہوا رواں ہے۔ ''جادو کا پہاڑ'' گویا ایک سر بفلک برف پوش پہاڑ ہے، جس کی دو چوٹیاں یہودی نا قد اطالوی تمبرینی یا موں بلاں اور ینگ فراؤ یا ایورسٹ اور کے ۱۲ (K2) سی بلندی سے باہم سرگرم سخن ہیں۔ دونوں ایک دوسرے پر برف کے زلزلے گرا رہے ہیں، اس بلندی سے دنیا کو دیکھ رہے ہیں کہ دنیا میں رہنے والے انسان کے ذہن کی کوئی حرکت ایسی نہیں جو وہاں سے نظر نہ آ سکتی ہو۔ اس کے بعد وہ پھر فلم دیکھنے میں محو ہو گیا۔ فلم میں ایک سفید بالوں والی لڑکی تھی، جس کو دیکھ دیکھ کے بار بار ایلس یاد آتی تھی۔

دوسرے دن صبح کو اس نے بہت دور کا چکر لگایا۔ قلعہ کا باغ دیکھا۔ ایک ٹیلے سے جس پر آبادی زینہ بہ زینہ چڑھتی چلی گئی ہے، اشتت گارٹ کا منظر دیکھا۔ میوزیم دیکھا۔ وہاں زیادہ تر مجسمے دنیا کے مشہور مجسموں کی نقل تھے۔ ہوٹل واپس آیا۔ سویا اور پھر اسٹیشن کے پاس ایک بالکل جدید وضع کے کافی گھر گیا۔ ایک خوبصورت چکر دار زینے نے اسے پہلی منزل پر پہنچایا۔ جہاں وہ بینڈ کی موسیقی سنتا

اور کافی پیتا رہا۔ جرمن موسیقی بالکل فوجی بجتی جاری تھی فوجوں کا کوچ۔ نس کی چال۔

ڈوروتھیا پخالیفر سے حسب وعدہ اسٹیشن کے سامنے ملاقات ہوئی۔ ڈوروتھیا شام کے کپڑوں میں تھی اور بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ ایک مہنگے سے ریستوران میں کھانا کھایا۔ اور پھر آپیرا ''دختر عسکر'' دیکھا۔ اس کے بعد ایک اور جدید وضع کے کافی گھر میں ڈوروتھیا کے ساتھ کافی پی۔ جہاں نعیم کوئی سیاسی موضوع چھیڑتا ، ڈوروتھیا چونکی ہو کے ادھر اُدھر دیکھتی ۔ اس سے آہستہ بات کرنے کو کہتی۔ ''یہاں کسی کا اعتبار نہیں۔'' اور لطف یہ کہ وہ خود بڑی پکی نازی تھی۔

اگلے روز اشتت گارٹ سے رخصت ہوا اور چند گھنٹے میں اُلم پہنچا۔ یہ ایک چھوٹا سا قریہ ہے۔ ان دیہاتوں میں سے، جو ایک ندی اور ایک کلیسا کی وجہ سے وجود میں آئے۔ مکان بالکل قرون وسطیٰ کے نمونے کے ہیں۔ سڑکوں پر قرونِ وسطیٰ کا خواب آور سکون ہے اور ڈینیوب کو پہلی مرتبہ دیکھا۔ رہائن کی طرح اس دریا سے بھی ہزاروں رومان وابستہ ہیں لیکن زیادہ تر عہد حاضر کے، جدید چند صدیوں کے رومان۔ تاریخ کو بنتے اور بگڑتے جتنا اس دریا نے دیکھا ہے شاید ہی کسی اور نے دیکھا ہو۔ مگر ڈینیوب جو بے شمار دار الخلافوں کی رونق ہے یہاں اپنے منبع سے زیادہ دور نہ ہونے پائی تھی، اور ایک چھوٹی گدلی سی ندی معلوم ہوتی تھی۔

وہ گردن اٹھا کے کلب کے بلند مینار کو دیکھ رہا تھا کہ کس نے اسے مخاطب کیا۔ وہ اسی طرف پلٹا تو مخاطب کرنے والے کو اپنی غلطی معلوم ہوئی۔ مخاطب کرنے والے نے اپنا تعارف کرایا۔ وہ آپیرا کا اداکار تھا اور نعیم کو اپنا ایک جرمن دوست سمجھا تھا۔۔۔ نعیم نے اپنے دل میں خیال کیا کہ شاید یہودی دوست۔ شاید یہ شخص خود بھی یہودی تھا۔

اس اجنبی کے ساتھ نعیم کلیسا کے مینار پر چڑھا۔ جہاں سے ڈینیوب ایک چھوٹی سی نالی معلوم ہوتی تھی، اور نیچے اُلم کے پرانی وضع کے مکانات کھلونے۔ وہاں سے اتر کے وہ اسی اجنبی کے ساتھ ندی کے کنارے ایک سڑک پر ہولیا۔ عورتوں نے نعیم کی طرف ذرا پریشانی سے، اور بچوں نے تماشا سمجھ کے دیکھا۔ اب تک جرمنی میں اسے کہیں عجیب اخلاقت نہیں سمجھا گیا تھا لیکن شاید اس چھوٹے سے قصبے میں ہندوستانیوں اور ایشیائیوں کا گذر بہت کم ہوتا ہے۔

شام کو ایک قہوہ خانے میں بیٹھ کے دونوں نے بیئر پی۔ اجنبی ساتھی نعیم کے اعتراضات کے جواب میں ہٹلر کی حمایت کر رہا تھا۔ ''ہم میں سے اکثر جرمن کہتے ہیں کہ ہٹلر نے ہمارے لیے اتنا سب کچھ کیا

ہے۔ اس نے ہمیں عزت عطا کی۔۔۔ اور روٹی۔ ہم میں سے بعض یہودیوں سے متنفر نہیں۔ پھر بھی ہم اڈالف ہٹلر کے ساتھ ہیں۔ اسے کام کرنے کا موقع دو۔'' نعیم کو یقین سا ہونے لگا کہ یہ شخص یہودی ہے۔ اس نے دیکھا کہ جب ہٹلر کا نام لیتا تھا تو آس پاس کے لوگ اس کی طرف ذرا مشکوک نظروں سے دیکھتے اور پھر باتوں میں محو ہو جاتے۔

دوسرے دن گاڑی کے وقت تک نعیم جرمن گرامر دیکھتا رہا اور الفاظ یاد کرتا رہا۔ اُلم کے اجنبی یہودی سے سیاسی بحث کرتے وقت اس نے محسوس کیا تھا کہ سیاسیات کے متعلق جرمن الفاظ اسے کس قدر کم یاد ہیں۔

گاڑی دو تین گھنٹے میں میونک پہنچی۔ یہ اورینٹ ایکسپریس تھی۔ پیرس سے قسطنطنیہ کو جانے والی۔ نعیم کو افسوس ہوا کہ اس رومانی گاڑی پر جس کا ذکر وہ اس قدر سن چکا تھا اور جس کے متعلق اس قدر پڑھ چکا تھا، وہ آگے سفر نہیں کرے گا۔ آگے کیا کیا جادو بھرے شہر ہیں، وی آنا، بوداپسٹ، بلغراد، صوفیہ، ادرنہ، استانبول۔

اسٹیشن بہت بڑا تھا اور بڑے بڑے حرفوں میں میونک کا جرمن نام میون شن لکھا ہوا تھا۔ ایک جرمن لڑکی ہلڈا گارٹ شراڈر جو بہت موٹی اور بھدی اور قد آور تھی۔ اور جس کے متعلق کرا کسلے کہا کرتا تھا کہ اس کو دیکھتے ہی حرارات غریزی سرد ہو جاتی ہے، جو پیرس میں کچھ دن پڑھ چکی تھی، نعیم کو لینے اسٹیشن آئی تھی۔ اس نے ایک پاں سیاں میں نعیم کے ٹھہرنے کا انتظام کرا دیا تھا۔ نعیم نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ گوئٹے اشترا سا میں پاں سیاں تک پہنچا کے ہلڈا گارٹ شام کو ملنے اور اپنی بہن فریڈا گارٹ کو ملانے کا وعدہ کر کے چلی گئی۔ اور نعیم نے میونک کی سیر کرنی شروع کی۔ بویریا کے اس پایۂ تخت میں ایک دلکش قدامت ہے، ساتھ ہی وہ رونق اور چہل پہل بھی ہے جو بڑے شہروں میں ہوتی ہے۔ فراون کرشہ (کلیسائے خواتین) کے قریب دو لڑکیاں ہنستی ہوئی گذر گئیں اور نعیم کی طرف انہوں نے ہمت افزائی کے لیے مڑ کر دیکھا۔ نعیم نے کلیسائے خواتین اور دوسرے کلیساؤں کو دیکھتے ہوئے ایسار کے پُل کا رخ کیا۔ ایسار کے پُلوں میں بھی قدامت کا حُسن ہے۔ وہ میون شن کے سب سے بڑے باغ انگلشر گارتن گیا۔ جہاں خزاں کے آثار تکلیف دہ حد تک نمایاں تھے۔ واپس آ کے اس نے ایک پرانے بیئر ہاؤس میں کافی پی۔ ہٹلر کا مشہور و معروف بیئر ہاؤس اور اس کا تہ خانہ بھی دیکھا۔ وہ مقام بھی دیکھا جہاں ہر نازی یا ٹوپی اتارتا ہے یا فوجی سلام کرتا ہے لیکن یہودیوں کو ٹوپی اتارنے یا سلام کرنے کی بھی شاید اجازت نہیں۔

شام کو ہلڈا گارٹ اپنی بڑی بہن فریڈا گارٹ کے ساتھ آئی۔ فریڈا اپنی بہن سے بالکل مختلف تھی۔ چھریرا سا بدن، ہلڈا سے زیادہ خاموش، لیکن اس کی آنکھیں مردوں کو اور جنسی سرور کو ڈھونڈتی ہوئیں۔ ہلڈا کے مقابلے میں وہ بہت متمدن معلوم ہوتی تھی اور اس کے کپڑے بھی اس کی خوش مذاقی کے گواہ تھے۔ ان دونوں لڑکیوں نے نعیم کو ہوف برائے ہاوز کی سیر کرائی۔ یہ وہ مشہور شراب خانہ ہے، جہاں ایک حصے میں مزدور اور دوسرے طبقے میں مقابلتاً متمول لوگ لیکن مزدور بڑے ہی لطف اور بے تکلفی اور مہمان نوازی کے ساتھ میونخ کی تازہ کشید کی ہوئی بیئر پیتے ہیں۔

کئی جرمن مزدوروں نے (ان میں متوسط طبقے کے لوگ بھی شامل ہوں گے) نعیم کو خوش آمدید کہا۔ بڑے اخلاق اور بڑی بے تکلفی سے باتیں کیں۔ بڑے بڑے قدموں جیسے جاموں میں یہ لوگ بیئر پیتے جاتے۔ نعیم کو حیرت تھی کہ اتنی بہت سی بیئر ان کے پیٹوں میں سماتی کیسے ہے۔

کوئی آدھ گھنٹے کے بعد نعیم کو لے کے یہ دونوں بہنیں باہر نکلیں اور ایک شائستہ سے کافی گھر میں پہنچیں۔ جہاں حسین نوجوان خادمائیں بویریا کے دہقانی لباسوں میں لوگوں کو کھانے پینے کی چیزیں دے رہی تھیں۔ بینڈ بھی تھا۔ بیچ میں ناچنے کے لیے جگہ تھی۔ جہاں معمولی کپڑوں میں لوگ ناچ رہے تھے۔ نعیم ایک آدھ بار ہلڈا کے ساتھ اور دو تین بار فریڈا کے ساتھ ناچا۔ وی آنا کا والٹس اس نے نعیم کے ساتھ اس خوبی سے، اور اپنے جسم کی جنبشوں کے ساتھ اس لطافت سے ناچا کہ نعیم محسوس کرنے لگا کہ ہوف برائے ہاوز کی بیئر کا نشہ اب کہیں جا کے محسوس ہو رہا ہے اور ایلس بالکل دھندلے پس منظر میں چلی گئی۔

ایک عجیب و غریب شخص جو غالباً بہت زیادہ پی گیا تھا، ان کی میز کے قریب آیا۔ اس نے نعیم سے فرانسیسی میں کہا۔ ''تمہارے پاس دو سفید عورتیں ہیں۔ ان میں سے ایک مجھے دو میں ناچنا چاہتا ہوں۔''

فریڈا نے اسے جرمن میں تشریف لے جانے کو کہا اور وہ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد نعیم سے فریڈا نے کہا کہ یہ شخص یہیں کا رہنے والا ہے اور کسی طرح فرانسیسی نہیں ہے، لیکن آپ کو ہم سے فرانسیسی میں باتیں کرتے دیکھ کے اس نے بھی قابلیت بگھارنی چاہی۔

ہلڈا نے دوسرے دن میوزیم ساتھ چلنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن معلوم نہیں دونوں بہنوں نے آپس میں کیا طے کیا تھا کہ بجائے ہلڈا کے فریڈا آئی۔ دن کی روشنی میں اس کا حسن سی سالہ نعیم کو ذرا بھی اچھا نہیں معلوم ہوا۔ یہ رات کی بیئر کا نتیجہ ہوگا کہ وہ اس وقت اتنی بھلی اور ''گرم'' معلوم ہو رہی تھی۔ اس روز دن

بھر بارش ہوتی رہی۔ سارا دن میوزیم میں گذرا لیکن وہاں بھی ذرا ذرا سردی تھی۔ شام کو باہر نکل کے چائے پی۔ اب بھی بارش کا وہی حال تھا۔ وقت ایک بیئر ہاؤس میں گذار کے اس نے رات کا کھانا فریڈا کے ساتھ اسٹیشن کے ریسٹورنٹ میں کھایا۔ اب پھر بیئر کا نشہ چڑھ رہا تھا۔ کچھ دیر کل والے کافی گھر میں گذار کے فریڈا کے اصرار پر دونوں وہاں سے بھی اٹھ گئے۔ فریڈا دن بھر میوزیم کی سیر کرانے کی وجہ سے بہت تھک گئی تھی اور گھر جانا چاہتی تھی۔ نعیم اسے گھر چھوڑنے اس کے ساتھ چلا۔ ٹرام سے اتر کے جب وہ اپنے گھر کے پاس پہنچی تو راستے کے لیمپ کی دھندلی روشنی میں اور برستے ہوئے پانی میں اس کا حسن سی سالہ اور اس کا چھریرا بدن جو برساتی میں لپٹا ہوا تھا، جسے وہ ہاتھوں سے تھامے ہوئے تھی، بڑا خوبصورت معلوم ہوا۔ نعیم نے اس کا منہ اپنی طرف پھیر کے اور آہستہ سے اسے اپنی طرف کھینچ کے اس کے ہونٹوں کا بوسہ لیا جن پر بارش کے قطروں کا مزہ بے نمک سا معلوم ہوا۔ فریڈا نے اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے کہا۔ ''شرارت مت کرو۔ سڑک کی روشنی میں نہیں۔''

چند قدم پیچھے ہٹ کے ایک اندھیری سی گلی میں نعیم نے فریڈا گارٹ کو پھر لپٹا لیا۔ پانی اسی طرح برس رہا تھا، مسلسل اور آہستہ آہستہ۔ اس نے برساتی کے اندر فریڈا گارٹ کی چھاتیوں پر ہاتھ ڈالا، انہیں سہلایا۔ پھر بوسے لیے اور اسے گویا اشتراسا اپنی پاس سیاں کو چلنے کو کہا۔ فریڈا نے کہا۔ ''بہت دیر ہو گئی ہے۔'' ایک دو اور بوسوں کے بعد اس نے کہا۔ ''اب جاؤ۔ نہیں تو پانی میں زکام ہو جائے گا۔''

نعیم اسے اس کے دروازے تک پہنچا کے بادلِ ناخواستہ رخصت ہوا۔ فریڈا کے ہونٹوں پر پانی کے قطروں کا بے نمک ذائقہ وہ ابھی تک محسوس کر رہا تھا۔

راستے بھر اس کا دل اسے ملامت کرتا رہا کہ ایلس سے اس نے بے وفائی کی۔

دوسرے دن گیارہ بجے وہ تھامس کک کے دفتر گیا۔ ایلس کا ایک خط اور تھا۔ اس میں بھی محبت کی باتیں تھیں۔ لیکن سنسنائی اور وہاں کے دوستوں کا ذکر بہت زیادہ تھا اور نعیم نے محسوس کیا کہ ''گریز'' کی حالت ہمیشہ گریز کی حالت نہیں رہتی۔ وہی زندگی بن جاتی ہے۔ جب میونخ کے جادو کا خود اس پر اتنا اثر ہوا تھا تو ایلس پر جو اپنے وطن اور اپنے گھر کے ماحول میں پھر واپس گئی ہے، اس ''گریز'' کا، اس تبدیلی کا اور زیادہ اثر ہوا ہوگا۔

بارہ بجے فریڈا نے آنے وعدہ کیا تھا۔ وہ نہیں آئی۔ ہلڈا آ کے اس کی لکھی ہوئی چٹھی دے گئی۔ ''مجھے سخت زکام ہے، اور کسی قدر حرارت ہے، میں تمہارے ساتھ پیکرن زی نہیں چل سکوں گی۔ مگر تم خود جا

کے ضرور دیکھ آؤ۔'' نعیم نے فریڈا کے بجائے اس کی بہن اور اپنی پرانی ملاقاتی ہلڈا کو ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ اس احساس کے ساتھ کہ ہلڈا کے جسم کی بوئی بوئی قطب شمالی کی یاد دلاتی ہے۔ مگر ہلڈا نے شاید اپنی بہن کے خیال سے خود ہی انکار کر دیا۔

ایک بجے ایک بڑی خوبصورت بس میں جس کے گدے آرام دہ تھے اور جس کا شوفر انتہائی شائستہ نعیم نے میگرن زی کا سفر شروع کیا۔ سامنے کی نشست پر ایک نیا بیاہا جوڑا تھا۔ عورت کی عمر پچیس سال کی ہوگی اور وہ ہلکا پھولدار ریشمی لباس اور اس پر ایک فرکوٹ پہنے تھی۔ مرد کی عمر پینتالیس سال ہوگی مگر وہ بہت وجیہہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ گوٹن گن یونی ورسٹی میں ریاضیات کا مددگار پروفیسر تھا۔ وہ بہت دیر تک نعیم سے ہندوستان اور حیدرآباد اور وہاں کی یونی ورسٹیوں کے متعلق باتیں کرتا رہا۔ اور پھر یہ دیکھ کر کہ اس کی بیوی اس گفتگو میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہی ہے، اس نے گفتگو کا یہ سلسلہ دفعتاً ختم کر دیا اور اپنی بیوی کی دلجوئی کرنے لگا۔

اب نعیم نے اِدھر اُدھر دوسرے مسافروں کی طرف دیکھا۔ ان میں ایک عورت تھی۔ نہایت اعلیٰ درجے کا سفید لباس پہنے۔ گلے میں سفید موتیوں کی ایک لڑی اور اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا اون جیسے بالوں والا سفید کتا تھا۔ میونک سے روزن ہائیم تک ہٹلر کی بنوائی ہوئی خوبصورت اور چوڑی سڑک پر نعیم اس خاتون کی طرف دیکھتا رہا۔ پہلے تو سمجھ میں نہیں آیا کہ کس طرح اس سے بات کرے۔ بات کرنے کی کوشش کی مگر وہ فرانسیسی جانتی تھی نہ انگریزی۔ نعیم کی شکستہ جرمن پر وہ مسکرائی اور شائستگی اور تکلف سے اس کی باتوں کا جواب دے کے پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتی۔ بس سے جو مناظر نظر آرہے تھے، وہ تھے بھی دلکش۔ میونک سے نکلنے کے بعد کچھ دور تک تو چوڑا میدان، پھر جنگل کے ٹکڑے، صنوبر، پہاڑ، بوریا کے اُونچے پہاڑوں کے درمیان ایک چھوٹی سی خوبصورت جھیل تھی جس میں پہاڑ کی چوٹیوں کا عکس بڑا دلفریب معلوم ہوتا تھا۔ قریب ہی میگرن زی کا گاؤں تھا جس کے مکانوں کا رنگ قرونِ وسطیٰ کے رنگسازی اور جس کے مکانوں کی وضع قرونِ وسطیٰ کے دیہی فنِ تعمیر کی یادگار تھے۔ قریب ہی جدید ترین نمونے کا ''کافی گھر'' کافی آم زی تھا جس کی ایک پوری دیوار گویا شیشے کی تھی۔ اس سے جھیل اور پہاڑوں کا منظر بڑا ہی خوشنما معلوم ہوتا تھا۔ میز پر تین لڑکیاں ہنس بول رہی تھیں اور ان کے سنہرے بال سر کی جنبشوں سے اِدھر اُدھر گر کے بنتے اور سنورتے۔ نعیم بار بار ان کی طرف بھی دیکھتا رہا۔۔۔ گھنٹے بھر بعد وہ کافی گھر سے باہر نکلا اور چہل قدمی کرنے چلا۔ شام کے وقت آفتاب کا اثر بڑا ہلکا سا تھا اور جھیل

میں آس پاس کے پہاڑوں کی تصویروں کی بہار دیکھنے کے لائق تھی۔ جھیل کے کنارے وہی سفید پوش عورت اپنے سفید کتے کے ساتھ اکیلی ٹہلتی ہوئی ملی اور مسکرا کے اس نے پھر اپنی راہ لی۔ اس منظر کا اثر جادو کا سا تھا۔ کچھ دیہاتی اس اجنبی ہندوستانی کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ شام کو وہی بس اسے میونک واپس لائی۔ وہ اسٹیشن کے قریب اترا۔ وہیں کھانا کھانے ایک بڑی سی میز پر جا بیٹھا۔

اس میز پر پہلے سے ایک اسی سال کی معمر عورت اور ایک ادھیڑ عمر کا سنجیدہ صورت جرمن بیٹھا تھا۔ نعیم کے آتے ہی، ان دونوں سے ٹوٹی پھوٹی جرمن میں گفتگو کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اسی سال کی بڑھیا کو ہندوستان کے متعلق سب کچھ معلوم تھا۔ انگریزوں اور ہندوستانیوں کے تعلقات۔ ہندو مسلم فساد۔ تحریکِ آزادی۔ گاندھی۔ ٹیگور۔ جواہر لال نہرو۔ نعیم حیرت سے اس کا منہ تک رہا تھا کہ بڑھیا نے ایک بے تکا سا سوال کیا۔ ''کیا یہودی کانگریس کو انگریزوں کے خلاف بھڑکانے کے لیے روپیہ دیتے ہیں؟''

اس پر سنجیدہ صورت ادھیڑ عمر کے جرمن نے جو غالباً یہودی تھا، کہا کہ ''یہ پروپیگنڈا محض جرمنی کے لیے ہے۔'' اس کے بعد وہ نعیم سے بہت دیر تک آہستہ آہستہ انگلستان اور فرانس میں یہودیوں کی حالت کے متعلق پوچھتا رہا۔ بار بار وہ اِدھر اُدھر دیکھ بھی لیتا کہ کوئی اور تو ان کی گفتگو نہیں سن رہا ہے۔ پھر وہ نعیم سے پوچھنے لگا کہ ہندوستان میں جرمنی کے باہر یہودیوں کے لیے کوئی موقع ہے؟ پھر اس بڑھیا میں اور ادھیڑ عمر کے جرمن یہودی میں کچھ بحث ہوئی اور نعیم نے بڑھیا کو زور سے یہ کہتے سنا۔ ''ہاں میں اشتمالی ہوں۔'' آس پاس کی میزوں سے دو چار جرمنوں نے اسے گھور کر دیکھا، پھر شاید اس بڑھیا کے الفاظ کو ناقابلِ التفات سمجھ کر کھانے اور بیئر کی طرف متوجہ ہو گئے۔ نعیم نے اپنے دل میں کہا۔ کاش مجھے بھی اتنا کہہ سکنے کی جرأت ہوتی۔

دوسرے دن صبح کو واپس ہوا۔ بارہ بجے اشتت گارت پہنچا۔ چار بجے اسے ڈوروتھیا پفائفر نے چائے پر بلایا تھا۔ اس کے یہاں پہنچا۔ اس کے کمرے میں ایک بستر تھا۔ آرٹ پر کچھ کتابیں، کچھ کرسیاں، ایک میز اور میز پر چائے کی تین پیالیاں۔ پہلے تو اس کا ارادہ تھا کہ فریڈا کی طرح یہاں ڈوروتھیا سے بھی کچھ چھیڑ چھاڑ کرے۔ معلوم ہوتا تھا، ایلس کے جانے کے بعد تفریح کے لیے بھی اس کی قسمت میں تیس سال سے کم کی کوئی عورت نہیں لکھی تھی۔ خیر یہی سہی لیکن ان تین پیالیوں کو دیکھ کے یہ امید بھی جاتی رہی۔ تیسری پیالی ڈوروتھیا کے مصور دوست کے لیے تھی۔ ایک دبلا پتلا، پستہ قد سا کم رُو نوجوان۔ عورتوں کو اپنی جسمانی ضد سے کیوں محبت ہو جاتی ہے۔ مصور کی تصویریں دیکھیں۔ ڈوروتھیا

اور جرمن مصور دونوں کو تعجب ہوا کہ انگریزی یونی ورسٹیوں میں نوجوان طالب علم جنرل فرانکو کے نہیں بلکہ ہسپانوی جمہوریت کی فتح کے خواہاں تھے۔ ڈوروتھیا نے نعیم سے اس کا سیاسی مسلک پوچھا۔ نعیم نے اپنے آپ کو ''اشتراکی'' کہتے ہوئے سنا۔ ڈوروتھیا نے کہا۔ ''راست اشتراکی یا چپ اشتراکی۔ قومی اشتراکیت تو ہم سب جرمنوں کا بھی مسلک ہے۔'' نعیم کو ہنسی آئی، اسے ہروشا یاد آ گیا۔ ہیگل کا راست اور ہیگل کا چپ اس نے پھر اپنے آپ کو ''اشتمالی'' کہتے ہوئے سنا۔ اس کے کانوں کو اپنے الفاظ پر یقین نہیں آیا۔ کیا دانستہ طور پر کراکسلے اور ہروشا اور گل سُرخ اور شرابیں پینے والے اور قے کرنے والے ہندوستانی اشتمالی نوجوانوں کا جادو اس پر چل چکا تھا۔ اس نے اپنے دل میں خیال کیا۔ اشتمالی آئی۔ سی۔ ایس۔ چاندی کے چوکھٹے میں کارل مارکس کی تصویر، کیا کہنے۔

اس وقت ڈوروتھیا جلدی جلدی اپنے کمرے کی کھڑکی بند کر رہی تھی۔ اب اگر اس کا اجنبی مہمان کہیں اشتمالیت کی خوبیوں کا ذکر شروع کرے تو کہیں کوئی سن لے۔ ''جرمنی میں کسی کا اعتبار نہیں۔ بھائی کا نہ بہن کا۔ اور یہاں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔'' ڈوروتھیا نے بھی اپنے آپ کو کہتے سنا۔

دوسرے دن ابر چھایا ہوا تھا، اور ہوا میں سردی تھی اور ریل اشتٹ گارٹ سے کولون جا رہی تھی۔ رہائن پر بارش کی وجہ سے دُھند چھائی ہوئی تھی۔ سفر کا جادو ٹوٹ چکا تھا لیکن اس سفر سے ایلس والا زخم بھی مندمل سا ہو گیا تھا۔ باہر بارش کو دیکھ کے نعیم کو فریڈا کے ہونٹوں پر بارش کے بے نمک قطرے یاد آئے۔ معلوم نہیں اب اس کا زکام کیسا ہے؟ حسین سی سالہ کولون سے بروسلز، بروسلز سے اوسٹنڈ۔ پھر رود بار انگلستان۔ تعلیمی میقات کو شروع ہوئے دیر ہو چکی ہے۔ کام کا وقت ہے۔ کام بھی تو ایک گریز ہے۔ سفر ختم ہو رہا ہے۔ ایک گریز کے بعد دوسرا گریز۔ گریز سے گریز۔

تیسرا حصہ

گیارھواں باب

نوروز

آکسفرڈ واپس آنے کے بعد تقریباً مہینہ بھر تک ایلس نعیم کے دماغ پر سوار رہی۔ رات رات بھر اس کی نیند غائب ہو جاتی۔ رات رات بھر وہ اس کے بالوں، اس کے تبسم، اس کے سُرخ و سفید جسم کی عریانی یاد کرتا رہتا۔ رات کے تین بجے اٹھ کے وہ ایلس کو انتہائی والہانہ خطوط لکھتا، جو اسے صبح کو ضرورت سے زیادہ شاعرانہ معلوم ہوتے مگر جو ہونا تھا اس کا ہو گذرنا ضروری تھا۔ ایلس سنتانی میں اپنی دوستیوں اور دلچسپیوں کا حال بہت کم لکھتی۔ لیکن بین السطور نعیم سب کچھ پڑھ لیتا۔ جہاں وہ لکھتی کہ ''میں تمہیں ہمیشہ سے زیادہ چاہتی ہوں۔'' یا ''بہت پیار اور بوسے۔'' اس سطر کے نیچے نعیم کسی سیاہ بالوں والے (کیونکہ ایلس کو سیاہ بال پسند تھے) دراز قد ظریف اور ذہین امریکی نوجوان کی تصویر دیکھ لیتا۔ ایلس کا ہر نیا خط پہلے کے مقابلے میں ذرا سرد ہوتا اور محبت کے وہی الفاظ پُرانے اور بوسیدہ معلوم ہوتے۔ یہ محبت کے زوال کی سب سے بڑی نشانی ہے کیونکہ جب محبت تازہ اور شگفتہ ہوتی ہے، جب وہ پھیلتی پھولتی ہے تو اپنے اظہار کے لیے ہمیشہ نئے الفاظ ڈھونڈتی ہے لیکن جب وہ سرد ہونے لگتی ہے تو وہی محبت کے الفاظ اس کا کفن بننے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ پہلے فریق مخاطب اور پھر فریق متکلم محسوس کرنے لگتا ہے کہ اب یہ جھوٹ ختم ہو جائے تو اچھا ہے۔

اب شک کرنے کی گنجائش ہی نہ رہی تھی کہ سنسناتی نے پیرس کا طلسم باطل کر دیا تھا۔ ایلس اوسط عورت ہی تو تھی۔ اوسط عورتوں کو اوسط مرد بہت جلد مل جاتے ہیں۔ بہت جلد وہ پھر اسی امریکی زندگی کا لطف محسوس کرنے لگی جس میں اس نے آنکھیں کھولی تھیں۔ بہت جلد وہ سیاہ بالوں والے دراز قد امریکی نوجوان کے ساتھ ناچنے لگی اور ہنسی، مذاق اور بوس و کنار کا سلسلہ شروع ہوا۔ مسٹر کلاڈل جو اس کی شام کی تفریحوں سے خوش تھے۔۔۔۔۔ کیونکہ ان تفریحوں کا راستہ کسی قابل قبول امریکی نوجوان سے شادی پر ختم ہوتا، ایلس کو دن کو بھی مصروف رکھنا چاہتے تھے کہ کہیں دن کو جاگتے ہوئے خوابوں میں اس کا دماغ پیرس اور نعیم کی طرف زیادہ نہ بھٹکنے پائے۔ انہوں نے اپنی فرم میں اسے کام پر لگا لیا اور تھوڑے دنوں کے بعد وہ خود بھی کام میں دلچسپی لینے لگی۔

فلسفۂ بین السطور سے نعیم پر یہ سب کچھ ظاہر ہوتا گیا۔

اس تاریک مہینے میں نعیم کا سہارا دو چیزیں تھیں۔ ایک کراکسلے کی دوستی۔ کراکسلے جو اس زمانے میں ہلیل میں ماڈرن گریڈز کی تیاری کر رہا تھا، نعیم کا بڑا رفیق تھا۔ وہ اکثر اس کے ساتھ ہفتے کے ختم پر ایک آدھ دن گذارنے لندن جاتا۔ اپنے بیٹے کے اصرار پر مسز کراکسلے نے بھی اس "رنگ والے دیسی" سے ہمیشہ بڑا اخلاق برتا اور اگرچہ وہ مارگرٹ کو ہمیشہ جتاتی رہتیں کہ اس خطرناک ہندوستانی کے پنجے میں نہ پھنسنا، پھر بھی اپنے بچوں کے خلوص کی وجہ سے وہ مجبوری ہو جاتیں۔ دو ایک مرتبہ ملنے کے بعد بہر حال ان کو اطمینان ہو گیا کہ یہ لڑکا ان دیسیوں سے بہت مختلف ہے جو، ان کے شوہر کی ججی کے زمانے میں ہندوستان میں ان کے نوکر تھے۔ رفتہ رفتہ نعیم سے اس کا سلوک "پکا میم صاب" کا سلوک نہ رہا بلکہ انہیں بھی اپنے بیٹے کے اس دوست سے ایک طرح کا اُنس پیدا ہو گیا۔ جب نعیم کراکسلے کے یہاں مہمان ہوتا تو مارگرٹ زیادہ تر وقت ان دونوں کے ساتھ گذرتی۔ اب جو ماں نے اسے ہر ہر قدم روکنا ٹوکنا چھوڑ دیا تھا تو اس نے بھی اپنے بھائی کے اس دوست کو اپنا بھائی سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ چونکہ نعیم کے کوئی بھائی بہن نہ تھے اس لیے یہ خواہرانہ اُنس اس کے لیے ایک نئی چیز تھی اور وہ بھی مارگرٹ کے لیے ایک طرح کا برادرانہ خلوص اور شفقت محسوس کرنے لگا۔ بہت جلد وہ مارگرٹ کا رازدار بن گیا۔ وہ اسے نوجوانوں کے قصے سناتی جنہوں نے شام کے دھندلکے میں اسے چوما تھا، یا جنہوں نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا تھا۔ وہ نعیم سے ان کے متعلق اس کی رائے پوچھتی، اور جب وہ اس قسم کی باتیں کرتی تو نعیم کی طرف اس قدر اعتماد

اور جوشِ اعتبار سے دیکھتی کہ نعیم اس نوخیز لڑکی کی نسوانی حسن اور اس کے شباب سے اپنے جذبات کو قطعاً بے تعلق کر دینا چاہتا کیونکہ اندرونی طور پر نعیم مارگرٹ کے شباب کا اثر محسوس کرتا۔ اب مارگرٹ لڑکی سے زیادہ عورت تھی۔ اس کے شانوں پر گوشت بھر رہا تھا۔ اس کے لب گداز ہوتے جا رہے تھے۔

جب کبھی کراکسلے اور مارگرٹ میں بڑے مزے کی لڑائی ہوتی تو نعیم کبھی بھائی کی طرف داری کرتا کبھی بہن کی۔ اور جب کراکسلے اپنی بہن کو زیادہ ستاتا تو نعیم کھلم کھلا اپنے دوست کی مخالفت کرتا۔

کراکسلے کے سوا اس زمانے میں نعیم کا ایک اور سہارا تھا۔ اس نے میون شن سے ایک خط میری پاول کو لکھا تھا جس میں جرمنی کے متعلق اپنے تاثرات کا ذکر کیا تھا۔ میری پاول کا جواب اسے انگلستان پہنچ کے ملا۔ اس خط کے ساتھ میری پاول کی لکھی ہوئی چھوٹی سی کتاب تھی "فرانس کے اشتراکی ادیب"۔ یہ جلد میری پاول نے اسے تحفتاً بھیجی تھی۔

اس کتاب کے متعلق اپنی تفصیلی رائے نعیم نے میری پاول کو لکھ بھیجی۔ اس کے بعد خطوط کتابت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جو دوستی نعیم ذاتی میل جول سے پیدا نہ کر سکا تھا، خط و کتابت سے بڑھنے لگی۔ یہ خط زیادہ تر غیر ذاتی اور غیر شخصی ہوتے لیکن اس سے ایک ذہنی قرب کا منظر پیدا ہونے لگا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ خود نعیم کا رجحان اشتمالیت کی طرف دن بدن بڑھ رہا تھا۔ اس زمانے میں انگریزی جامعات میں اشتمالیت ایک طرح کا فیشن بن گئی تھی۔ چاروں طرف ان لوگوں میں گھر کے سوائے اس کے نعیم کے لیے کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ بھی اشتمالیت پر کچھ پڑھے۔ اس نے جان اسٹریچی کی تمام کتابیں پڑھیں۔ لیفٹ بک کلب کا رکن ہو گیا۔ شروع سے آخر تک کارل مارکس کا "سرمایہ" پڑھا۔ کراکسلے کے ساتھ وہ پابندی سے انٹرنیشنل پریس کارسپانڈ اور لیبر پڑھا کرتا۔ اسی زمانے میں وہ پہلی بار پام وت، پرٹ اور جان اسٹریچی سے ملا۔ پھر رفتہ رفتہ انگلستان کے نوجوان ادیبوں سے اس کی دوستی ہونے لگی۔ ان تمام حلقوں میں میری پاول کا نام اچھا خاصا مشہور تھا۔

میری پاول نے ایک ہفتہ اسپین میں محاذ جنگ پر گذارا اور اپنے سارے تجربات ایک طویل خط میں نعیم کو لکھ بھیجے۔ یہ خط اکیس صفحوں کا تھا۔ راستے کی مشکلات، ہوائی جہازوں کی بمباری، بین الاقوامی بریگیڈ کی جانفشانی، ایک عزیز دوست کی ہلاکت کا سماں، اور فاشستوں پر لعنت۔ پھر ایک طرح کا نسوانی اطمینان کہ آخر میں حق کی فتح ہوگی۔ ان سب موضوعوں نے میری پاول کے اس خط کو ایک طرح کا ذاتی

رنگ دے دیا تھا۔ ان تمام واقعات کے بیان کرنے میں پاول اپنی شخصیت کو عیاں کر رہی تھی۔ اس خط کے ذریعے میری پاول نے نعیم کو اپنے باطنی "اعترافات" کے لیے اس طرح انتخاب کیا تھا۔۔۔۔ جس طرح مارگرٹ نے اسے ان کم سن نوجوانوں کے متعلق اعترافات کے لیے چنا تھا جو اسے بھلے معلوم ہوتے اور شام کے دھندلکے میں اسے چومتے۔

ان دونوں اثرات نے ایلس کے خطوط میں محبت کی گردان کے تصنع کو اور زیادہ نمایاں کرنا شروع کر دیا۔ روحانی اور ذہنی طور پر نعیم اپنے آپ کو مارگرٹ اور میری پاول سے قریب محسوس کرنے لگا تھا اور ایلس کی محبت پر اوقیانوس کی موجیں حاوی ہونے لگی تھیں۔

(۲)

نوروز کے بعد اسے ایلس کا جو خط ملا اس میں محبت کا اقرار بھی نہ تھا۔ بجائے اس کے کہ ایلس صاف لکھ کے نسبت توڑتی، اس نے اپنے اس خط میں اجنبیت کی شان پیدا کر کے ہر طرح کا تعلق ختم کر دیا تھا۔ وہ خط جس میں کوئی خاص بات نہ تھی، اس میں انکار کی وہ شان تھی جو شدید ترین لفظی انکار میں نہ ہوتی۔ خط یہ تھا:

"یکم جنوری ۱۹۳ء

پیارے نعیم!

نئے سال میں سب سے پہلا کام اس کے سوا کیا ہو سکتا تھا کہ میں تمہیں خط لکھتی۔ نوروز سے نئی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ نئی زندگی شروع ہوتی ہے۔

مجھے اب اپنے والد کے دفتری کام میں اچھی خاصی دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ صرف یہ کہ اس زمانے میں صبح سویرے اٹھنا مجھے پسند نہیں۔ شام کو پانچ چھ بجے واپس ہوتی ہوں۔ مگر دن بھر کے کام کی وجہ سے شام بڑی اچھی گذرتی ہے، اور جب باہر جاتی ہوں تو کھانے یا ناچنے میں مجھے وہ لطف آتا ہے جو مزدور پیشہ لڑکیوں کو آتا ہے۔ اگر میں دن بھر گھر میں بیٹھی فیشن کے رسالے یا فرانسیسی ناول پڑھتی رہوں تو شام کا کھانا اور ناچ بھی اچھا نہ لگے۔ رات کو عموماً ایک دو بجے سے پہلے سونے کا موقع نہیں ملتا اور صبح سویرے اٹھنے کو طبیعت نہیں چاہتی۔ دیکھو کتنی کاہل ہو گئی ہوں۔

لیکن اگر میرے والد نے یہ تصفیہ کیا کہ میری بیش قیمت خدمات فرم کے لیے اشد ضروری نہیں ہیں تو چار پانچ مہینے کے بعد، اپریل یا مئی میں میرا ارادہ اپنی والدہ اور ایک عزیز دوست کے ساتھ میکسیکو کی سیر کا ہے۔ میکسیکو آج کل امریکی سیاحوں میں بہت مقبول ہے۔ ہر ایک یہی کہتا ہے کہ بڑا ہی دلفریب مقام ہے۔ یورپ سے بھی زیادہ (میں تو اس رائے سے اتفاق نہیں کرتی۔ مگر آج کل یورپ کی سیاسی فضا ایسی مکدر ہے کہ ادھر کا رخ کرنے کو طبیعت نہیں چاہتی) اس لیے ممکن ہے کہ آئندہ بہار یا گرما میں ہم تینوں اپنی پون ٹیاک میں میکسیکو میں آوارہ گردی کرتے پھریں۔ میں تمہیں میکسیکو کے ہر خوبصورت مقام سے ایک پوسٹ کارڈ بھیجوں گی۔

میں نے یہ خط محض سال نو کی مبارکباد کے لیے لکھنا شروع کیا تھا۔ اس لیے شاید یہی مناسب ہے کہ میں خط کو ختم کر دوں۔ تمہارے خطوط میں بڑی دلچسپی سے پڑھتی رہوں گی۔ جب تمہیں فرصت ہو مجھے خط لکھا کرنا اور یہ بھی لکھنا کہ کیا کر رہے ہو اور ہندوستان واپسی کے بعد بھی خط و کتابت جاری رکھنا۔

فقط

تمہاری ایلس"

یہ خط پڑھ کے نعیم نے پہلا احساس جو اپنے ذہن پر حاوی پایا، حیرت کا تھا۔ یہ خط اس لڑکی کا تھا جس سے اس کی نسبت ہو چکی تھی اور جو محض اس لیے امریکہ گئی تھی کہ وہ اپنے والدین پر یہ ثابت کرے کہ چھ ماہ ہوں یا چھ سال ہو نعیم کے ساتھ اپنی محبت پر قائم رہے گی۔ یہ خط اس لڑکی کا تھا جو ڈیڑھ دو مہینے دن رات پیرس میں اس کے ساتھ رہی تھی۔ یہ وہ لڑکی تھی جس نے اپنا جسم سب سے پہلے اسی کے حوالے کیا تھا۔ اپنی دوشیزگی اسے دی تھی۔ وہ ستمبر میں گئی تھی، اب جنوری کا آغاز تھا۔ تین مہینوں میں وہ بالکل دوسری لڑکی بن گئی۔ جس طرح سانپ اپنی کینچلی بدلتا ہے۔ اب اس قدر آسانی سے اسی لڑکی نے اپنے عاشق اور اپنے منگیتر کے مقام سے گرا کر اسے اپنے معمولی سے دوست کی جگہ دے دی تھی۔ ایک ہی ہفتہ پہلے جو خط آیا تھا، اس میں عشق، عشق، عشق کے سوا کچھ نہ تھا لیکن نعیم اس وقت بھی جانتا تھا کہ اس کے خطوط میں اب، یہ لفظ بے معنی ہو گیا تھا۔ کیا اب اپنے اس جھوٹ سے ایلس خود بھی تنگ آ گئی تھی؟ یا اس کا دوسرا "عزیز دوست" جس کے ساتھ وہ میکسیکو کا سفر کرنے والی تھی، اب اس کا نیا منگیتر بن گیا تھا۔ اور نعیم کے دل میں یہ احمقانہ سوال پیدا ہوا: کس قسم کی انگوٹھی اس نئے امریکن دوست نے اسے دی ہوگی؟ ہیرے کی؟ یاقوت کی؟ نیلم کی؟

اس خط کا نعیم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے جتنا تجزیہ کیا، اسے محسوس ہوا کہ محبت کی جگہ محض محبت کی یاد باقی رہ گئی۔ حال کی جگہ ماضی۔ ایلس کے تصویر کی جگہ ایلس کی یاد جو پیرس میں کچی معلوم ہوتی تھی۔ ایلس کے پیلے بالوں اور سخت پستانوں اور شفاف جلد کی یاد۔ اس نے سچ لکھا تھا نوروز سے نئی تاریخ نئی زندگی شروع ہوتی ہے۔ ۱۹۳۶ ختم ہو چکا تھا۔ اب دیکھئے ۱۹۳۷ء کیا رنگ لاتا ہے۔

یہ سال بھی عجیب سال تھا۔ یہ ۱۹۳۶ء عیسوی۔ اس کی مختصر زندگی میں اہم ترین سال ۱۹۳۵ء میں وہ آئی۔ سی۔ ایس کے انتخاب میں لیا گیا تھا اور وہ یورپ آیا تھا لیکن اس دوسرے سال یعنی ۱۹۳۶ء میں یورپ اس کی زندگی پر حاوی ہوا۔ بلقیس نقشِ غلط کی طرح اس کے دل سے محو ہونے لگی۔ ایلس سے دوستی ہوئی۔ محبت ہوئی۔ جدائی ہوئی اور بالآخر وہ قصہ ختم بھی ہو گیا۔ اسے ہروشا اور کرا کسلے جیسے دوست ملے۔ کیا عجیب بات تھی کہ محبت اور دوستی دونوں کے لیے وہ ہندوستان میں ترسا کیا۔ وہاں اسے محبت ملی تو یک طرفہ اور دوستی سرے سے نہیں۔ اس قسم کی دوستی نہیں جیسی ہروشا اور کرا کسلے سے ہوئی۔ ایک طرح کی گہری ذہنی اور قلبی رفاقت۔ ایسی دوستی جو وقت اور مقام کی قید سے آزاد ہوتی ہے۔ کیونکہ ہروشا جو اب چیکوسلواکیہ کے دفتر وزارت خارجہ میں اچھے سے عہدے پر مامور ہو گیا تھا، اسے اس پابندی سے اور اس اخلاص سے خطوط لکھتا تھا کہ یہ ایلس کے لیے باعثِ رشک ہوتا۔ کرا کسلے کی وجہ سے اس سال کے آخری مہینوں میں اسے اجنبیت کے اس احساس سے نجات ملی جو ہندوستانی طالب علم انگلستان میں ہمیشہ محسوس کرتا ہے اور جس کی وجہ سے جب رود بار پار کر کے برِ اعظم یورپ سے انگلستان جانے لگتا ہے تو اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ گویا وہ کسی قید خانے کو واپس جا رہا تھا۔ کرا کسلے کی وجہ سے اب اسے پروا نہ تھی کہ انگلستان کی زیادہ عمر کی عورتیں اسے ناپاک رنگ والا، دیسی، مقبوضات کا باشندہ اور معلوم نہیں کیا کچھ سمجھ کے گھورتیں یا شاید محض اجنبی سمجھ کے کیونکہ انگلستان میں اجنبی ہونا بھی گناہ تھا۔

ایلس اس کے لیے اس سال کا زیادہ ناقابلِ فراموش واقعہ تھی۔ ایلس کے ساتھ اس کا معاشقہ گویا کلاسیکی طرز کا ایک ڈرامہ تھا۔ وحدتِ مکان، وحدتِ زمان، وحدتِ عمل، سب کچھ اس ڈرامے میں تھا۔ اس کی روئداد بھی مکمل تھی۔ ایک ہی سال کے اندر آغاز، ارتقا، اور انجام۔ روئداد کی تعریف ہی یہ ہے کہ اس میں آغاز، درمیان انجام سب ہوں۔ وہ اس سال اس کی زندگی میں آئی۔ ممکن ہے کہ وہ ہمیشہ اس کی زندگی میں رہتی۔ مگر ایسا ہوتا تو ڈرامہ۔۔۔ یا یوں کہئے کہ یہ کامیڈی، یہ طربیہ، قدرت کا یہ مذاق پورا نہ

ہو پاتا۔ وہ جہاں سے آئی تھی، چلی گئی۔ پھر نعیم نے اس کے اثر سے گریز کرنا چاہا۔ اسے بھولنے کے لیے اپنے ہم وطنوں کی مجلس ڈھونڈھی۔ اور محض یہ محسوس کیا کہ اب بھی اس میں اور ہم وطنوں میں انتہائی بُعد ہے جتنا ہندوستان میں تھا۔ قدرت نے اسے ہندوستانی نہیں، انسان بنایا تھا۔ انسان مسافر، انسانِ گرداں جو اپنے وطن سے باہر ہی خوش رہ سکتا ہے۔ اس نے سفر کیا اور جرمنی نے اس کی اشتمالیت کی تکمیل کردی۔۔۔ لیکن ڈرائینگ روم والی آرام کرسی والی اشتمالیت۔ جرمن اسے اچھے معلوم ہوئے۔ خلیق اور مہمان نواز لیکن نا تسیت نے اسے اس قدر جلد اشتمالی بنا دیا کہ کرا کسلے اور میری پاول اور ہروشا بھی اس قدر جلد اس میں یہ انقلاب نہ پیدا کر سکے تھے۔ پہلے زمانے میں لوگ جسمانی محبت سے گریز کر کے صوفی بنتے تھے اور اب اشتمالی۔

۱۹۳۶ء کا صرف ایک واقعہ نامکمل تھا۔ صرف ایک واقعہ تھا جس نے ابھی تک کوئی خاص شکل نہ اختیار کی تھی۔ لیکن جس میں اثر انگیزی کی انتہائی صلاحیت تھی۔ یہ واقعہ میری پاول سے واقفیت تھی۔ اگر اس سال کے ختم تک نعیم میں اور میری پاول میں خط و کتابت نہ شروع ہو جاتی تو شاید وہ بھی بلقیس اور ایلس کی طرح ماضی کا سایہ اور ان سب سے زیادہ ہلکا سایہ بن کر رہ جاتی لیکن اس کی اور نعیم کی واقفیت اب اس درجے پر تھی جیسے کوئی ناول دوسرے باب کے بعد، جیسے کوئی ڈرامہ پہلے منظر کے بعد۔

اور بلقیس؟ کیا واقعتاً وہ لوحِ دل سے محو ہو چکی ہے؟ یا محض یہ کہ وہ پس منظر میں ہے۔ پس منظر میں اور دل کی دنیائے نامحسوس میں۔ اس دنیا میں جہاں سے امید و بیم کی مورتیں ابھر کے خوابوں میں راج کرتی ہیں؟ اس سوال کا قطعی جواب نعیم دے نہ سکتا تھا۔ جرعۂ مختتم اور تکمیل اور انجام کا جو تجربہ نعیم کو ایلس کی محبت میں حاصل ہوا تھا، بلقیس کی محبت میں اس کا سوال ہی پیدا نہ ہو سکا تھا۔

(۳)

چوتھی جنوری کو نعیم لندن میں ہی تھا جہاں وہ کرسمس اور نوروز کی چھٹیاں منانے آیا تھا۔ میری پاول نے اسے بیٹیں کے پتے سے کرسمس اور نوروز کے کارڈ بھیجے تھے۔

چوتھی جنوری کو وہ برونز وک اسکوائر میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ آتشدان میں گیس جل رہی تھی۔ قالین کا رنگ سبز تھا۔ خادمہ نے ابھی تک بستر بھی ٹھیک نہیں کیا تھا۔ گیس کی روشنی میں نعیم کا موٹا ڈریسنگ

گاؤن جس کا رنگ نیلا سا تھا، چمک رہا تھا۔ باہر سخت کہر چھائی ہوئی تھی۔ نعیم کے ہاتھ میں "تاریخ انحطاط وزوالِ سلطنتِ روما" کا امریکی اڈیشن تھا، اور اس کی آنکھیں آتشدان کی طرف گھور گھور کے تھک چکی تھیں اور تھکن کے ساتھ نینداس کے دماغ پر چھا رہی تھی۔ چوتھی جنوری کی اس صبح کو جو لندن کے سرما کی طرح ست اور سرد، خالی از واقعہ اور غیر اہم تھی، نعیم نے اپنے کمرے کے دروازے کے کھٹکھٹانے کی آواز سنی۔

وہ یہ سمجھا کہ یہ خادمہ ہوگی اور بستر اور کمرہ صاف کرنے آئی ہوگی۔ اس نے بے خیالی میں "آؤ" کہا۔ دروازہ کھلا، اس نے دروازے کی طرف دیکھا اور حیرت سے چونک کے اٹھ کھڑا ہوا۔

یہ میری پاول تھی۔

"تم!" حیرت سے اس کی زبان سے نکلا۔

"ہلو۔" گل سرخ نے جواب دیا۔ "میں کل ہی پیرس سے آئی۔ آج ادھر سے گذر رہی تھی۔ تمہارے مکان کے نمبر پر نظر پڑی اور میں محض ہلو کہنے کے لیے چلی آئی۔ کیوں کوئی ہرج تو نہیں؟"

"مجھے بہت خوشی ہوئی۔" نعیم نے کہا اور میری نے جو ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھایا تھا اسے اپنے ہاتھ میں لے کے نعیم نے کہا۔ "بیٹھو گی نہیں؟" میری اپنا کوٹ اتارنے لگی۔ موٹا سفید خوبصورت کوٹ۔ نعیم نے اس کی مدد کی۔ اس کے لیے دوسری کرسی آتشدان کے قریب کھینچی۔

"مجھے تعجب بھی ہوا اور خوشی بھی لیکن نہ تم نے مجھے لکھا اور نہ کرا کسلے نے کچھ ذکر کیا کہ تم لندن آنے والی ہو۔"

"ہاں، میں ذرا دفعتاً ہی چلی آئی۔"

"گھر جانے کا ارادہ ہے؟"

"نہیں میں لندن میں ہی رہوں گی۔ تین چار دن۔ آج کل والد یہیں ہیں۔ لندن یونیورسٹی میں۔ انہیں کچھ لیکچر وغیرہ دینے ہیں۔ اور والدہ سے تو میں کچھ ہی دن ہوئے پیرس میں مل چکی ہوں۔"

نعیم نے پوچھا۔ "کچھ پیو گی؟ کافی وغیرہ۔"

وہ کافی پینے پر تیار ہوگئی۔ گیس کے چولہے پر خود اس نے کافی کا پانی گرم کرنے کو رکھا۔ آتشدان کے قریب سے سیال کافی اور دودھ وغیرہ اٹھا کے برتن ٹھیک کرنے لگی۔ سب اس بے تکلفی سے، جو صرف اشتمالی لڑکیوں ہی کا حصہ ہے اور نعیم اس خیال سے مسکرایا کہ چند مہینے قبل کتنی مسلسل درخواستوں کے بعد

کہیں اس کی نوبت آتی تھی کہ میری اس کے ساتھ چائے پینے یا کھانا کھانے کہیں جائے۔

کافی بناتے ہوئے میری نے پوچھا۔ "اپنے متعلق سب کچھ مجھے بتاؤ۔ آج کل کیسے ہو؟ کیا کر رہے ہو؟"

"کوئی خاص بات نہیں۔" نعیم نے جواب دیا۔ "یہاں صرف کرا کسلے سے ملاقات ہوتی ہے۔ کبھی کبھی سینٹ جوزف انٹرنیشنل کلب چلا جاتا ہوں اب چھٹیاں بھی ختم ہونے کے قریب ہیں۔"

کافی پیتے میں نعیم نے میری کی طرف دیکھا۔ گل سرخ پر اس وقت غضب کا جوبن تھا۔ اس کے سنہرے بال ایک شانِ بے ترتیبی سے اس کے سر پر پھیلے ہوئے تھے، جو اس کے سر کی ہر جنبش کے ساتھ دلآویز طریقے پر ہلتے، سمٹتے، لہراتے اور پھر ٹھہر کے آتشدان کی روشنی میں چمکنے لگتے۔ اس کے گالوں کو سردی نے وہ قدرتی سرخی عطا کی تھی جو کسی عطار کی بنائی ہوئی سرخی سے کبھی نہیں پیدا ہو سکتی۔ اس کے نرم اور گلابی ہونٹ شگفتہ، سادہ اور مطمئن تھے۔ انہیں کسی مصنوعی لالی کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سفید سویٹر پہنے ہوئی تھی۔ جب وہ سانس لیتی اس کا سینہ آہستہ سے ابھرتا۔ جب وہ سانس چھوڑتی تو سانس سردی سے دھواں بن جاتی۔

نعیم نے یکلخت اس سے کہا۔ "میرے نام ایلس کا خط آیا ہے۔" اور اس کے ہونٹ خشک ہو گئے۔

میری کافی پیتے پیتے ٹھہر گئی۔ اس کی نیلی آنکھیں جن میں بحر اٹلانٹک کے پانی کا سارا حسن تھا، نعیم کے چہرے پر گہری ہمدردی کے انداز میں جم گئیں۔ گویا وہ اس کا انتظار کر رہی تھیں کہ نعیم اور کچھ کہے۔ لیکن اس وقت نعیم اس طرح اپنے جذبے کو پوری قوت سے کچل رہا تھا کہ اس کی قوتِ گویائی گویا سلب ہو گئی تھی۔ وہ میری کی نظر کی اس ہمدردی کی تاب نہ لا سکتا تھا۔ یہ نہیں کہ اس ہمدردی میں حقارت کا عنصر شریک تھا جس سے اسے تکلیف ہوتی پھر بھی، پھر بھی اس کی خودداری اندرونی گہرائیوں سے احتجاج کر رہی تھی کہ اسے کسی کی ہمدردی کی ضرورت نہیں۔

آخر اس خاموشی کو میری نے توڑا۔ "میرے نام بھی ایلس کا خط آیا ہے۔ میرے خیال میں جو کچھ ہوا تم دونوں کے لیے اچھا ہے۔" میری کی آواز میں ہمدردی کے ساتھ اخلاص بھی تھا۔ نعیم نے پھر ان گہری نیلی آنکھوں کی طرف دیکھا۔ اخلاص میں کوئی شک نہ تھا۔ میری کہہ رہی تھی۔ "مجھے ہمیشہ سے یہ اندیشہ تھا کہ تم دونوں ایک دوسرے کے لیے بنے ہی نہیں ہو۔ بہت اچھا ہوا کہ وقت سے پہلے تم دونوں پر ظاہر

ہو گیا مگر۔۔۔کیا تمہیں اس کا بہت رنج ہے؟''

''نہیں۔'' نعیم نے کہا۔ ''میں ایک خلا سا ضرور محسوس کرتا ہوں۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہ جیسے میرے سر سے ایک بوجھ اتر گیا۔''

''بہت جلد خلا کا احساس بھی جاتا رہے گا۔ تم ابھی بہت کم عمر ہو۔ اور زندگی میں ہر قدم پر دلچسپ موڑ ہیں۔ میری رائے میں نعیم تم اپنی زندگی کا مقصدِ اعلیٰ ڈھونڈ لو۔ پھر خلا کو پُر کرنے کے لیے تم کسی اور انسان کے محتاج نہ رہو گے۔''

''جیسے ہروشا۔'' نعیم نے کہا۔

''جیسے ہروشا۔'' میری نے دہرایا۔ ''اسے عورتوں کی ضرورت اس لیے نہیں رہی کہ اس کی زندگی وقف ہو چکی ہے۔ اس کی زندگی میں کوئی نہ کوئی عورت ضرور آئے گی مگر وہ اسے محبت یا نفرت سے نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔''

کافی ختم کر کے میری اٹھی کھڑی ہوئی۔ نعیم نے اسے کوٹ پہنایا۔ میری نے کہا وہ کراکسلے کے ساتھ تھیٹر جا رہی ہے، اگر نعیم کو فرصت ہو تو وہ بھی آئے۔ وہ جاتے جاتے ٹکٹ لے لے گی۔ نعیم نے آنے کا وعدہ کیا۔ میری نے اس کے سر کے بالوں میں آہستہ سے انگلیاں پھیر کے کہا۔ ''ہمیشہ ہمت سے کام لو اور ایلس کا خیال چھوڑ دو۔''

اس وقت کوئی طاقت بار بار نعیم کے کان میں سرگوشی کر رہی تھی کہ اگر اس وقت تم میری کو لپٹا کے اس کا بوسہ لو گے تو وہ کوئی مزاحمت نہ کرے گی۔ لیکن دوسرے کان میں یہ خوف سرگوشی کر رہا تھا کہ مجھے اس وقت دوستی کی ضرورت ہے، سچی، بے جنس، نسوانی دوستی کی۔

دروازے کے قریب پہنچ کے میری کے چہرے پر بھی نعیم نے وہی کش مکش کے آثار دیکھے۔ بہت زمانے کے بعد میری نے نعیم سے ذکر کیا کہ اس دن وہ بھی یہی سوچ رہی تھی کہ چلتے وقت اس کا بوسہ لے یا نہ لے اور چونکہ وہ اس وقت کچھ طے نہ کر سکی، خالص دوستی اور نسوانی رجحان کے درمیان۔ اس لیے اور کئی ماہ تک نعیم کو اس بوسے کا انتظار کرنا پڑا۔

تھیٹر میں نعیم نے محسوس کیا کہ کراکسلے اور میری میں جو دوستی ہے اس کی نوعیت بہت گہری ہے۔ کراکسلے سے نعیم کو توقع تھی کہ اگر اسے میری سے محبت ہوتی تو وہ نعیم سے اس کا ذکر ضرور کرتا۔ مگر کراکسلے نے کبھی اس انداز سے میری کا ذکر نہ کیا تھا۔ اس کی رازداری پر اسے غصہ سا معلوم ہوا۔ پھر اس نے درمیانی وقفے میں یہ غور کیا کہ میری کی آنکھیں جب کراکسلے سے ملتیں تو ان میں ایک نشیلا پن سا آ جاتا۔ وہ نشیلا پن جو جسمانی مقناطیسیت کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ محسوس کرنے لگا تھیٹر میں ان دونوں کے ساتھ اس کی موجودگی غیر ضروری ہے۔ محض ان دونوں کی مہربانی، ہمدردی ہے کہ وہ اس وقت جب اس کا دل آزردہ ہے، اسے اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں۔

آخری حصے میں وہ بجائے اسٹیج کی طرف دیکھتے رہنے کے یہی سوچتا رہا کہ کراکسلے نے مجھ سے چھپایا۔

اور یہ سب ہوا کیسے؟

دفعتاً ان تمام سوالات کے دھندلکے میں نعیم کے دماغ میں روشنی کی پہلی کرن پہنچی۔ جو کچھ ہوا کل ہی ہوا۔ کل ہی میری پیرس سے آئی۔ کل شام کو۔ اور سیدھی اپنے والد کے فلیٹ کو گئی ہو گی۔ کراکسلے عموماً پروفیسر پاول کے پاس چلا جایا کرتا تھا۔ کل کی رات دونوں نے کہیں ساتھ گذاری۔ دفعتاً دونوں ایک دوسرے کے قریب آ گئے ہوں گے۔ دونوں خوبصورت تھے، دونوں میں غالباً ایک دوسرے کے لیے کشش تھی۔ نعیم مسکرایا۔ اپنے دل میں اس نے یہ شعر پڑھا ؎

یارانِ تیز گام نے محمل کو جالیا

ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

اور پھر اس کی دلچسپی غیر ذاتی ہو گئی۔ غیر ذاتی اور غیر شخصی۔ وہ اپنے آپ کو ان دونوں کے درمیان ''مخل'' سمجھنے لگا۔ لیکن تھیٹر کے بعد کراکسلے اور میری کے انتہائی اصرار پر وہ ان کے ساتھ پروفیسر پاول کے فلیٹ تک گیا۔ وہاں میری کو چھوڑ کے دونوں واپس ہوئے۔ رخصت ہوتے وقت کراکسلے نے میری کا بوسہ لیا۔

کراکسلے کی اس انگریزی رازداری پر پھر نعیم کو غصہ سا آنے لگا۔ بالآخر نعیم سے نہ رہا گیا اور اس نے

کہا۔"میرے خیال میں میری کو تم سے محبت ہے۔"

"بے وقوفی کی باتیں نہ کرو۔" کرا کسلے نے غیر متوقع طور پر ذرا ترش روئی سے جواب دیا۔"اسے اپنے اور اپنے کام کے سوا کسی سے محبت نہیں۔"

نعیم خاموش ہوگیا۔ دونوں کچھ دیر تک اسی طرح خاموش چلتے رہے۔ دفعتاً کرا کسلے نے نعیم کا بازو زور سے پکڑ کر کہا۔"مجھے البتہ اس سے محبت ہے۔ بے حد۔ بہت زیادہ۔ لیکن وہ مجھ سے شادی نہیں کرے گی۔ کل رات اس نے صاف صاف کہہ دیا۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس کے بغیر کیسے زندہ رہوں گا۔ عزیز لڑکے تمہاری طرح مجھ پر بھی یہی مصیبت ٹوٹی ہے۔ کاش میں اس سے واقف ہی نہ ہوا ہوتا یا کم سے کم کل وہ نہ آئی ہوتی مگر وہ اپنے کام کے لیے بنی ہے۔ کام کے لیے۔ میرے لیے نہیں، جمہوریت اسپین کے لیے۔"

نعیم نے جواب میں کہا۔"میں نے اس کی آنکھوں میں یہ دیکھ لیا کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے۔"

"بے وقوفی کی باتیں نہ کرو۔" کرا کسلے نے پھر جھنجلا کے کہا۔"محبت وہ کر ہی نہیں سکتی۔ کسی مرد سے نہیں۔ تمام انسانوں سے اسے اتنی محبت ہے کہ وہ کسی ایک مرد کی نہیں ہو سکتی۔"

(۵)

دوسرے دن میری پاول نے بھی نعیم سے کہا کہ وہ جنسی تشنگی کی قائل نہیں۔ لیکن اب تک کسی مرد سے اسے محبت نہیں ہوئی اور نہ اس میں اس کی صلاحیت ہے، اور بہر حال پرسوں تو اسے پھر محاذ ہسپانیہ کا ایک چکر لگانا ہے۔ یہ وقت بھلا عشق اور عاشقی کا ہے؟

✓

بارھواں باب

رقابت

جب نعیم اور کرا کسلے نوروز کی چھٹیوں کے بعد لندن سے واپس ہوئے تو میری پاول کے متعلق ایک دوسرے سے بہت کم باتیں کرتے۔ کرا کسلے کو جلد ہی معلوم ہوگیا کہ جس ڈاک سے میری کا کوئی خط اس کے نام آتا، اسی ڈاک سے ایک خط نعیم کے نام بھی آتا۔ اگر اسے نعیم کے مقابل کچھ کامیابی ہوئی تھی تو یہ محض اتفاق تھا۔ لیکن اسے اب یہ شک ہونے لگا اور شک تقویت پکڑتا گیا کہ ایک بڑی گہری مفاہمت، ایک بڑی ہی گہری دوستی اس خط و کتابت کے ذریعے نعیم اور میری میں نشوونما پا رہی تھی۔ نعیم خطوط میں اپنے جذبات کا اظہار اس خوبی سے کرتا تھا جتنا وہ رُو برو نہ کر سکتا۔

نعیم اپنی کل کمزوریوں کی وجہ ہی سے کرا کسلے کو عزیز تھا۔ کرا کسلے اکثر کہا کرتا تھا کہ محبت کی طرح دوستی میں بھی ایک کا حصہ عملی ہوتا ہے اور دوسرے کا جامد۔ جس شخص کا حصہ عملی دوستی ہوتا ہے، اس کا فرض ہوتا ہے کہ اپنے مجہول دوست کی ہر طرح دستگیری کرے۔ میری سے نعیم کی دوستی بھی ایک طرح سے نعیم کی کمزوری ہی تھی۔ گلِ سُرخ کو حاصل کرنے کی تمنا بجائے خود ایک کمزوری تھی۔ کرا کسلے اس کی صرف اتنی مدد کر سکتا تھا کہ میری پاول کا ذکر اس کے سامنے نہ کرے۔ میری پاول کے اور اپنے تعلقات کا ذکر نہ کرے کیونکہ اس سے نعیم کو تکلیف ہوگی اور میری تو اپنا کھیل کھیل رہی ہے۔

ایک قانون بے تحریر کی طرح رفتہ رفتہ میری کا نام ان دوستوں کی باہمی گفتگو میں ممنوع ہو گیا۔

(۲)

میری اور نعیم کی خط و کتابت میں ذاتی عنصر بڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ نعیم نے اپنے خطوط میں محبت کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ پہلے پہل تو میری اسے ٹالتی رہی، مذاق کرتی رہی، چھیڑتی رہی۔ اس کا جواب عموماً یہ ہوتا۔ ''اور کتنی لڑکیوں سے تم اسی طرح روزانہ اپنے خطوط میں محبت جتاتے ہو؟''۔۔۔ ''تم نے کسی اور کا خط تو میرے نام کے لفافے میں غلطی سے نہیں رکھ دیا؟'''' یہ بجائے کامریڈ رہنے کے رومیو بننے کا شوق تمہیں کیوں ہو گیا ہے؟''

پھر اس کا لہجہ سنجیدہ ہونے لگا۔ وہ اپنے خطوط میں نعیم کو سمجھانے لگی کہ ''اس قسم کی گہری دلی محبت جیسے مشرقی لوگ کرتے ہیں، ناقابل عمل اور مضرت رساں ہے۔'' ''یہ کہ ''اور ہزاروں لڑکیاں ایسی ہیں جو نعیم کی محبت کی قدر کر سکیں گی''۔ مگر اس زمانے میں جہاں وہ یہ سب کچھ لکھتی وہاں نعیم کی فرمائش پر اپنی تصویریں بھی بھیجتی۔ روز نعیم کے نام خط لکھتی۔ پیرس میں ہوتی تو پیرس سے، سفر میں ہوتی تو سفر کے عالم میں۔

ایک خط میں اس نے فلسفہ محبت پر بحث کی تھی۔ اس کا سب سے دلچسپ حصہ یہ ہے:

''محبت کے متعلق جن قلبی خیالات کا تم نے اظہار کیا ہے وہ میرے خیالات سے زیادہ مختلف نہیں۔ اگر اب سے تین چار سال پہلے تم پوچھتے تو میں بالکل دوسری رائے کا اظہار کرتی۔ جب میں نے اپنے ذہنی خیالات میں انقلاب محسوس کیا تو ایک جذباتی انقلاب بھی ساتھ ہی ساتھ ہوا۔

اب مجھے حیرت ہے کہ شروع ہی سے مجھے یہ کیوں نہ معلوم ہو گیا کہ مسرت اور اطمینان کو ہر شخص کے باطن سے ظہور میں آنا چاہیے۔ مسرت اور اطمینان کسی دوسرے شخص۔۔۔ محبوب۔۔۔ سے حاصل نہیں ہو سکتے۔ میرے لیے اس ''باطنی مسرت'' کے حصول کا ذریعہ میرا کام ہے۔''

''تمہاری دوسری رائے۔۔۔ یورپی محبت کے تصور۔۔۔ سے مجھے بنیادی اختلاف ہے۔ یورپی محبت کا تصور تمہارے نزدیک خود بینی، خود غرضی اور حیاتی کشش پر مشتمل ہے۔ میں یہ ضرور مانتی ہوں کہ حیاتی کشش یا تم اگر چاہو تو اسے حیوانی کشش کہہ لو، ضرور اس میں شامل ہے۔ لیکن محبت اگر حیاتی اور حیوانی نہیں تو اور ہے کیا؟ کیا مرد اور عورتیں حیاتی ہستیاں، حیوان نہیں؟ ممکن ہے کہ سچی محبت روحانی بھی

ہو سکتی ہو۔۔۔ اس کا مجھے تجربہ نہیں، لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ سچی محبت حیاتی اور حیوانی اور جنسی سیری کے بغیر ممکن ہے۔ یورپی محبت کو تم خود غرضی کی محبت بھی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ عورت ہو یا مرد، جو فریق ہو، جتنا اسے دوسرے سے ملتا ہے اتنا وہ خود بھی دیتا ہے۔ اس کے ساتھ اگر روحانی کشش۔۔۔ ذہنی کشش جذباتی مفاہمت، ہمدردی ہو۔۔۔ تو محبت مکمل ہو سکتی ہے''۔

''تم نے اپنے متعلق جو لکھا ہے کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔ اس کا بہت بہت شکریہ۔ مجھے یقین ہے کہ تم یہ تو اچھی طرح جانتے ہو کہ مجھے یقین نہیں آتا۔ یہ مشرق کا تخیل ہے۔''

''تمہاری دوستی البتہ میرے لیے ایک بڑا ہی غیر معمولی تجربہ ہے۔ میں کبھی کبھی چاہتی ہوں کہ کاش تم میرے پاس ہوتے اور میں تم سے باتیں کر سکتی۔ میں اپنے آپ کو تم سے دور محسوس نہیں کرتی۔ شاید تمہارا مشرقی پن ہے کہ تم سے دوستی ہی میں اس طرح کا انوکھا پن محسوس کرتی ہوں اور ساتھ ہی ساتھ ایک طرح کی قربت جو محض انسانی قربت ہے۔''

رفتہ رفتہ خطوط میں شخصی اور ذاتی عنصر بڑھتا گیا۔ دونوں ایک دوسرے کے متعلق زیادہ لکھنے لگے۔ زبان اور جسمانی قربت شاید میری پاول اور نعیم کو ذہنی طور پر اور پھر جذباتی طور پر اتنا قریب نہ کر سکتے جتنا قریب انہیں خطوط نے کر دیا۔ خطوط میں صرف کشش کا سامان تھا اور جسمانی قرب میں محبت سے پہلے طرفین کو ایک دوسرے کی ناگوار نفسی اور جسمانی باریکیوں کو گوارا کر کے ان کا عادی ہونا ہوتا ہے۔

نعیم کے خطوط اور زیادہ والہانہ ہوتے گئے اور ان میں مشرقی انداز سے اظہار محبت بڑھتا گیا۔ اکثر وہ رات کے تین بجے اٹھ کر خط لکھنا شروع کرتا اور رات کے گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے تک خط لکھتا رہتا۔ خطوط میں اتنا خلاص پیدا ہو گیا کہ میری کو بھی یقین آ گیا کہ یہ ہندوستانی لڑکا بری طرح اس سے محبت میں مبتلا ہے۔

میری کا ایک خط یہ تھا:

''پیارے نعیم،

تمہارے خطوط میں بڑے شوق اور دلچسپی سے پڑھتی ہوں۔ جب میں کام کرتے کرتے تھک جاتی ہوں تو سوچتی ہوں کہ کاش تمہارا کوئی خط میرے پاس ہوتا اور میں بیٹھ کے اسے پڑھتی اور پھر تازہ دم ہو کے کام شروع کرتی۔ مگر تمہارے آخری خط نے مجھے عجب شش و پنج میں مبتلا کر دیا ہے۔ میں تم سے اس کی معافی چاہتی ہوں کہ میں نے معاملات کو اس حد تک بڑھ جانے دیا۔ میں شروع ہی سے اپنے خطوط میں

تمہیں زیادہ موقع نہ دیتی تو تمہارا تخیل تمہیں اس طرح اسیر نہ کرسکتا۔ معاف کرنا، میں تمہارے خطوط میں اظہار محبت کو زیادہ تر رسمی اور تفریحی سمجھتی تھی۔

لیکن مجھے بتاؤ۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اس تمام عرصے میں تم مجھ سے محبت کرتے رہے اور مجھے اس کا یقین نہ آیا؟ اب میں آئندہ سے ادراک نسوانی پر کبھی یقین نہ کروں گی۔

"نعیم کاش اس وقت ہم ایک دوسرے سے مل سکتے۔ اگر ہم بیٹھ کے باتیں کرتے اور صورت حال پر غور کرتے تو خط وکتابت کے مقابل یہ اچھا ہوتا۔ ممکن تھا میں تمہارے لیے کچھ کرسکتی۔ تمہیں کچھ دے سکتی جس سے تمہاری تھوڑی بہت تسلی ہو جاتی۔

میری اور تمہاری دوستی میرے لیے بہت اہم ہے۔ میں ڈرتی ہوں کہ تمہارے اس محبت کے جذبے کا اثر کہیں ہماری دوستی پر نہ پڑے۔ تمہیں تکلیف دیتے ہوئے مجھے افسوس معلوم ہوتا ہے لیکن میں تم سے یہی کہتی ہوں کہ سب سے بڑا تحفہ جو میں تمہیں دے سکتی ہوں، وہ دوستی ہے۔ تم اپنے خط میں محبت کا اقرار کر چکے ہو اور میں وہی دوستی، دوستی کی رٹ لگائے ہوں۔ اس سے مجھے شرم آتی ہے۔

ایک لحاظ سے مجھے اس کی خوشی بھی ہے کہ میں شروع ہی سے تمہاری محبت سے آگاہ نہ ہوسکی۔ تم نے اب کہیں جاکے مجھ سے اقبال کیا ہے کہ ایلس سے تمہیں اس لیے محبت ہوئی کہ اس زمانے میں میں تمہیں نہ مل سکی۔ مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ ایلس سے تمہاری محبت کی وجہ سے، جو بقول تمہارے میری کشش کے درمیان ایک وقفہ تھا۔۔۔ مجھے تم سے دوستانہ اُنس ہوا اور میں کہہ چکی ہوں کہ یہ خالص انسانی دوستی جو میں تمہارے لیے محسوس کرتی ہوں میری تصوریت کا جذباتی نصف ثانی ہے۔ اگر میں تمہیں جنسی طور پر مل جاتی تو میں دوستی کے اس احساس سے محروم رہتی۔ اس زمانے میں میری معروفیت نے مجھے بچالیا۔

جب طرفین میں سے کوئی ایک محبت میں مبتلا ہو جاتا ہے تو دوستی کی شان میں فرق آجاتا ہے۔ میں تم سے اس کا وعدہ چاہتی ہوں کہ تم میرے اور اپنے تعلقات کا مسئلہ میرے سپرد کرو۔ تم کہتے ہو کہ مشرق میں محبت کا تصور روحانی ہوتا ہے۔ تب تو تمہیں جذباتی تشنگی کو برداشت کرنا چاہیے اور جب میں دیکھوں گی کہ بغیر جنسی سیری کے ہماری دوستی بھی باقی نہ رہ سکے گی تب میرے لیے فیصلے کا وقت آجائے گا۔

تم نے ذکر کیا ہے کہ نوروز کے زمانے میں جب میں تمہارے کمرے میں آئی تھی تو تم میرا بوسہ لینا چاہتے تھے اور شرما کے نہ لے سکے۔ اس بوسے کا جو تم کو نہ مل سکا مجھے افسوس ہے۔ اب میں تم سے کہہ دیتی

ہوں کہ اس وقت میرا بھی دل چاہا تھا کہ خدا حافظ کہتے ہوئے بوسہ لوں لیکن میں نے خیال کیا کہ معلوم نہیں تم اس کے کیا معنی سمجھو اور اس وقت تمہیں ایلس کا غم بھی تھا۔

کاش مجھے بھی تحریر پر اتنی قدرت ہوتی جتنی تم کو ہے، تا کہ میں تمہارے جذبات کا، اور خصوصیت سے تمہارے اس وعدہ کا کہ تمہارے عشق سے ہماری دوستی میں کوئی فرق نہ آئے گا، شکریہ ادا کرتی۔ شکریہ نعیم۔

تمہاری دوست

میری"

(۲)

اپریل میں نعیم لندن آ گیا اور برونزوک اسکوائر میں ایک اچھا سا فلیٹ لے کے رہنے لگا۔ اسے لندن یونی ورسٹی کے مدرسۂ علوم مشرقیہ میں کچھ درس لینے تھے۔ اس زمانے میں کرا کیلے سے اس کی بہت کم ملاقات ہوتی۔ کرا کیلے کبھی کبھی ہفتے کے ختم پر ایک دن کے لیے لندن آتا اور نعیم کے ساتھ ٹھہرتا۔

ہروشا کا تبادلہ اسی زمانے میں انگلستان کے چیک سفارت خانے میں ہوا اور وہ بھی لندن آ گیا۔ اس کا اور نعیم کا پھر ساتھ رہنے لگا۔ اسی سے نعیم کو معلوم ہوا کہ کرا کیلے کچھ دن کے لیے پیرس گیا تھا۔

(۳)

اس زمانے میں لندن میں ملک بار (جہاں دودھ کی بنی ہوئی پینے کی چیزیں اور دیگر خورد ونوش کی چیزیں ہوتی ہیں جن میں الکحل نہیں ہوتا) کثرت سے کھل گئے تھے۔ ٹائن ہم کورٹ روڈ پر ایک چھوٹے سے ملک بار میں نعیم اکثر جایا کرتا۔ وہاں کی ایک خادمہ اسے بہت پسند تھی۔ عجیب بات ہے کہ اعلیٰ وادنیٰ عشق دونوں کس طرح ایک ہی زمانے میں اور مختلف عورتوں سے ممکن ہیں۔ ہروشا بھی کبھی اس کے ساتھ جاتا۔

ایک دن ہروشا نے بیٹھے بیٹھے ذکر کیا۔

"تم کون سا اخبار پڑھتے ہو؟"

"ڈیلی ہیرلڈ۔ نیوز کرانیکل۔ کیوں ہروشا؟"

"کبھی کبھی ٹائمز بھی پڑھا کرو۔"

"کیوں؟"

"بورڈ وا شادیوں اور منگنیوں کا اس میں ذکر ہوتا ہے۔" ہروشا نے چاکلٹ آئس کریم کے گلاس کو ہلا کے جواب دیا۔

"مثلاً؟" نعیم نے کسی قدر حیرت سے پوچھا۔

"مثلاً آج کے ٹائمز کا یہ ٹکڑا۔" ہروشا نے اپنے کوٹ کی جیب سے کاغذ کا ایک مسلا ہوا ٹکڑا نکالا۔ یہ پورا ایک کالم تھا۔

ہروشا نے چاکلیٹ آئس کریم پیتے ہوئے پڑھنا شروع کیا۔ "عنوان ہے 'ہونے والی شادیاں' جن لوگوں کو اور کوئی کام نہیں ہوتا، وہ اپنے بچوں کے پیدا ہونے، اپنے بزرگوں کے مرنے اور اپنی شادیوں کی خبریں اخبارات میں شائع کرتے ہیں۔ اور جو لوگ ان سے بھی زیادہ بیکار ہوتے ہیں وہ بجائے ہسپانیہ کی جنگ کی خبروں یا شاہِ انگلستان کی تاجپوشی کی تیاریوں کی خبروں کے ان ہی خبروں کو بڑے ذوق شوق سے پڑھتے ہیں۔"

"خیر پھر کیا ہوا؟"

"اس کالم میں بہت سی شادیوں، یا ہونے والی شادیوں کے اعلانات ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے:

مسٹر جی۔ ایچ۔ کراکسلے اور مس ایم پاول

مسٹر جیمز گیون کراکسلے، جو آنجہانی آنریبل ہربرٹ کراکسلے اور مسز ہربرٹ کراکسلے ساکنان ہرٹ جورڈ شائر کے صاحبزادے ہیں۔ اور مس میری پاول جو پروفیسر پاول اور مسز پاول کی صاحبزادی ہیں۔ ان دونوں کی نسبت کا اعلان کیا گیا ہے۔ مس میری پاول یورپ بھر میں 'گلِ سُرخ' کے نام سے مشہور ہیں اور جمہوریت ہسپانیہ کے لیے بہت سی ہمدردانہ خدمات انجام دے چکی ہیں۔ شادی کلیسائے سینٹ مارٹن ان دی فیلڈز ٹرافالگر اسکوائر میں ۲۸ مئی کو ہوگی۔"

سانس روک کے نعیم یہ خبر سنتا رہا۔ عنوان سنتے ہی اس کا دل دھڑکنے لگا تھا ۔۔۔ ہروشا اس خبر کو صبر آزما ڈرامائی اطمینان سے سنا رہا تھا اور نعیم کے چہرے کو گوشۂ چشم سے دیکھتا جاتا۔ نعیم کے چہرے کا رنگ

سُرخ تر ہو رہا تھا۔

ہروشا نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ "مجھے افسوس ہے۔"

نعیم نے بمشکل اتنا کہا۔ "وہ کم سے کم مجھے لکھ تو دیتی۔ مجھ سے اس کا ذکر تو کرتی۔"

ہروشا نے کہا۔ "میرے دوست تم اسے بھی بھول جاؤ گے، جیسے اوروں کو بھول گئے۔ اس ہندوستانی لڑکی کو ۔۔۔ تم نے اس کا کیا نام بتایا تھا۔ بل کیس؟ یا جیسے تم ایلس کو بھول گئے لیکن میری نے بڑی غلطی کی ہے۔ میری اور جیمز دراصل ایک دوسرے کے لیے بنے ہی نہیں۔"

"مگر جیمز بہت خوبصورت نوجوان ہے۔ اگر دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہوگئی تو تعجب کی کیا بات ہے۔؟" نعیم نے قابلِ رحم طور پر ایک غیر شخصی انداز میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"میرے دوست!" ہروشا نے اپنا پائپ سُلگاتے ہوئے کہا۔ "جوشِ تخلیق کبھی کبھی بھٹک بھی جاتا ہے۔ ابھی اسپین کو میری کی ضرورت تھی۔ وہ ہمدردی کی تخلیق کرنا جانتی تھی۔ جب عالمگیر جنگ چھڑتی تو دنیا کو اس کی ضرورت ہوتی۔ ایسی ہی عورتوں میں فلارنس نائٹ اینگل بھی تھی۔ اب جیمز کی بیوی ہو کے وہ کیا رہ جائے گی۔ محض ڈھلکے ہوئے پستانوں والی ماں اور اسے بھی سکون نہ ملے گا، نہ جیمز کو راحت ملے گی۔"

ملک بار کی حسین خادمہ کو بل ادا کرتے ہوئے ہروشا نے موضوعِ سخن بدلنے کے لیے کہا۔ "کل اتوار ہے۔ برائٹن چلو۔ وہاں تمہارا دل بہل جائے گا اور ہاں میں تم سے کہنا بھول گیا۔ ہفتے بھر کے بعد مجھے پراگ واپس جانا ہے۔ یہاں کسی قابل تر آدمی کو بھیجنا چاہتے ہیں۔ معلوم نہیں مجھے کہاں پھینکا جائے گا۔"

(۴)

اس رات کو کھانے کے بعد نعیم نے دو خط لکھے۔ ایک میری کے نام۔ مختصر سا مبارکباد کا خط، دوسرا کراکسلے کے نام۔ یہ بھی مبارکباد کا خط۔ کراکسلے کے نام خط اس نے ابھی ختم ہی کیا تھا اور لفافے میں رکھ رہا تھا کہ کراکسلے خود آپہنچا۔ اسے اس وقت اپنے دروازے پر دیکھ کے نعیم کو حیرت ہوئی۔ اس نے اس سے ہاتھ ملایا۔ نعیم کے ہاتھ سرد تھے ۔۔۔ کراکسلے نے کہا بھی۔ "اپریل میں تمہارے ہاتھ اس قدر سرد ہیں۔ اس

سے معلوم ہوتا ہے کہ خون کی روانی ٹھیک نہیں۔"

نعیم نے اپنے دل میں غور کرنا شروع کیا۔ شاید یہ سب خون کی روانی ہی کا قصور تھا۔

ایک نا قابلِ بیان اور نا قابلِ برداشت غیریت کراسکلے اور نعیم کے درمیان حائل تھی۔ نعیم نے اس کے نام لفافے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "میں ابھی تم کو مبارکباد کا خط لکھ ہی رہا تھا۔ مبارک۔۔۔ مجھے امید ہے کہ تم دونوں بہت خوش رہو گے۔"

اِدھر اُدھر کی رسمی باتوں میں بھی اتنا بُعد تھا کہ اب کراسکلے کے لیے دو ہی صورتیں تھیں۔ یا تو وہ اپنے ہندوستانی دوست سے اسی طرح رخصت ہوتا اور یہ بُعد بڑھتا جاتا۔ یا شخصی مصالحت کی ایک آخری کوشش کرتا۔ چنانچہ اس نے کہا۔ "نعیم تم کو بھی میری سے بہت محبت ہو گئی تھی؟"

نعیم نے کہا۔ "ہاں!" اور آتشدان میں گیس جلانے لگا۔ کیونکہ باہر پانی برس رہا تھا اور سردی اچھی خاصی تھی۔

"مجھے افسوس ہے۔" کراسکلے نے کہا۔

"شکریہ۔" نعیم نے خشکی سے جواب دیا۔ "بہر حال مجھے خوشی ہے کہ اس نے تمہیں انتخاب کیا۔ انتخاب اس کے ہاتھ میں تھا۔"

کچھ دیر تک دونوں دوست خاموش دہکتی ہوئی آگ کی طرف دیکھتے رہے۔

پھر کراسکلے نے دفعتاً جیب سے دونوں ہاتھ نکال لیے اور آتشدان کے سہارے کھڑا ہو کے کہنے لگا۔

"نعیم میں تمہیں پسند کرتا ہوں۔ تمہاری خوبیوں سے زیادہ تمہاری کمزوریوں کی وجہ سے۔ مجھے افسوس ہے کہ تم کو یہ صدمہ پہنچا۔ اس سے ہماری دوستی پر کوئی اثر تو نہیں پڑے گا؟"

دوستی۔ دوستی۔ نعیم کو اس لفظ سے نفرت سی ہو گئی تھی۔ کیا وہ اسی لیے بنایا گیا تھا کہ ہر درجۂ اول کا انسان اسے رحم اور عنایت کی نظر سے دیکھے، اسے اپنا دوست بنائے اور دوست رکھنا چاہے۔ جیسے کسی شریف کتے کو۔

اپنے غصے کو پی کے اس نے جواب دیا۔ "نہیں اس سے ہماری دوستی پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔"

اس کے الفاظ کے جھوٹ کو کراسکلے نے محسوس کیا کیونکہ اس نے کہا۔ "کیا عجیب بات ہے کہ جب کوئی بنیادی، کوئی انتہائی معاملہ درمیان میں آجاتا ہے تو وہ دوستی اور رفاقت سب دھری رہ جاتی ہے۔ خدا

نہ کرے کہ دو مخلص دوستوں کے درمیان اس طرح کا کوئی بنیادی معاملہ آئے جیسے جائداد۔۔۔ یا عورت۔"

نعیم نے کوئی جواب نہیں دیا۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔

پھر نعیم نے پوچھا۔ "سگریٹ پیو گے؟"

"شکریہ۔ عزیز لڑکے۔" کراسکلے نے خود سگریٹ کا ڈبہ کھولا۔ سگریٹ نکالا۔ جلایا۔ نعیم جیبوں میں ہاتھ ڈالے اسی طرح خاموش کھڑا تھا۔ چھوٹے بھائی کی طرح۔ جس کا حق بڑے بھائی نے چھین لیا ہو۔

تھوڑی دیر کے بعد کراسکلے رخصت ہوا۔ اگر وہ نہ آیا ہوتا تو نعیم کو اتنی تکلیف نہ ہوتی۔ اور وہ بھی تسلی دینے کے لیے۔ بڑے بھائی کی طرح جیسے چھوٹے بھائی سے ہمدردی بھی ہو جس کے حصے کی جائداد وہ غصب کر چکا ہو۔

نعیم نے کھڑکی کھولی۔ باہر طوفان سا تھا اور سردی کی ایک ناگوار لہر باہر سے آ کے کمرے کی ہر چیز پر چھا گئی۔ پھر نعیم نے کھڑکی بند نہیں کی۔ گویا اپنے آپ کو سزا دینے کے لیے۔ اور اسی عالم میں سوچنا شروع کیا۔

میری پر اس کا حق ہی کیا تھا۔ میری کا بوسہ تک تو اسے نصیب نہیں ہوا تھا۔ صرف چند خطوں سے اسے کراسکلے کی رقابت کا حق کیونکر پہنچ سکتا۔ کیونکہ وہ کراسکلے سے اس کی توقع کر سکتا تھا کہ وہ اس کے حق میں میری کی محبت سے دستبردار ہو جائے۔ ایلس کے معاملے میں دیکھ چکا تھا کہ اس قسم کی شادیوں میں کتنی عملی دشواریاں تھیں۔ ایلس کا گذارا تو پھر بھی شاید ہندوستان میں ہو جاتا۔ مگر میری کی شخصیت تو اتنی اعلیٰ تھی کہ اسے نعیم ہندوستان میں اپنی بیوی کی حیثیت سے تصور نہیں کر سکتا تھا۔ اور پھر وہ خود کب اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میری کے کراسکلے سے تعلقات رہ چکے ہیں اور بیسیوں سے۔ اس کا جنسی رجحان اکثر جنسی سیری پر ختم ہوتا۔

تو پھر آخر وہ میری سے کیا چاہتا تھا؟۔۔۔ تعلقات جنسی؟ ان کا تو اب بھی امکان تھا۔ وہ سوچنے لگا

کہ کسی دوست کی بیوی کو پھسلانا قرونِ وسطیٰ میں ہنر سمجھا جاتا تھا اور زمانہ حال میں یہ جرم قابلِ معافی سمجھا جاتا ہے لیکن کیا وہ اب کراکسلے اور میری کے درمیان آئے گا؟ کیا وہ اپنی محبوبہ اور اپنے عزیز ترین دوست کو ایک دوسرے سے اس طرح جدا کرنے کا باعث بنے گا اور یہ سب کس لئے؟ کیا وہ جسمانی راحت اور کہیں حاصل نہیں ہو سکتی؟ مثلاً ملک بار کی وہ حسین خادمہ۔ یا امیر اسمتھ پلیس کی ہزاروں ناچنے والی لڑکیاں جہاں ہندوستانی طالب علم اکثر لڑکیاں "پکڑنے" جاتے ہیں گویا لڑکیاں نہ ہوئیں مچھلیاں ہوگئیں۔

لیکن وہ تو میری کو چاہنے لگا تھا۔ 'گل سرخ' کو، میری کو جو اب ایک جنسی تصوریت بن چکی تھی۔
قرونِ وسطیٰ میں جنوبی فرانس کے نائٹ، اپنے دوستوں کی غیر موجودگی میں کس طرح ان کی بیویوں کے کمروں کے نزدیک فصیل کے قریب کھڑے ہو ہو کے اظہارِ محبت کرتے تھے۔ پرووانس کی شاعری۔ پیرووال جس میں اپنی محبوبہ کو مادۂ گرگ سے تشبیہ دی ہے۔ اس زمانے کے شوہر، شعراء سے اپنی بیویوں کی تعریف سُن سُن کے خوش ہوتے تھے۔ نظامِ عشق میں شوہر کچھ نہ تھا۔ اسے 'رقیب' ہونے کا مرتبہ بھی حاصل نہ تھا۔ عاشق کا رقیب شوہر کے سوا کوئی اور عاشق ہی ہوتا۔ جفا قرونِ وسطیٰ کی ان خواتین اور نازنینانِ ایران کا یکساں حصہ تھا۔ لیکن بے وفائی کا جرم ناقابلِ معافی تھا۔ عاشق مجنوں بھی تھا اور بندۂ بے دام بھی۔ اور رازداری عشق کا اصل اصول تھا۔ رازداں عاشق کا پیغام معشوق کو اور معشوق کا عاشق کو پہنچاتے۔ قرونِ وسطیٰ کی پرووانسال شاعری اور فارسی شاعری میں کتنی چیزیں مشترک ہیں۔ کتنی شاعرانہ روایات، جفا، وفا، بے وفائی، رازداری، جنون، عاشق کی سراسیمگی، عاشق کی بیچارگی، معشوق کی دل آزاری، معشوق کی دلجوئی، رازداری اور احترامِ راز، رقیب اور رقیب کا شر، کاش یہ وہی زمانہ ہوتا۔ یہ زمانہ کیا کم ہے؟

کیا اسے فی الحقیقت میری سے محبت تھی۔ یعنی میری کے جسم سے۔ میری کے بال بڑے خوبصورت تھے۔ گچھے دار، ریشمی سنہرے بال، سراپا بھی مشرق اور مغرب کی شاعری میں یکساں مقبول رہا ہے۔ بالوں کے بعد پیشانی کا ذکر ہوتا ہے۔ میری کی پیشانی اوسط انگریزی پیشانی تھی۔ کوئی خاص بات نہ تھی۔ اس کی آنکھیں کتنی گہری، کتنی نیلی تھیں۔ اور ناک، چھوٹی سی تیوتانی ناک، متناسب اور سانچے میں ڈھلی ہوئی۔ اس کے چہرے کا رنگ کتنا سفید تھا۔ سرخ سے زیادہ سفید اور اس کے لب کتنے سرخ

تھے اور اس کے دانت۔۔۔۔

اس کے دانت بہت زیادہ سفید نہ تھے۔ ایلس کے دانتوں کے مقابل وہ کچھ نہ تھے۔ ہلکے مٹیالے رنگ کے مگر متناسب دانت، جو اس کے چھوٹے سے دہانے کے اندر ہی رہتے تو اچھا تھا۔ صرف مسکراہٹ کے وقت یہ دانت اچھے معلوم ہوتے۔ ہنسی کے وقت نہیں۔ اور اس کے شانے۔ نعیم کو اس وقت یاد نہیں رہا کہ اس کے شانے بھرے ہوئے تھے یا نہیں۔ بلقیس کے شانے کتنے بھرے ہوئے تھے اور میری کے پستان ڈھلکے ہوئے تھے۔ دانت اور پستان، اگر ان دونوں میں بھی وہی کمال ہوتا جو میری کے جسم کے اور ہر حصے میں تھا تو وہ شہزادی نہیں دیوی معلوم ہوتی۔ اکثر وہ سفید ٹیل او ور پہنتی تھی جو اس کے سنہرے بالوں میں اس کی ہاتھی دانت کی سی رنگت پر بہت ہی موزوں معلوم ہوتا۔

کیا وہ اس عورت کو چاہتا تھا۔

اس عورت کو جو خوبصورت ہونے کے علاوہ ایسی کشش رکھتی تھی جو محض نسوانیت کا حصہ نہیں۔ وہ کشش جوان شعاعوں کی وجہ سے پیدا ہوتی تھی جو اس کی ذہنی شخصیت سے نکلتی تھیں، ہر ایک کو وہ مسحور کر دیتی تھی۔ اپنے حسن سے نہیں، اپنی شخصیت سے بھی، اپنے دماغ سے بھی۔

کھڑکی سے ٹھنڈک کی لہریں برابر آرہی تھیں۔ آتشدان میں پینی بھر کی گیس کی آگ ختم ہو چکی تھی۔ اور سوراخ میں ایک اور پینی ڈالنے کی ضرورت تھی۔ سردی کا ایک جھونکا اور آیا اور نعیم کو معلوم ہوا کہ وہ اس کے جسم کے آرپار سا ہو گیا۔ اسے زور کی چھینک آئی اور اسے معلوم ہو گیا کہ زکام زیادہ دور نہیں۔

عشق میں ناکامی ہی کیا مصیبت تھی کہ یہ زکام بلا کی طرح نازل ہوا۔

دوسرے دن ہروشا کے ساتھ گیارہ بجے نعیم نے اسی ملک بار میں امریکن سینڈوچ کھائے۔ وہاں ڈاکٹر راجندر سے ملاقات ہوئی جن کے ساتھ ایک جرمن یہودن تھی۔ ڈاکٹر راجندر کو ہروشا نے بہت پسند کیا۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ ان میں نعیم سے زیادہ ہندوستانیت تھی۔ کچھ اس وجہ سے کہ انہوں نے اسے ہندوستانی ریکارڈ سنانے کا وعدہ کیا۔

بارہ بجے ہروشا اور نعیم برائٹن روانہ ہوئے۔ راستہ بھرا ہوا تھا اور برائٹن میں خاصی بارش تھی۔ یہ تھا مشہور و معروف برائٹن۔ یہاں ایک مشرقی وضع کا، انتہا درجے کی بدمذاقی کے ساتھ بنایا ہوا مشرقی طرز کا گنبد اور اس کی عمارت نہ ہوتی تو مقام ایسا برا نہ تھا مگر دھوپ کا کہیں نام نہ تھا۔ سمندر کی موجیں بے

چین اور کف بہ لب تھیں اور سمندر سے تیز ہوائیں آ رہی تھیں۔ سمندر کے کنارے کی سڑک پر دونوں بہت دیر تک ٹہلتے رہے۔ پھر ایک گرم چھوٹے سے قہوہ خانے میں چائے پی۔ ہروشا اسے عاشق کے خلاف لیکچر دیتا رہا اور زکام بڑھتا گیا۔

ہروشا سمجھا رہا تھا۔ ''عورت میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے اسے شرم آنی چاہیے۔ مثلاً نظریہ پرستی، سطحیت، اس کا استانی پن، اس کا برخود غلط انداز، اس کا بے لگام پن، اس کی بے احتیاطی محض مرد کے خوف سے وہ محتاط رہتی ہے۔۔۔''

نعیم دل میں سوچ رہا تھا۔ وہ اپنے خط میں صرف اتنا لکھ دیتی کہ وہ کرا کسلے کو چاہتی ہے، تو مجھے کوئی شکایت نہ ہوتی۔ اور اس کا زکام بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ ابتدائے بہار کا زمانہ تھا مگر موسم کی یہ حالت تھی کہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ابھی جاڑے کی گہرائیاں باقی ہیں یا سچ مچ بہار آ گئی۔

عشق اور زکام اور بہار میں اس قدر سردی:

اے وائے بہار اگر ایں است بہارے

✓

تیرھواں باب

تاجپوشی

نعیم ملک معظم جارج پنجم کے عہد حکومت میں پیدا ہوا تھا۔ اسی کے دور حکومت میں ہوش سنبھالا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ دور حکومت کبھی ختم نہ ہو گا۔ گویا اس میں بھی سلطنت برطانیہ کا سا استحکام ہے لیکن کہن سال بادشاہ کو بھی بالآخر ملک الموت نے اپنا شکار بنایا۔ شاہزادۂ ویلز، ایڈورڈ ہشتم کے نام سے بادشاہ بنا اور چند ماہ حکومت کی۔ پھر مسز سمپ سن کا قصہ شروع ہوا۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ ویلز میں بادشاہ نے کان کنوں سے جو اخلاق برتا، اس سے اس کے اشتراکی رجحان کا پتہ چلتا ہے اور اسی لیے بالڈون اس کا مخالف ہے۔ اس زمانے میں نچلے طبقے اور مزدور طبقے کے انگریزوں کے تبصرے سننے کے قابل ہوتے۔ پروفیسر اور طالب علم کالج کے چپراسیوں کے گرد جمع ہو جاتے اور چپراسیوں کی رائیں اور پیشن گوئیاں سنتے۔ مسٹر چرچل نے جوان سال بادشاہ کی حمایت بھی کی لیکن نوآبادیات نے مخالفت کی۔ مسز سمپ سن دو بار طلاق لے چکی تھی۔ بھلا انگریزی اخلاق عالیہ۔۔۔ جو در پردہ سب انگریز کچھ گوارا کر لیتے۔۔۔ یہ کیسے گوارا کر سکتے تھے کہ ایسی خاتون ان کی ملکہ بنے۔ نعیم نے بہت سے انگریز دوستوں کے ساتھ ایڈورڈ ہشتم کی دست برداری کی تقریر سنی۔ دوسرے دن ایک آدھ قدامت پسند اخبار نے اسے مسٹر ایڈورڈ سر لکھا۔ نیا بادشاہ اگر البرٹ کے نام سے تخت نشین ہوتا تو کتنا اچھا تھا۔ مگر ملکۂ وکٹوریہ نے اس کی

ممانعت کردی تھی۔ کیونکہ اس کے شوہر کا نام البرٹ تھا اور اپنی زندگی میں اس نے اس کی مفارقت کا داغ
اٹھایا تھا۔ چنانچہ نئے بادشاہ کو جارج ششم کا لقب ملا۔ اس نے اپنے بھائی، کو ڈیوک آف ونڈسر کا خطاب
دیا۔ ڈیوک آف ونڈسر نے مسز سمپ سن سے شادی کی اور ہٹلر سے ملاقات کی۔ جارج ششم نے شہر اور
ملک کے غریب حصوں کے دورے کئے۔ بادشاہ کی ہر دلعزیزی بہت ضروری ہے۔ اسی زمانے میں
انگلستان نے دفعتاً اس امر کو دریافت کر لیا کہ ملکہ معظمہ ملکہ الزبتھ بہت خوبصورت ہے۔ اشتراکی
بادشاہ شکنی اور بادشاہ گری کے اس کھیل پر تالیاں بجاتے رہے، اور ہائیڈ پارک میں تقریریں کرتے
رہے۔ اقبال نے ایک نظم لکھی:

شاہ ہے برطانوی مندر کے اک مٹی کا بت
جس کو کر سکتے ہیں جب چاہیں پجاری پاش پاش
ہے یہ مشک آمیز افیوں ہم غلاموں کے لیے
ساحرِ انگلیس! مارا خواجۂ دیگر تراش

ساحرِ انگلیس کا خواجہ دیگر تراش جلد مقبول ہونے لگا۔ تاجپوشی کی تیاریاں بدستور جاری رہیں مگر
تاج پہننے والا بدل گیا۔ برِاعظم یورپ میں بڑے بڑے اسٹیشنوں پر "شاہِ انگلستان کی تاجپوشی دیکھنے انگلستان
آؤ" کے اشتہار پہلے سے لگ گئے۔ شہر لندن تاجپوشی کے زمانے میں جھنڈیوں سے آراستہ ہونے لگا۔
ربع مسکوں سے کئی بادشاہ سر اطاعت خم کرنے اور داد اطاعت دینے آئے۔

ہوٹل اس قدر بھر گئے کہ چوگنے پچ گنے کرائے پر بھی جگہ ملنی ناممکن تھی۔ ہندوستانی راجے مہاراجے
آئے۔ نائجیریا اور مشرقی افریقہ کے حبشی سردار آئے، اعلیٰ سے اعلیٰ سوٹ پہنے ہوئے۔ ان میں سے
ایک آدھ اپنا تعارف چٹکی بجا کے کرتا۔ "میں پرنس آبا ہوں۔" اور اس کے سیاہ اور موٹے حبشی چہرے پر
اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگتیں۔ راجاؤں کے ساتھ افسروں اور خادموں کی وجہ سے لندن کے ہوٹل
اور قہوہ خانے ہندوستانیوں سے بارونق ہو رہے تھے۔ ایک بہت بڑے ہوٹل نے ایک نیا
سوپ (شوربہ) ایجاد کیا اور اس کا نام "مہتر چترال کے تاج کے موتیوں کا سوپ" رکھا۔

۵ مئی ۱۹۳۷ء کی سہ پہر کو، یعنی جشن تخت پوشی سے تقریباً ایک ہفتہ پہلے سینٹ جوزف انٹرنیشنل کلب
میں نعیم برتھا سے ملا۔ وہ اسی دن آئی تھی اور اس کا سامان کلب کے تہ خانے میں پڑا تھا۔ کہیں جگہ کا کوئی
انتظام نہ ہوا تھا۔ وہ ڈر رہی تھی کہ کہیں اسے پھر قاضی ہاشم صاحب کے ساتھ نہ رہنا پڑے، جن سے اس
نے پیرس میں پیچھا چھڑا لیا تھا۔ نعیم نے اسے تین بجے سینما چلنے کو کہا۔ ایک جرمن فلم اکادمی سینما میں ہو رہا
تھا۔ "برگ تھیاٹر" سینما میں اس کے اور نعیم کے شانے ایک دوسرے سے مس کر رہے تھے۔ نعیم کی
طبیعت دست درازی کرنے کو نہ چاہی۔ سینما سے نکل کے چھ بجے کے قریب دونوں نے ایک چھوٹے
سے مگر خوبصورت چینی ریستوران میں چائے پی۔ اور چائے پیتے میں برتھا نے کہا "معلوم نہیں آج کی
رات کہاں گذاروں گی۔ جتنی لڑکیوں سے میری دوستی ہے، ان میں سے کسی کے یہاں مجھے جگہ نہیں ملی۔"

نعیم نے کہا کہ وہ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتا ہے۔ اگر وہ گوارا کرے تو اس کا فلیٹ حاضر
ہے۔

برتھا نے بہت شکریہ ادا کر کے انکار کیا۔ نعیم نے اسے رات کے کھانے پر مدعو کیا تو اس نے کہا کہ
وہ اپنے ایک ولندیزی دوست کے ساتھ کھانا کھانے کا وعدہ کر چکی ہے۔

دوسرے دن صبح کو ڈاکٹر راجندر سے ملنے ہیمپ اسٹڈ گیا۔ دونوں ہیمپ اسٹڈ ہیتھ پر ٹہل رہے
تھے۔ مئی کی صبح کی لطیف دھوپ میں اس سبزہ زار پر بڑی رونق تھی۔ درختوں کے درمیان ہلکی ہلکی دھند
تھی۔ جہاں کہیں پانی جمع ہو گیا تھا وہاں بھی کہر اور سبزہ کے رنگ ایک دوسرے میں ضم ہوتے ہوئے
معلوم ہو رہے تھے۔ یہاں ڈاکٹر راجندر نے ان دونوں ہندوستانی لڑکیوں کو نعیم سے ملایا، جن سے پہلے
اس دن پیرس میں رجکماری کی پارٹی میں ملا تھا۔ ان میں سے بڑی بہن کوکب زماں اب بھی اسی طرح بدشکل
معلوم ہوتی تھی لیکن اس کی آنکھیں لانبی اور خوبصورت تھیں۔ وہ بہت جلد بے تکلف ہو کے باتیں کرنے
لگی۔ دوسری بہن خورشید زماں کا ناک نقشہ اچھا تھا اور جسم چھریرا سا۔ یہ دونوں لڑکیاں ٹل سائڈ اوے نیو
میں ٹھہری تھیں۔ ان کے جانے کے بعد ڈاکٹر راجندر نے ان کے قصے سنانا شروع کئے۔

دوپہر کا کھانا کھا کے جب نعیم پھر سینٹ جوزف انٹرنیشنل کلب پہنچا تو برتھا وہاں ملی۔ وہ ولندیزی
نوجوان اس کے ساتھ تھا۔ نعیم اس سے پہلے مل چکا تھا۔ اس کا نام تھا وان مائن۔ ساڑھے چھ فٹ کے

قریب قد، ہونٹ نہایت سُرخ، بال راکھ کے رنگ کے اور ذرا گھونگھرالے۔

برتھا موقع پا کر ہاتھ پکڑ کے نعیم کو ایک طرف لے گئی۔ ''کیا میں وہ دعوت اب بھی قبول کر سکتی ہوں جو تم نے کل دی تھی؟ میں تمہارے فلیٹ میں آ کے ٹھہر سکتی ہوں؟''

''بے شک۔ ضرور، خوشی سے۔'' اور رات کی اُمید سے نعیم نے اپنے بدن میں خون کی گرمی محسوس کی۔

''وان مانن نے میرے ساتھ بڑا کمینہ پن کیا۔ مجھ سے کھانے کے اور کمرے کے کرائے کے پانچ شلنگ لئے اور پھر رات کو —— رات کو میں اپنے آپ کو بچا نہ سکی۔ آخر یہودی ہے نا؟''

کیا عجیب بات ہے۔ یہ ٹیوٹانی لڑکیاں یہودیوں کو پسند بھی کرتی ہیں، اور جب دھوکا کھاتی ہیں تو ہٹلر کی طرح انہیں برا بھلا بھی کہتی ہیں۔ پھر بھی نعیم کو یقین تھا کہ برتھا کو افسوس اس کا نہیں کہ اس نے وان مانن کے ساتھ رات گذاری، بلکہ اس کا کہ بجائے اس کے کہ وہ اس کی خاطر کرتا اُلٹا اس سے پانچ شلنگ لے مرا۔

نعیم نے ایک ٹیکسی منگوا کے برتھا اسل سن کا سامان اپنے فلیٹ پر پہنچایا۔ وہیں برتھا نے چائے بنائی اور نعیم کی گود میں بیٹھ کے پی۔ ہروشا آ گیا اور یہ دیکھ کے کہ اس قدر جلد نعیم اس نئی سویدی حسینہ سے میری کے فراق کا غم غلط کر رہا ہے، مسکرایا۔ ابھی سہ پہر کا کافی حصہ باقی تھا۔ نعیم کے اصرار پر اس کے اور برتھا کے ساتھ ہروشا بھی سینما چلنے کو تیار ہو گیا۔ کل ہروشا چیکوسلاویکیہ واپس ہو رہا تھا۔

سینما سے واپسی پر نعیم نے کہا کہ اس کا ارادہ یورپ کے ایک بڑے طویل سفر کا ہے اور اس سفر کے ختم پر وہ ہندوستان واپس ہوگا۔ ہروشا نے اسے چیکوسلاویکیہ آنے کی اور برتھا نے اسٹاک ہولم آنے کی دعوت دی۔

رات کا کھانا ''پچولی'' میں کھا کے، ہروشا تو رخصت ہوا اور برتھا اور نعیم ہاتھ میں ہاتھ ڈالے برونزک اسکوائر چلے۔

راستے ہی میں اس نے غور کرنا شروع کیا۔ میری بھی آج کل لندن ہی میں تھی۔ اس نے ٹیلیفون بھی کیا تھا کہ وہ ملنے آئے۔ پھر بھی نہیں آئی۔ وہ کرا کسلے کے ساتھ ٹھہری تھی۔ کرا کسلے سے بھی چار پانچ دن سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ سچ یہ ہے کہ انگریزوں کا کوئی اعتبار نہیں۔ کرا کسلے ہی تو کہتا تھا کہ کوئی بنیاد

ی مسئلہ درمیان میں آ جائے تو ساری دوستی رکھی رہ جاتی ہے۔

ہروشا نے کہا تھا کہ کرا کسلے اور میری ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح رہتے ہیں جیسے میاں بیوی۔ ابھی سے۔ پھر نعیم کا خون کھولنے لگا اور میری، یہاں تاج پوشی کے زمانے میں ہسپانیہ والا ''گل سُرخ'' اب برطانوی تاج پر کوہ نور کا نظارہ کرنا چاہتا تھا مگر ممکن ہے اس کا خیال غلط ہو۔ ممکن ہے میری اس لیے نہ آئی ہو۔ محض کرا کسلے کے لیے آئی ہو۔ بہر حال کرا کسلے ہو یا کوہ نور، اس سے تو وہ بہت دور ہو چکی تھی۔

اور اس سلسلۂ خیالات سے اکتا کے اس نے برتھا سے کہا۔ ''مجھے اسٹاک ہولم کے اور حالات سناؤ۔''

برتھا نے کہا۔ ''اب تم خود آ کے دیکھ لینا۔ میں اپنے ساتھ پھرا کے تمہیں سارا شہر دکھاؤں گی۔''

اس کے بعد وہ سویدن زبان کے متعلق باتیں کرنے لگے۔ صدیوں تک سویدی میں ''تم'' کے لیے کوئی لفظ نہ تھا۔ اور اب لفظ ''وے'' مقبول ہو رہا تھا۔ کیونکہ اس کے بغیر بے تکلف گفتگو ناممکن تھی۔ اس سے پہلے وہ دوست جو زیادہ بے تکلف نہ ہوتے ایک دوسرے کو یوں مخاطب کرتے ''طالب علم صاحب کا اس معاملے میں کیا خیال ہے'' ''میں نوجوان خاتون کی رائے سے متفق ہوں۔'' برتھا نے کہا کہ ''اگر ہم تم اس وقت سویدی میں باتیں کرتے ہوتے تو قاعدہ زبان کے متعلق اسی طرح باتیں کرتے ہوتے۔''

اپنے فلیٹ میں پہنچ کے اس نے دو گلاسوں میں کیانتی بھری۔ وقت بے وقت کیانتی سے خاطر کرنا اس کی عادت ثانیہ بن چکی تھی۔ ایک گلاس اس نے برتھا کو دیا۔ برتھا کو پھر اپنی گود میں کھینچ کے بٹھایا۔ برتھا کے پستان بڑے بڑے تھے اور نرم نہیں تھے۔

برتھا نیم دراز حالت میں اس کی گود میں لیٹی ہوئی تھی اور اس کا سنہرے بالوں سے بھرا ہوا سر نعیم کے شانے کا سہارا لگائے ہوئے بڑا خوبصورت معلوم ہوتا تھا۔ نعیم نے اس کا بوسہ لینا چاہا تو اس نے اپنے لب اُوپر اٹھا لیے۔ نعیم نے اسی حالت میں اسے اور اچھی طرح اپنی آغوش کی گرفت میں لے کے اور اس کے سینے پر پنجہ گاڑ کے اس کا بوسہ لیا۔ نعیم کے دانت اس کے دانتوں سے ٹکرائے اور وہ نعیم کی زبان کو چوسنے لگی۔ پل اوور کے نیچے وہ زیر جامہ پہنے تھی۔

بے دردی سے، گویا میری کا انتقام لینے کے لیے نعیم نے اپنے دانتوں سے اس کے ہونٹوں کو کاٹا لیکن برتھا اس کو انتقام کہاں سمجھ رہی تھی۔ اس کے نزدیک تو یہ استوائی جوشِ محبت تھا۔ برتھا کا تنفس تیز اور گرم ہوتا جا رہا تھا۔

دوسرے دن نو بجے برتھا نے اُٹھ کے چائے بنائی اور ایک ہی پیالی سے ایک گھونٹ خود پیتی دوسرا نعیم کو پلاتی رہی۔

باہر مطلع ابر آلود تھا۔ مالکۂ مکان سے کہہ کے نعیم نے دو کا کھانا وہیں منگوایا۔ چونکہ دن بھر دونوں باہر نہیں نکلے تھے اس لیے ذرا ذرا سردی معلوم ہو رہی تھی۔ نعیم نے گیس جلایا۔ کھانا کھاتے میں برتھا نے پوچھا۔

"تم افلاطونی محبت کے قائل ہو؟"

نعیم نے کانٹا رکھ کے مسکرا کے جواب دیا۔ "یہ تو تم دیکھ چکی ہو۔"

برتھا کھلکھلا ہنسی، اس کے سنہرے بال اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے اور اس کے لبوں پر ایک عجب طرح کا حسن اور انتہا درجے کی شگفتگی جھلکنے لگی۔

"تم اس کے قائل ہو کہ مرد اور عورت میں ایسی دوستی بھی ممکن ہے جس میں جنسی تعلق نہ ہو؟"

"ممکن ہے ایسا نہ ہوتا ہو۔" نعیم نے کہا۔ "مگر میرے خیال میں جنسی تعلق کے بغیر مرد اور عورت کی زندگی میں کوئی لطف نہیں۔ غیر محسوس طور پر تو جنس کا احساس موجود ہی رہتا ہے۔"

برتھا مسکرائی۔ پھر اس نے کہا۔ "وان مانن سے مجھے بڑی نفرت معلوم ہوتی ہے۔"

دو تین لمحے کے بعد نعیم نے ہنس کے کہا۔ "قاضی ہاشم تمہیں پسند ہے؟"

"اس کا نام بھی میرے سامنے مت لو۔" برتھا نے بے صبری سے کہا۔ "ایسا ناقابلِ برداشت آدمی میں نے بہت کم دیکھا ہے۔"

"اور راجہ ہمت نواز ونت؟"

"ہاں ان سے بالکل سرسری ملاقات ہوئی تھی۔ پیرس میں اس دن تم بھی ملے تھے نا؟"

"ان کے ساتھ رہ چکی ہو؟"

وہ شوخی سے مسکرائی۔ "پیارے تم بڑے شریر ہو۔ تمہیں یقین کرنا چاہیے کہ تمہارے سوا مجھے شاید

ایک آدھ مرد کے ساتھ محبت ہوئی ہو۔ تم مجھے آخر کیا سمجھتے ہو؟"

"میں تمہیں شمالی یورپ کی سب سے زیادہ حسین لڑکی سمجھتا ہوں۔"

خادمہ آ کے برتن لے گئی۔ برتھا نے ریڈیو کا بٹن گھمایا۔ لکسم برگ سے موتسارٹ کا انتخاب بج رہا تھا۔

نعیم نے برتھا کے ہونٹوں کا بوسہ لے کے ان میں ایک سگریٹ پکڑا دیا اور پھر سگریٹ جلا کے اپنے لیے بھی سگریٹ سلگایا۔ خود فرش پر برتھا کے پیروں کے پاس بیٹھ گیا اور اپنا ہاتھ بڑھا کے اس کے گداز سفید جسم کو آہستہ آہستہ سہلانے لگا۔

"نعیم ڈارلنگ!" برتھا نے اس طرح کہا گویا کچھ سوچ رہی ہو۔

"مجھے ذرا خوف معلوم ہونے لگا ہے۔ اگر مجھے کوئی سانولا سا بچہ ہو جائے تو میں کیا کروں گی؟"

"پیاری تمہاری مرضی کے خلاف تو میں کچھ کر ہی نہیں سکتا۔" نعیم نے کہا۔

"آج میں اور تمہارے ساتھ رہوں گی۔ مگر کل اگر کوئی اور مقام مجھے مل جاتا تو اچھا تھا۔ کسی ہوٹل میں، کسی بورڈنگ ہاؤس میں، یا کسی سہیلی کے یہاں۔"

نعیم کو یک لخت یاد آ گیا۔ اس نے کہا۔ "کل مجھ سے دو ہندوستانی لڑکیوں سے ملاقات ہوئی تھی۔ تم بھی انہیں جانتی ہو؟ کوکب زماں اور خورشید زماں۔ وہ بھی پیرس میں راج کمار کے ناچ میں آئی تھیں۔"

"ہاں۔ ہاں!"

"ان میں سے کسی ایک کے ساتھ میں تمہارے ٹھہرنے کا انتظام کرا سکتا ہوں۔ ورنہ اگر احتیاط کرنا چاہو تو یہ دوسرا پلنگ تو موجود ہی ہے۔" نعیم نے کہا۔

"نہیں۔۔۔ تمہارے ساتھ ایک ہی کمرے میں رہ کے تو میں اپنی طبیعت پر قابو نہیں رکھ سکتی۔"

"تو پھر ان دونوں ہندوستانی لڑکیوں میں سے کسی ایک کے ساتھ تمہارے ٹھہرنے کا انتظام کر دوں گا۔"

(۳)

۸ مئی کی سہ پہر کو نعیم نے برتھا کو بل سائز ایوے نیو پہنچایا، اور اسے کوکب زماں بیگم کے سپرد کیا۔ ان سب لڑکیوں کو آپس میں بے تکلفی سے باتیں کرتے دیکھ کے وہ مسکرا کے اٹھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں

برتھا نے اس کا بوسہ لیا اور نعیم نے بھی اسے چھیڑنے کو آنکھ مار کے کوکب زماں کی طرف اشارہ کیا جس کی علت سیفوی کے قصے وہ ڈاکٹر راجندر کی زبانی سُن چکا تھا۔

اس دن رات کے کھانے پر اسے کراکسلے نے بلایا تھا۔

میری کے بالوں میں اب وہ پہلے کی سی بے ترتیبی نہ تھی۔ اس کے بال بنے ہوئے تھے۔ چھوٹے چھوٹے سنہری حلقوں پر سُرخ رنگ کی چٹیاں تھیں۔ اس نسبت نے اس کے بالوں کے قدرتی حسن تک کو نہ چھوا تھا۔ اس کے چہرے پر اس وقت قیامت کا بھولا پن تھا اور جسم پر ہاتھی دانت کی سی سفیدی تھی۔ وہ نعیم سے بڑے اخلاق سے ملی۔ کراکسلے بھی بہت تپاک سے ملا۔

میری نے اپنے ہاتھ سے اسپاگیتی بنائی تھی۔ اپنے ہاتھوں سے وہ میز پر کھانا لاتی اور بالکل گھریلو بیوی معلوم ہو رہی تھی۔ اور اسی وجہ سے نعیم اپنے آپ کو اور بھی زیادہ اجنبی محسوس کر رہا تھا۔ اجنبی اور خود آگاہ۔ ایک طرح کی غیریت اس کے اور ان دونوں کے درمیان آ گئی تھی۔

اور اس غیریت کی وجہ سے میری اور زیادہ خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔

باتیں بھی ہو رہی تھیں تو اِدھر اُدھر کی۔ موسم کے متعلق، پھولوں کے متعلق، سیاسیات کے متعلق۔ جشن تاجپوشی وغیرہ کی نسبت۔

نعیم نے ہنس کے کہا۔ ''شادی کے بعد تو میری کی سیاسی سرگرمی ذرا کم ہو جائے گی۔ کیوں؟''

میری نے کہا۔ ''ہرگز نہیں، تمہیں معلوم ہے کہ بلباؤ جو جہاز بچوں کے لیے غذا وغیرہ لے کے جا رہا ہے اس کے لیے میں نے کہاں کتنے پاؤنڈ جمع کیے ہیں۔ صرف میں نے چار سو پاؤنڈ جمع کیے ہیں۔ ہم دونوں سوچ رہے ہیں کہ شادی کے بعد کچھ عرصے کے لیے چین جائیں۔ ہسپانیہ کی وجہ سے ہمیں چین کو نہ بھولنا چاہیے۔''

''یہ تو بڑا دلچسپ سفر ہوگا۔'' نعیم نے کہا۔

''میں چین کے متعلق عرصے سے ایک کتاب لکھنا چاہتی ہوں۔'' میری نے کہا۔

نعیم نے کہا۔ ''تم دونوں ہندوستان ضرور آنا۔ اس وقت تک تو میں واپس پہنچ چکا ہوں گا۔''

''تم کب واپس جاؤ گے؟'' کراکسلے نے پوچھا۔

''غالباً آئندہ ستمبر میں۔ لیکن امتحان کے بعد ہی جون میں یورپ کے سفر کا ارادہ کر رہا ہوں۔''

کراکسلے کے چہرے کے اعصاب سخت ہو گئے۔ وہ جانتا تھا کہ یہ نعیم کا دوسرا گریز ہے۔ اب نعیم میری کے اثر سے گریز کر کے سیاحت کے تجربے میں پناہ لینا چاہتا تھا۔

میری نے کہا۔ ''یورپ بھر کے سفر کا؟''

''تقریباً'' نعیم نے جواب دیا۔ ''پہلے ناروے اور سویڈن۔ پھر ڈنمارک۔ پھر فرانس۔''

''نمائش دیکھنے؟''

''ہاں نمائش دیکھنے۔'' نعیم نے جواب دیا۔ ''اس کے بعد میرا اور میرے ایک ہندوستانی دوست ڈاکٹر راجندر کا ساتھ ہو جائے گا۔ انہوں نے ایک نئی موٹر لی ہے۔ مل من۔ وہ اسی پر براعظم کی سیاحت کرنا چاہتے ہیں۔''

''بہت دلچسپ۔''

''ان کے ساتھ جرمنی، چیکوسلاواکیا، آسٹریا اور اٹلی کے سفر کا ارادہ ہے۔''

''بہت دلچسپ سفر ہوگا۔'' میری نے کہا۔ ''ہم لوگ ماہ عسل کے لیے آسٹریا اور چیکوسلواکیہ جا رہے ہیں۔ پراگ میں ہمیں ہروشا نے دعوت دی ہے۔''

''مجھے بھی ہروشا نے بلایا ہے۔''

الغرض اسی قسم کی باتیں ہوا کیں۔ معلوم ہوا کہ کراکسلے کل آکسفرڈ واپس جا رہا ہے اور میری اس کے ساتھ ہی جائے گی۔

(۴)

تاجپوشی سے ایک شام پہلے۔ یعنی ۱۱ رمئی کی شام کو مغربی لندن میں عجب بہار تھی۔ رات کو تو بہت سے راستوں پر موٹر کا گذر موقوف ہو گیا۔ خلقت دریا کی طرح اُمڈی پڑتی تھی۔ بہت سے لوگ تیس چالیس گھنٹے اپنی نشستوں سے ہٹے نہیں کہ جلوس دیکھنے کے لیے پھر جگہ ملے نہ ملے۔

شام کو پانچ بجے کے قریب اسے کراکسلے کی چٹھی ملی۔ مارگرٹ چند گھنٹوں کے لیے لندن میں ٹھہرنے والی تھی۔ رات کو وہ وکٹوریا اسٹیشن سے براعظم جانے والی یعنی ڈنکرک والی ٹرین پر سوار ہونے والی تھی، اب وہ بھی اتنی پکی اشتراکی بن چکی تھی کہ جشن تاجپوشی دیکھنے کا اسے کوئی خاص شوق نہ تھا۔ ورنہ

ایک دن کے لیے وہ لندن میں ٹھہر جاتی۔

چنانچہ شام کو ساڑھے چھ بجے کے قریب مارگرٹ آئی۔ نعیم کے گال کو اس طرح چوما جیسے انگریز بہنیں اپنے بھائیوں کو چومتی ہیں۔

"اچھا ہوا مجھے جیمز کی چٹھی مل گئی۔ ورنہ میں کہیں چلا جاتا۔"

"صرف تم سے نہ ملنے کا افسوس ہوتا نعیم۔" مارگرٹ نے کہا۔ "مگر میں وکٹوریہ اسٹیشن تو بہر حال پہنچ ہی جاتی۔"

"اب کیا پروگرام ہے؟" نعیم نے پوچھا۔

"اپنا سامان تو میں نے اسٹیشن پر رکھ دیا ہے۔" مارگرٹ نے کہا۔ "چلو تو ذرا پکاڈلی میں مجمع کو دیکھیں، پھر کہیں کھانا کھائیں، پھر تم مجھے وکٹوریہ پہنچا دینا۔"

ساڑھے سات بجے کھانا کھانے نعیم مارگرٹ کو لے کے میکسم کے چینی ریسٹوران کی طرف چلا۔ راستے میں ایک جرمن فلم "آلمن کوئے بِگ" کا اشتہار دیکھ کے مارگرٹ ٹھٹک کے کھڑی ہو گئی۔ اس کے چہرے پر ابتدائے شباب کی تازگی تھی۔

"میں ایک مدت سے یہ فلم دیکھنا چاہتی تھی۔" مارگرٹ نے کہا۔

"بہر حال اب تو وقت نہیں۔" نعیم نے کہا۔ "نو بجے تمہاری گاڑی جاتی ہے۔"

"اس لمبے چوڑے سفر سے مجھے نفرت ہے۔ چلو یہ فلم تو دیکھ لیں۔ ریل کے وقت سے پندرہ منٹ پہلے میں نکل آؤں گی۔"

"اور کھانا؟"

"ریل میں کھالوں گی۔ تم کو البتہ تکلیف ہوگی۔"

"نہیں بالکل نہیں۔ لیکن یہ سوچ لو کہ اگر ریل چھوٹ گئی تو لندن میں آج کہیں رات گذارنے کو بھی جگہ نہ ملے گی۔ کل ہی تاجپوشی کا دن ہے۔"

"تو کیا ہوا۔ اس مجمع کی طرح میں بھی ٹہل ٹہل کے ساری رات گذار دوں گی اور پانی تو برسے گا نہیں۔ موسم کے ماہرین اس کی پیشن گوئی کر چکے ہیں۔"

"جیسی تمہاری خوشی۔"

لیکن فلم ختم ہوتے ہوتے ساڑھے نو بج گئے۔ فلم بہت دلچسپ تھا۔ نو کے قریب نعیم نے یاد بھی دلایا تو مارگرٹ نے کہا۔ اس منحوس گاڑی سے مجھے نفرت ہے۔ کل صبح پیرس چلی جاؤں گی۔"

سنیما سے باہر نکلے تو مارگرٹ کو بڑی بھوک لگی تھی۔ اس نے نعیم سے کہا۔ "کسی چھوٹے سے اچھے ریسٹوران میں چلو۔ بڑے ریسٹوران میں تو مجھ سے پیٹ بھر کے کھایا بھی نہیں جاتا۔"

رسل اسکوائر میں ایک چھوٹا سا ریسٹوران تھا۔ بمشکل نعیم مارگرٹ کو وہاں تک لایا۔ وہ بہت تھک گئی تھی۔ رسل اسکوائر میں تازہ کٹ لٹ کھا کے اور گرم پانی پی کے دونوں ذرا تازہ دم ہوئے۔

"چلو اب تمہارے لیے کوئی کمرہ وغیرہ ڈھونڈھا جائے۔" نعیم نے کہا۔

ہر بڑا چھوٹا ہوٹل، ہر بورڈنگ ہاؤس، ہر گھر بھرا ہوا تھا۔ اس زمانے میں اگر لندن کی آبادی دگنی ہوگئی ہو تو تعجب کا مقام نہیں۔ تقریباً سارا انگلستان اپنے بادشاہ کی تاج پوشی دیکھنے کے لیے اُمڈ پڑا تھا اور دنیا کے ہر حصے سے لوگ آئے تھے۔ لندن کی وہ شان تھی جو نہ اس سے پہلے کبھی بغداد کو نصیب ہوئی نہ قاہرہ کو، نہ روم نہ اکبری آگرہ کو اور نہ سینٹ پیٹرگ برگ کو۔ بھلا کوئی کمرہ کیا ملتا۔

اسی تلاش میں ساڑھے بارہ بج گئے اور مارگرٹ تھک کے بالکل چور ہو گئی۔ ایک مکان کے کٹہرے کا سہارا لگا کے وہ یوں کھڑی ہو گئی، گویا اب نیند کے مارے گرنے ہی والی تھی۔

"کاش کرا کسلے کا فلیٹ ہی خالی ہوتا مگر وہ تو اسے بالکل ہی چھوڑ گیا۔" نعیم نے کہا۔ "اب ایک ہی صورت ہے۔ تم میرے یہاں چلو میرا فلیٹ تمہاری نذر ہے۔"

"اور تم؟"

"میں رات بھر باہر پھرتا رہوں گا۔"

"بس چپ رہو۔ یہ کیسے ممکن ہے؟"

"تو پھر اور کیا صورت ہو سکتی ہے۔" نعیم نے پوچھا۔

"تم بھی اپنے فلیٹ میں ٹھہر سکتے ہو۔" مارگرٹ نے ہنس کے کہا۔ "میں تمہیں کھا تو نہیں جاؤں گی۔ میں جیمز سے کہوں گی کہ نعیم مجھ سے اس قدر ڈرتے تھے گویا میں اُنہیں خراب کروں گی۔"

نعیم کو مارگرٹ کی یہ چھیڑ اچھی معلوم ہوئی۔ وہ ہنسا اور کہا۔ "میرے کمرے میں دو پلنگ ہیں۔ اس کے علاوہ میں ڈریسنگ روم میں بھی رات گذار سکتا ہوں۔"

"ایک لمحے کے بعد میں نیند کے مارے گر ہی پڑوں گی۔" مارگرٹ نے کہا اور اس کا شباب سے دمکتا ہوا چہرہ رات کے دھندلکے میں بڑا ہی دلکش معلوم ہوا۔ "چلو!"

اپنا ایک سلیپنگ سوٹ اور ایک ڈریسنگ گون اس نے مارگرٹ کے حوالے کیا اور خود ڈریسنگ روم میں کپڑے بدلنے چلا گیا۔ جب وہ دروازہ کھٹکھٹا کے دوبارہ اندر آیا تو مارگرٹ عجب مضحکہ خیز انداز سے اپنے آپ کو ڈریسنگ گون میں لپیٹے آتشدان کے قریب دراز تھی۔ اس نے ہنستے ہوئے ہاتھ ہلا کے نعیم کو دکھایا۔ قمیض کی آستینیں اس کی انگلیوں سے بھی دو چار انگل بڑی تھیں اور لٹک رہی تھیں۔ ہنستے میں اس کے دانتوں کی چمک، اس کے سیاہ بالوں کی آب و تاب اور اس کے چہرے کی تازگی سے اس مضحکہ خیز لباس کا سارا اثر زائل ہو جاتا تھا۔

"کیوں تمہیں نیند نہیں آ رہی ہے؟" نعیم نے مسکرا کے کہا۔

"تھوڑی دیر بیٹھ کے باتیں کریں۔" مارگرٹ نے جواب دیا۔ "یہ عجیب و غریب احساس ہے۔ ایک کالے رنگ والے نوجوان کے ساتھ، ایک سفید لڑکی ساری رات گذار رہی ہے۔ کرنل بلمپ کو معلوم ہو جائے تو کیا غضب ہو۔"

"تم کو بھی کبھی ہم کالے رنگ والوں سے نفرت رہی ہے؟" نعیم نے پوچھا۔

والدہ کو بہت تھی اور انہوں نے مجھے بھی یہی سکھایا تھا۔ سفید آدمی کا بوجھ وغیرہ وغیرہ مگر جیمز ہمیشہ ان سے لڑتا رہا۔ جیمز کی بین الاقوامیت قدرتی ہے، ہم لوگوں کی حاصل کی ہوئی۔ اور والدہ تو باوجود اس کے کہ تمہارا اتنا خیال کرتی ہیں، اب بھی اپنے تعصب پر غالب نہیں آ سکتیں۔"

"بیچاری مسز کراسلے۔" نعیم نے کہا۔

دفعتاً مارگرٹ نے سنجیدہ ہو کے کہا۔ "کسی کالے رنگت والے آدمی اور سفید لڑکی کی اگر شادی ہو تو یہ حیاتی لحاظ سے مضر ہے نا؟"

"قطعاً نہیں۔ تم نے جولین ہکسلے کی کتابیں پڑھی ہیں؟ ۔۔۔ تم کو معلوم ہے کہ کوئی نسل خالص نہیں۔"

"اور تم ہندوستانی تو ہم لوگوں سے بہت قریب ہو۔ ہاں چینی اور حبشی ذرا مختلف ہیں۔"

"یہ بھی تمہاری جہالت ہے مارگرٹ۔ چینی بھی تمہارے ہی جیسے انسان ہیں۔ پال روبسن کی

رگوں میں بھی شاید تھوڑا بہت سفید خون ہے۔"

مارگرٹ نے چند سیکنڈ کے بعد پھر اسی سنجیدگی سے پوچھا۔ "تم کو میری سے محبت تھی؟"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"مجھ سے جیمز نے کہا تھا۔"

"ہاں کسی قدر محبت تھی تو سہی۔"

"مگر تم کو ایلس سے محبت تھی۔ میں تو سمجھتی تھی کہ ایک سے زیادہ مرتبہ سچی محبت ممکن نہیں۔"

نعیم نے مسکرا کے کہا۔ "میری پیاری لڑکی یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم کہ مجھے سچی محبت کسی کے ساتھ ہوئی بھی یا نہیں۔ شاید مجھ میں سچی محبت کی صلاحیت ہی نہیں۔ مگر اب تک اپنی زندگی میں تین لڑکیاں مجھے ایسی ملیں جن کی وجہ سے میں کئی راتوں نہیں سویا۔ کئی دن پریشان رہا اور سمجھتا رہا کہ ان کا حاصل کر لینا میری زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہے۔"

"ایک ایلس، دوسری میری اور تیسری کون تھی؟"

"تیسری ایک ہندوستانی لڑکی تھی۔ میری چچازاد بہن۔ اس کا نام بلقیس تھا۔"

"اسے بھی تم سے محبت تھی؟"

"غالباً نہیں۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔"

"تو اب ہندوستان واپس ہو کے تم پھر اس سے محبت کر سکتے ہو۔ یا اب تمہیں صرف سفید عورتیں پسند ہیں؟"

"اس کا تو مجھے اقبال کرنا پڑے گا۔ مجھے سفید عورتیں زیادہ پسند ہیں۔"

"مجھے یقین ہے کہ تمہیں اور کوئی نہ کوئی مل جائے گی۔ مگر میری کی وجہ سے تمہیں بہت رنج ہوا۔"

"بہت زیادہ تو نہیں۔ ایلس کی مرتبہ مجھے بہت رنج ہوا تھا۔ اس کے بعد میں اپنی زندگی کے متعلق سوچنے لگا ہوں۔ بے مقصد زندگی، جیسے متوسط طبقے کے تمام نوجوانوں کی ہوتی ہے۔ محنت روپیہ کے لیے، محبت کسی لڑکی کو بیوی بنانے کے لیے۔ اور روپیہ اور بیوی مل جانے کے بعد گھریلو زندگی۔ ہم متوسط طبقے والے وہی کام کس خوش اسلوبی سے کرتے ہیں جسے کیڑے مکوڑے، کتی، گائے بھینس سب کرتے ہیں۔ افزائش نسل، اب میں اپنی گزشتہ چند سال کی زندگی دیکھتا ہوں اور پھر اپنے مستقبل کو دیکھتا ہوں تو مجھ

احساسِ شکست، بجز رکاوٹ کے احساس کے اور کچھ نہیں۔"

"لیکن تم اپنی زندگی میں تو کامیاب رہے ہو۔"

"اسی کامیابی نے تو زندگی کو اس قدر بے مقصد اور بے مصرف بنا دیا ہے — لیکن میری پیاری بچی تم میری بک بک سے تھک گئی ہو گی۔"

"خدا کے لئے مجھے پیاری بچی مت کہو۔ گویا میری عمر سال بھر کی ہے۔ جمو تک تو مجھے عورت سمجھتا ہے اور تم یہ سمجھتے ہو کہ میں ابھی تک ننھی سی بچی ہوں۔"

"مارگرٹ خفا کیوں ہوتی ہو۔ تم بے شک بڑی خوبصورت نوجوان لڑکی ہو۔"

وہ مسکرانے لگی۔ پھر اس نے پوچھا۔ "کیا تمہارے خیال میں میں سچ مچ خوبصورت ہوں؟"

"یقیناً" نعیم نے ہنس کے کہا۔

"کیسے؟"

"کیسے کیا؟"

"یعنی میری کیا چیز خوبصورت ہے؟"

"ٹھہرو۔ میں بتاؤں۔ تمہارے بال سیاہ چمکتے ہوئے ہیں اور تمہاری شفاف جلد پر کھلتے ہیں۔ تمہاری آنکھیں بھوری ہیں، تمہارے دانت ہموار، شفاف اور چمکدار ہیں۔ تم ابھی کم سن ہو اور تمہارے چہرے پر بڑی شگفتگی ہے۔ تمہارا لہجہ بڑا شیریں ہے۔ بس کہ اور تعریف کروں؟ اب جاؤ اس پلنگ پر سو جاؤ۔ یہ دوسرا میرے لیے ہے اور ڈرنا نہیں، دونوں پلنگ کے درمیان آٹھ فٹ کا راستہ فاصلہ حائل ہے۔"

"شب بخیر نعیم۔" کہتی ہوئی مارگرٹ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایک لمحہ کے لیے وہ شب خوابی کے لباس میں الجھی۔ نعیم نے اسے سنبھال لیا۔

"ٹھہرو"۔ اس نے ہنس کے نعیم سے کہا۔ اس کی نوجوان آنکھیں چمک رہی تھیں۔ "مجھے شب بخیر کہنے کا بوسہ تو دو۔"

نعیم نے اس کی پیشانی کو چومنا چاہا۔ مگر سرکشی کر کے اس کے لب نعیم کے سامنے آ گئے۔ سرخ نوجوان لب۔ نعیم کی سراسیمگی پر مارگرٹ کی نوجوان آنکھیں شوخی سے مسکرانے لگیں اور اس کے لب نعیم

کے اور قریب آ گئے۔ اس قدر قریب کہ ایک لحظہ کے اندر دونوں کے لب ایک طلسمی قوت سے ایک دوسرے کے لبوں سے پیوست ہو گئے۔ لحظہ بھر کے بعد نعیم نے محسوس کیا کہ مارگرٹ اس کی آغوش میں ہے۔ اس کے سینے کے مقابل مارگرٹ کا جواں سال سینہ تھا اور مارگرٹ کی گرم گرم سانس اس نے اپنے چہرے پر محسوس کی۔

دفعتاً اس نے اپنے آپ کو چھڑا لیا۔ "مارگرٹ! معاف کرنا۔ تم میرے دوست کی بہن ہو۔ تمہارا جسم میرے لیے مقدس ہے۔"

"مگر کیوں۔ کیا تمہارے ملک میں دوستوں کی بہنیں حرام ہوتی ہیں؟"

"لیکن مجھ پر اعتبار کر کے کراکسلے نے تمہیں یہاں بھیجا ہے۔"

"تمہاری انہی باتوں پر تو مجھے غصہ آتا ہے۔ گویا میں بچہ ہوں اور اپنے بھائی کی ولایت میں ہوں۔"

"تم خفا کیوں ہوتی ہو، مگر مارگرٹ تمہیں کہیں نقصان نہ پہنچ جائے۔ ابھی تم کم سن ہو۔"

"میں سترہ سال کی ہوں۔ معاف کرنا۔ میں نہیں سمجھتی تھی کہ جسمانی حیثیت سے میں اتنی قابل نفرت ہوں، شب بخیر۔"

اس کا ہاتھ پکڑ کے نعیم نے کہا۔ "بے وقوفی کی باتیں نہ کرو۔ تم انتہا درجے خوبصورت ہو۔ اگر تم کراکسلے کی بہن نہ ہوتیں تو میں اپنے آپ کو خوش قسمت تصور کرتا۔"

"اچھا خیر۔ خدا حافظ۔"

وہ اپنے پلنگ پر جا کے لیٹ رہی۔ نعیم نے اسے احتیاط سے کمبل اُڑھایا اور شب بخیر کہہ کے اس کا ہاتھ دبایا۔ پھر اپنے پلنگ کے قریب آ کے روشنی گل کی۔

آدھے گھنٹے کے قریب کروٹیں بدلتے بدلتے گذر گئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ نعیم کے سارے جسم میں کسی نے خون کے بجائے جلتا ہوا سیسہ پگھلا کے بہا دیا ہے۔ اس کی کنپٹیاں خون کی گرمی سے پھٹی جا رہی تھیں۔

بالآخر اس سے نہ رہا گیا۔ وہ اُٹھا۔ اندھیرے میں آہستہ آہستہ وہ مارگرٹ کے پلنگ کی طرف بڑھا اور جھک کے مارگرٹ کی طرف دیکھنے لگا۔ اندھیرے میں بھی اس نے دیکھا کہ مارگرٹ کی آنکھیں

کھلی ہوئی ہیں اور وہ سانس روکے اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔ خوف سے؟ حیرت سے؟ کشش سے؟
اس نے آہستہ سے کہا ''مارگرٹ!''

مارگرٹ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ دیوار کی طرف کھسک گئی اور نعیم کے لیے جگہ کردی۔ نعیم بلانکٹ کے اندر آ گیا۔ بے تابی سے اس نے مارگرٹ کا بوسہ لیا۔ اس نے اپنے جسم کو مارگرٹ کے جسم سے لپٹتے محسوس کیا۔ مارگرٹ کے پستان چھوٹی اور فولاد کی سی سخت ناشپاتیوں کے سے تھے۔ اس کا ہاتھ اِدھر اُدھر پھرتا رہا اور تھوڑی دیر کے بعد اس نے اپنے جسم پر بھی مارگرٹ کی انگلیوں اور لانبے نوکدار ناخنوں کی سرسراہٹ محسوس کی۔ اور جب مارگرٹ کا سانس زور زور سے چل رہا تھا تو اس نے کہا۔ ''مارگرٹ ہم دونوں بوس و کنار سے آگے نہیں بڑھیں گے۔ میں تمہارا کنوارا پن اگر تم سے چھینوں گا تو ہمیشہ میرا دل مجھے ملامت کرے گا کہ میں نے جیمز اور میری کا بدلہ تم سے لیا۔''

مارگرٹ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خود بھی شاید حد سے زیادہ نہ بڑھنا چاہتی تھی۔ انگریز لڑکی ہمیشہ ڈرتی ہے کہ کہیں سانولا بچہ پیدا ہوا تو کیا ہوگا؟''

اسی طرح ایک دوسرے کی آغوش میں رات گذر گئی اور صبح کی روشنی میں نعیم نے مارگرٹ کا عریاں جسم دیکھا جو کسی یونانی مجسمے کی طرح خوبصورت تھا۔ رات بھر کے ضبط سے نعیم کے اعصاب بالکل جواب دے چکے تھے مگر اسے اس کی خوشی تھی کہ وہ اس امتحان سے کامیاب گذر چکا۔ اب اسے کرا کسلے یا اپنے ضمیر سے شرمانے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

(۵)

جشنِ تاج پوشی کے دن صبح کو نہ مارگرٹ جلوس دیکھنے گئی نہ نعیم۔ بادشاہوں اور فوجوں کے قطار در قطار جلوس کا حال دوسرے دن اخبارات میں شائع ہوا۔ صبح کو ناشتے کے بعد مارگرٹ نعیم کو بودلیر کے ''بدی کے پھول'' سناتی رہی اور پھر کلادل اور لافورژ وغیرہ کا کلام۔ اسی بحث مباحثے میں کھانے کا وقت آ گیا۔ بحث و مباحثہ اور شاعری اور بوس و کنار سے دونوں تھک گئے تھے اور شام کو نو بجے تک مارگرٹ کو بھی کوئی کام نہ تھا۔ لنچ ان دونوں نے رسل اسکوائر کے ایک زمین دوز تہ خانے والے ریستوران میں کھایا۔ ان کے علاوہ دو چار نیم اشتراکی خطرۂ اشتمالیت اور بھی وہاں تھے۔ ورنہ ہر طرف سناٹا تھا۔

اپنے فلیٹ میں واپس آ کے نعیم نے مارگرٹ کے لیے بستر آراستہ کیا اور اسے بلانکٹ اڑھا کے

اور شفقت سے اس کے لبوں کو چوم کے گھومنے کے لیے باہر چلا گیا۔ مارگرٹ کو نیند کی سخت ضرورت تھی کیونکہ ریل میں اسے نیند نہیں آتی تھی اور آج کی رات ریل میں گذارنی تھی۔

لسسر اسکوائر اور چیرنگ کراس روڈ پر مجمع کو دیکھتا ہوا نعیم اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا رہا۔ اس نے انگلستان کی اشتمالی جماعت کا اخبار ''ڈیلی ورکر'' خریدا اور تاجپوشی کے متعلق دست چپ کے ادیبوں کا لکھا ہوا ایک رسالہ۔ مجمع سے ہٹ کے وہ پھر خاموش گلیوں سے ہوتا ہوا، برنرڈ شا، ڈے لیوس، ہال ڈین، ہیری پالٹ کی رائیں ڈیلی ورکر میں پڑھتا ہوا، تاجپوشی کے متعلق ان سب کے خیالات سے متاثر ہوتا ہوا گھر پہنچا۔

مارگرٹ منہ ہاتھ دھو کے چائے بنا رہی تھی۔ اس نے ایک گرم پیالی ایک بوسے کے ساتھ نعیم کے حوالے کی۔

شام کو نعیم مارگرٹ کو وکٹوریہ اسٹیشن پہنچا آیا۔ بادشاہ کی تاج پوشی کی تقریر سُنی اور ڈیلی ورکر میں برنرڈ شا اور ہال ڈین کے بیانات پڑھتا ہوا سو گیا۔

(۶)

تمام امتحانات سے فارغ ہو کے نعیم اسکاٹ لینڈ چل دیا۔ ۲۸ مئی کو میری اور جیمز کرا کسلے کی شادی تھی۔ دونوں نے نعیم کو اس شادی میں بڑی گرم جوشی سے مدعو کیا تھا لیکن وہ اس میں شریک نہیں ہونا چاہتا تھا۔ لندن کے قیام کے دوران میں ایک بار سینٹ جیمز پیلس میں اس نے ایک شادی کا کچھ منظر دیکھا تھا۔ وہ سڑک پر ٹیلیفون کے ڈبے کے پاس کھڑا تھا۔ صبح کا کوٹ پہنے لوگ شادی کی دعوت استقبال میں شریک ہو کے واپس آ رہے تھے اور بالآخر ایک موٹر پر دولھا دلہن تیزی سے نکلے، ہنستے ہوئے۔ دلہن سفید لباس میں بڑی ہی خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔ موٹر کے پیچھے نیک شگون کے لیے ایک جوتا بندھا ہوا تھا۔ وہ ''گلِ سُرخ'' کو اس سفید ملبوسِ عروسی میں نہیں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کرا کسلے کے ساتھ اسی طرح موٹر میں ماہِ عسل کے لیے روانہ ہو، اور موٹر کے پیچھے جوتا بندھا ہو۔

(۷)

۲۸ مئی کا لکھا ہوا ہیروشا کا ایک خط اسے اڈنبرا میں ملا۔

''بخاوسٹ۔ رومانیا۔ ۲۸ مئی

محبی نعیم!

جس مقام سے میں یہ خط لکھ رہا ہوں اس کا نام پڑھ کے زیادہ متحیر نہ ہونا۔ میں برطانیہ عظمیٰ سے ذرا زیادہ فاصلے پر ہوں اور تمہارے ملک سے ذرا زیادہ نزدیک۔ مجھے افسوس ہے کہ میں چیکوسلاویکیہ میں خود تمہارا استقبال نہ کرسکوں گا مگر اپنے دوستوں کو میں نے لکھ دیا ہے۔ یورپ کا سفر ضرور کرنا۔ شاید تم یہاں بھی آسکو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ یہاں کی عورتیں بڑی لاجواب ہوتی ہیں۔ سیاہ بالوں والی اور گرم۔ مگر تم جانتے ہو کہ میرے لیے تو یہ بالکل بے کار ہے۔ امید ہے کہ تم اپنے امتحانات میں کامیاب ہوگے۔

تمہارا مخلص دوست

زیدنک ہروشا''

✓

چودھواں باب

آوارہ گردی

یولی سیز نے پھر سفر کا پرچم کھولا۔ جادوگرنیوں کے جزیروں کا رخ کیا اور متلاطم سمندروں میں اپنی کشتی بڑھاتا چلا گیا۔ ٹرائے کے ماحول سے گریز کرنے کے لیے سند باد جہازی کے بادبان پھر ہوا میں لہرائے۔ نئی اقدار کی تلاش کے لیے مارکو پولو کو پھر سیاحت کی تڑپ بیقرار کرنے لگی۔ یہ یورپ جو دیا سلائی کی طرح سلگ اٹھنے کو تھا ذرا دیکھا تو جائے کہ یہ ہے کیا۔ یہ کرا کسلے اور ہروشا کا یورپ۔ یہ برتھا اکسل من اور میری پاول کا یورپ۔ جس میں خودی موج بھی بن سکتی تھی، چٹان بھی، ابر بھی، طوفان بھی۔

وہیلوں کی شاہراہ بیوولف کی آزمائی ہوئی تھی۔ اس کے سینے کو روندتی ہوئی رائکنگ کشتیاں سر اٹھائے ہوئے کولمبس سے پہلے نئی دنیا کے ساحلوں تک پہنچیں۔ ناروے کا ساحل بڑا خوبصورت ہے۔ کہیں بھوری چٹانیں سمندر میں جزیرے اور جزیرہ نما اور خاکنائے بناتیں، کبھی سمندر اندر گھس کے نہر یا جھیل یا دریا بن جاتا۔ زمین اور پانی کی ہزار ہا سال کی لڑائی کا اس سے اچھا نقشہ شاید ہی کہیں کھینچا گیا ہو۔

اور ناروے کے شہر بڑے خوبصورت ہیں۔ برگن، پہاڑوں کی آغوش میں سمندر کے ساتھ ساتھ پھیلا ہوا ہے۔ اس کی عمارتوں کا حسن، اس کی عورتوں کا ہاتھی دانت کا سا رنگ اور سنہرے بال، اس کے مردوں کے دراز قد۔ پھر ناروے کا سفر، ناروے کے پہاڑ جیسے ریڑھ کی ہڈی، ہر وادی ایک چھوٹی سی جھیل۔ پہاڑ بنجر بھورے، سرد ہیبت ناک اور خوبصورت۔

اور ایک جھیل میں نعیم نے آنکھیں مل کے دیکھا تو اسے بلقیس کی تصویر نظر آئی۔ معلوم نہیں کتنے دنوں سے یہ تصویر عشق کے شعور نامحسوس میں چھپی ہوئی تھی۔ اسے خود حیرت ہوئی۔ کہاں روس کی اس جھیل کا شفاف پانی اور کہاں بلقیس کی تصویر۔

اوسلو۔ اور سب شہروں کی طرح جدید اور پاک صاف اور بارونق، پاجامے پہنے فستق اور دوڑتی ہوئی لڑکیاں۔ اس قدر نسوانی حسن۔ نیلی آنکھیں اور سنہری بال۔

اور درامن۔ پہاڑی سے اس ندی کا نظارہ جو قصبے سے ہو کر گذرتی ہے۔ فیورڈ گستاخ سمندر کا پنجہ جو خشکی میں اتنی دور گھس آیا ہے۔ اور درامن میں اسی پہاڑ پر جنوبی افریقہ کے رہنے والے انگریز لڑکے نے ہمدردی کے لہجے میں کہا کہ جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں سے سخت تعصب برتا جاتا ہے۔ اس وقت رات کے بارہ بجے تھے مگر رات نہیں آئی تھی۔ صرف شام کا دھندلکا تھا۔ ناروے کے بہت سے حصوں میں دن رخصت ہی نہیں ہوتا۔ یہاں دن تو رخصت ہو گیا تھا۔ شام آئی بھی مگر رات نہ آنے پائی۔ جب قطب شمالی سے برف کی سانس بڑھتے بڑھتے یہاں آئے گی تو شاید دن کے بارہ بجے بھی شام ہی رہے گی۔

اور اشتوک ہولم۔ برتھا اکسل سن کا وطن۔ بوسوں کے وقت اس کے سنہرے بال نعیم کی پیشانی اور کانوں کو ریشم کی طرح نرم معلوم ہوتے تھے۔ یہ اشتوک ہولم، یہ سات جزیروں والا شہر، دنیا کے حسین ترین شہروں کا تاجدار جہاں جھیلیں سمندر سے ملتی ہیں۔ جہاں پُل جزیروں کو جزیرہ نما بناتے ہیں۔ جہاں انوکھے طور پر سجے ہوئے قہوہ خانوں میں حسین لڑکیاں خادماؤں سے ہنس ہنس کے باتیں کرتی رہتی ہیں اور اجنبیوں کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتیں۔ اس قہوہ خانے میں فرنیچر بھی سرخ تھا اور دیواریں بھی سرخ، اور خادماؤں کا لباس بھی سرخ تھا۔

اسی اشتوک ہولم میں ایک پناہ گزین یہودی تھا۔ جرمنی، آسٹریا، چیکوسلاویکیہ کا رہنے والا۔

مسلمان کے متعلق اقبال نے لکھا ہے۔ گھر تیرا نہ دلی نہ بخارا نہ سمرقند۔ کاش مسلمان بھی اسی طرح ہر شہر میں کچھ جائداد پیدا کر لیتا۔

ساتھ ٹہلتے ٹہلتے اس ساٹھ سال کے تجربہ کار عالم، سیاسی یہودی نے کہا۔ "یہ دنیا سمندر کی تہ میں بیٹھے گی۔" اشتوک ہولم پر بڑی آب و تاب سے سورج چمک رہا تھا۔ اسکانسن سے شہر کے پلوں کا نظارہ دلفریب تھا۔ بوڑھے یہودی نے پھر وہی رٹ لگائی۔ "یہ دنیا سمندر کی تہ میں جا بیٹھے گی۔" "کیا جب آفتاب گرم ہو جائے گا تو اشتوک ہولم کو بھی آگ لگ جائے گی۔ فاشزم، قومی اشتراکیت، جمہوریت، بین الاقوامیت، بم، ہوائی جہاز، آتش سیال۔ یہ کیا لطیفہ ہے کہ مشرق میں آتش سیال شراب کو کہتے ہیں۔" "تم ہندوستان میں رہتے ہو۔ تم لوگ اس قدر زیادہ متاثر نہ ہو گے۔ مگر ہم لوگ تو یورپ میں ہیں۔ تمدن کے قلب میں۔" "کیا قلب کی حرکت بند ہو جائے گی؟ خدا کرے ایسا ہو۔ مگر کیا اس کے بعد ماسکو اور حیدرآباد کی نبض چلتی رہے گی؟ نعیم اپنے دل میں سوچنے لگا اور پھر بوڑھے یہودی نے اپنی تقریر ختم کرتے ہوئے کہا۔ "یہ دنیا سمندر کی تہ میں جا بیٹھے گی۔"

پھر اشتوک ہولم میں آدھی رات کو ایک ایکٹرس کے چھوٹے چھوٹے پستان اور بے لطف بوسے۔ اور ایک نرس جس نے جھیلوں کی سیر تو کرائی مگر ایک بوسہ تک نہ دیا۔ وہ دکان جہاں کسی زمانے میں گریٹا گاربو نوکر تھی۔ سویدستانی بادشاہوں کی قبریں۔ گستاف ثانی کا بنایا ہوا ایک تھیٹر۔ اس بادشاہ کو بھوکی رعایا نے مار ڈالا تھا۔ جھیل کے کنارے اب بھی یہ تھیٹر خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ معلوم نہیں حسن ہمیشہ سرمایہ داری کی طرف داری کیوں کرتا ہے۔

کوپن ہاگن یا کابن ہاون جہاں سمندر کے کنارے ایک سیاہ جل پری بیٹھی دور دراز کے سفید بادبانوں کو دیکھتی رہتی ہے۔

(۲)

بلجیم جسے ایک جنگ نے تباہ کر دیا تھا۔ انٹورپ یا آنورس۔ ایک دو سڑکوں کے سوا کچھ نہیں۔ لڑکیوں کے ہلکے زرد بال، ایک نائٹ کلب، ایک حسین ماندی مزدور لڑکی۔ نقلی فیشن ایبل سائے میں ناچتے ہوئے اس نے نعیم سے کہا جو خاموشی اور لاپروائی سے اس کے ساتھ ناچ رہا تھا۔ "واہ مسیو! کیا شان استغنا ہے۔"

(۳)

پھر ریل۔ اور عروس البلاد پیرس۔ بین الاقوامی نمائش۔ سین میں فواروں کی پھلجھڑیاں۔ ہر ملک کا نمائش

خانہ۔ اس ملک کی سیاحت کے لیے ایک اشتہار۔ روس اور جرمنی کے نمائش خانے آمنے سامنے، بلند اور شاندار۔ روس کی نمائش گاہ پر ایک مرد اور ایک عورت درانتی اور ہتھوڑا لیے ہوئے۔ مقابل کے جرمن نمائش خانے پر جرمن عقاب ایک شان بے نیازی سے گردن موڑے ہوئے اور جرمن نمائش خانے کے اندر، گویا در و دیوار سے ابلتی ہوئی فوجی موسیقی۔ بوڑھے یہودی نے تو کہا تھا کہ "یہ دنیا سمندر کی تہ میں جا بیٹھے گی۔"

(۴)

ڈاکٹر راجندر کے ساتھ۔ وہ اپنی موٹر یورپ بھر پھرا کے ہندوستان لے جانا چاہتے تھے۔ پہلے دن پیرس سے شواسون۔ فوجی قبرستان اور انگوشہ رڈوما کا مکان۔

صبح سے لے کے ڈیڑھ بجے تک بروسلز کی سیر۔ سوائے عجائب خانوں، تصویروں اور مجسموں کے اس شہر میں ہے ہی کیا۔ غلیظ سڑکیں، ناخوشگوار صورتیں اور لاریاں۔ پھر انٹورپ، ولندیزی سرحد۔ ہالینڈ کے میدان، پانی، پھول، سڑکیں اور یورپ بھر میں سب سے زیادہ خوشنما مکانات، ولندیزی مناظر۔ ہوا سے چلنے والی چکیاں۔ سمندر پر پُل۔ ایشیائیوں سے کچھ کچھ تعصب۔ یوٹرخت اور جرمن سرحد۔

(۵)

ڈوسل دورف۔ بون۔ بیت ہووون کی پیدائش گاہ۔ اور بون کا مشہور و معروف نظر، اواخر جولائی میں دریائے رہائن کا جوبن، کوبلنس، جہاں دو ندیاں ملتی ہیں، جہاں کا قلعہ رہائن کے تمام قلعوں کا سرتاج ہے اور جہاں کے کشتیوں کے پل کے منظر کو آنکھ ایک بار دیکھ لے تو دل کبھی نہیں بھول سکتا۔ رات سینٹ گوا میں۔ پھر اسی لڑکی سے ملاقات جس نے اس سے پہلے سفر میں کراکسلے کے لیے پرانا جرمن گیت گایا تھا۔

ہائیڈل برگ۔ روزا۔ روزا کے ساتھ ہٹلر کی بنائی ہوئی ورزش گاہ پہاڑوں اور آہستہ خرام نیکر کے اس پس منظر میں کتنی بھونڈی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن روزا کی کمر میں ہاتھ حمائل کر کے، کسی پہاڑی راستے پر اسے اپنی طرف کھینچو تو اس کی گرم سانس میں اور پہاڑ کے صنوبروں کی ٹھنڈی سانس میں کتنا فرق معلوم ہوتا ہے۔

بادن بادن میں امیر مریضوں کا ہجوم۔ گھوڑوں پر خوبصورت فیشن ایبل لڑکیاں۔ ایک کا گھوڑا لڑکھڑایا تو نعیم نے مسکرا کے کہا۔ "اتاں سیاں (ہوشیار) مدموزیل۔" وہ مسکرا کے آگے بڑھ گئی۔

سیاہ جنگل۔ شوارتس والڈ۔ صنوبروں اور پہاڑی درختوں میں بل کھاتی ہوئی خطرناک موڑوں سے گذرتی ہوئی سڑک فرائی برگ کی یونی ورسٹی میں تعطیلات کے کورس کے لیے انگریز طالب علموں کی کثرت۔ ٹی ٹی زی کے کنارے چائے۔ لنڈوگس ہافن سے بوڈن زی کا نظارہ۔ یہ بڑی سی مچھلیوں سے بھری نیم خوبصورت جھیل، جہاں تین ملکوں کی سرحدیں ملتی تھیں۔ فریدرشس ہافن میں زیپلن کا کارخانہ۔ لنڈاؤ کی گلیاں، اُلم سے بھی زیادہ نم اور سرد۔

ہوہن شاون کا قلعہ اور شنی زی کے کنارے دوپہر کا کھانا۔ بویریا میں پہاڑوں سے میدان کی طرف اتار۔ میون شن سے پہلے اشتارن برگرزی جس کو نعیم محض اس لیے دیکھنا چاہتا تھا کہ ٹی ایس۔ ایلیٹ نے "خراب آباد" میں اس کا ذکر کیا ہے۔ کچھ لڑکیاں اس جھیل میں نہا رہی تھیں۔

میونشن۔ انگولڈ اشٹاٹ میں نیلی ڈینیوب کا رنگ مٹیالا ہے۔ نیوزن برگ قرونِ وسطیٰ کی محفوظ یادگار۔ قرون وسطیٰ کے جیسے مکانات، کلیسا، اور بازار۔ نازی جرمنی کی رومانیت کا مرکز۔

رات۔ بارش۔ ممبر سیمنٹ کی سڑک پر اُمنڈ اُمنڈ کر آتی تھی اور موٹر کی روشنی میں چمکنے لگتی۔ اس طرح واگنر کے مولود و مسکن بے رایت پہنچے۔

چھوٹا سا خوبصورت بویریائی قصبہ۔ مکان، سڑک، جیسے سب بویریائی تمدن کی یادگار اور ان میں سب سے ممتاز واگنر کا مکان۔

ہٹلر کی بنائی ہوئی سڑکیں۔ رائشس آٹو بان۔ سیمنٹ کی سفید، عریض، مسطح فوجی سڑکیں، میدانوں، غیر دلچسپ منظروں سے گذرتی ہوئی۔ مگر آنے کی سڑک الگ، جانے کی الگ، ساٹھ ستر میل سے کم رفتار سے جانے میں کوئی لطف نہیں۔ ڈاکٹر راجندر، لائپزگ پہنچتے پہنچتے چور چور ہو گئے۔

اور لائپزگ۔ معلوم نہیں امریکہ کا یہ چھوٹا سا شہر کس نے جرمنی میں لا کے رکھ دیا۔ جدید اور غیر دلچسپ۔

برلن میں ایک ہفتہ۔

پوتس دام میں قصر ساں سوسی۔ والیٹر کا کمرہ۔ فریڈرک اعظم اور والٹیری کی دوستی کی یادگار۔ اس کمرہ کی دیواروں کی نقاشی۔ پوتس دام کے باغ خوبصورت ہیں اور واں زی ان سے زیادہ خوبصورت۔

(۶)

لیکن برلن سے ورسیدن جاتے ہوئے سڑک پر ایک عجیب حادثہ پیش آیا۔

ڈاکٹر راجندر موٹر چلاتے چلاتے تھک گئے تھے۔ ایک گاؤں سے کوئی دو میل آگے انہوں نے موٹر روکی۔ قریب ہی سڑک کا ایک بڑا موڑ تھا۔ ایک کھیت میں جو بالکل ویران تھا۔ ایک درخت کے نیچے بیٹھ کے ڈاکٹر راجندر اور نعیم باتیں کرنے لگے۔ قریب ہی ایک گھوڑے کی لید پڑی تھی۔ راجندر نے سمجھانا شروع کیا۔ ٹائی ٹنس کے جراثیم اکثر گھوڑے کی لید میں پائے جاتے ہیں۔ انہوں نے ایک قصہ بیان کیا کہ لکھنؤ میں ایک لڑکے کی ٹائی ٹنس سے بری حالت تھی اور انہوں نے کس طرح اس کا علاج کیا۔ پیچھے سڑک پر سے موٹریں گذر رہی تھیں۔ زیادہ تر جرمنی کی موٹریں لیکن گاہے گاہے چیکوسلاوکیہ کی، پولینڈ کی، آسٹریا کی، برطانیہ عظمیٰ کی اور فرانس کی موٹریں بھی۔

وہ کھیت سے اپنی موٹر کی طرف آ ہی رہے تھے کہ انہوں نے دیکھا کہ ایک جوان لڑکی ایک موٹر سائیکل پر سامنے سے چلی آ رہی تھی۔ موڑ پر تیزی کی وجہ سے وہ اپنے موٹر سائیکل کو سنبھال نہ سکی۔ موٹر سائیکل پہلے ایک درخت سے ٹکرائی، پھر دوسرے درخت سے، اور پھر لڑکی اس میں الجھ کے گر پڑی۔

راجندر اور نعیم دوڑ کے قریب گئے تو عجیب منظر دیکھا۔ موٹر سائیکل اس لڑکی کی دونوں ٹانگوں کے درمیان پھنسی ہوئی تھی۔ راجندر نے اسے ہٹایا تو ایک ٹانگ بالکل قیمہ تھی۔ لڑکی بے ہوش پڑی تھی اور اس کے منہ سے خون بہہ رہا تھا۔

انگریز سیاحوں کی ایک گاڑی پیچھے سے آ رہی تھی۔ انہوں نے گاڑی روک لی۔ ان کے پاس فوری طبی امداد کا کچھ سامان تھا۔ انہوں نے ڈاکٹر راجندر کی مدد بھی کی۔ لڑکی کا سانس اکھڑ چکا تھا۔

ایک موٹر جو اس موٹر سائیکل کے آگے آگے جا رہی تھی، اب واپس پلٹی۔ اس میں سے ایک نوجوان جرمن اترا، موٹر سائیکل چلانے کے لباس میں تھا۔ راجندر نے نعیم سے کہا۔۔۔ "دیکھو اس لڑکی کے ہاتھ میں نسبت کی انگوٹھی ہے۔ غالباً وہ اس نوجوان سے منسوب تھی۔ ضد کر کے موٹر سائیکل پر سوار ہوئی۔ حالانکہ وہ معمولی سا یہ پہنے ہوئے ہے۔"

اس سے پہلے نعیم نے کسی عورت کو اس طرح خاک اور خون میں آلودہ نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اس درمیان میں اس جرمن نوجوان کی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔ ایک دو بار اس درد سے کراہا کہ نعیم نے

پلٹ کے اسے سمجھایا کہ ڈاکٹر راجندر اچھے خاصے ڈاکٹر ہیں۔ جو امکان میں ہو گا کریں گے۔

مجمع بڑھتا جا رہا تھا۔ لیکن اس اثنا میں لڑکی پر موت کی زردی چھا گئی۔ گاؤں سے پولیس کا آدمی اور ایک ڈاکٹر بھی آ گیا۔ جرمن ڈاکٹر نے اس لڑکی کے قلب کا معائنہ کیا۔ وہ مر چکی تھی۔

جرمن نوجوان کی حالت کچھ عجب مجنونوں کی سی ہو گئی۔ وہ پچھاڑیں کھانے لگا۔ ممکن ہے وہ اور یہ لڑکی دونوں ورسیدن شادی کرنے کے لیے جا رہے تھے۔

لوگ اسے سنبھالنے لگے۔ راجندر نے نعیم سے کہا۔ "معلوم نہیں اب ہمیں کب تک یہاں ٹھہرنا پڑے۔" لیکن پولیس کا آدمی اس عرصے میں حادثے کی تمام کیفیت کا مطالعہ کر چکا تھا۔ اس نے ڈاکٹر راجندر کا شکریہ ادا کر کے کہا۔ "اب آپ لوگوں کو ٹھہرنے کی ضرورت نہیں۔"

اس حادثے کی ہیبت نعیم پر دن بھر رات بھر طاری رہی۔ زندگی کا ایک اصلی، غیر معمولی واقعہ اور تمام افسانوی نقوش باطل معلوم ہونے لگے۔ یہ زندگی کا ڈرامہ تھا۔ ایک منٹ کے اندر انسانی جسم کی شکست، چند لمحوں میں موت۔ برتھا اکسل سن کی ہرجائی نگاہوں، ایلس کی وفا اور بے وفائی، بلقیس کے متعلق شاعرانہ تخیلات، میری پاول کے عشق، کرا کسلے اور ہروشا کی دوستی، خانم کی دنیاداری سب کھیل تھے۔ مگر قدرت کے اس معمولی کھیل کے سامنے ہیچ۔ ایک سواری سنبھل نہ سکی، اور جوشِ حرکتِ حیات ہمیشہ کے لئے خاموش۔ اور زندگی کی ساری دلچسپیاں کیا ہیں؟ اس خاموشی اور اس خاتمے کو بھول جانے کی ناکام کوششیں۔ تمام عشق محض افزائشِ نسل اور افزائشِ نسل کا انجام فنا۔ انسان جب اپنے آپ کو حیوان سمجھنے سے انکار کرتا ہے، موت اسے سمجھا دیتی ہے۔

ورسیدن کا حسنِ فراواں بھی اس ہیبت کو زیادہ نہ گھٹا سکا جو اس حادثے کو اپنے سامنے پیش آتے دیکھ کے نعیم کے دل پر طاری ہو گئی تھی۔ رات بے چینی سے گذری۔

(۷)

دریائے ایلب سے ورسیدن بڑا خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ تعمیر میں بڑی خوش مذاقی اور تناسب سے کام لیا گیا ہے۔ تسونگر گیلری میں امریکنوں کا ہجوم تھا۔ رافائیلو کی ورسیدن میڈونا (مریم) اتنی ہی خوبصورت نکلی جتنی نعیم کو امید تھی۔ اس میں "اندریا دل سارتو" کی تصویریں نعیم کو بہت پسند آئیں۔

دوپہر کا کھانا کھا کے دونوں دوست پراگ روانہ ہوئے۔ چیکوسلاوکیہ کی سرحد پر کوئی خاص مشکل

پیش نہ آئی۔ سرحد کی سوڈیتان پہاڑیوں پر سڑک بہت خراب تھی۔ اس کی وجہ نعیم کو پراگ پہنچ کے معلوم ہوئی۔ چیکوسلاویکیہ کو جرمنی کے حملے کا سخت اندیشہ تھا۔ اسی لیے سرحد کے قریب سڑکیں اس حالت میں رکھی گئی تھیں کہ دشمن کو نقل وحمل میں دقت ہو۔

پراگ کا پہلا منظر ذرا مایوس کن تھا۔ ایک عامیانہ سا شہر۔ صرف ایک سڑک ذرا خوبصورت تھی۔ لوگ جرمنی کے مقابل بھوکے معلوم ہوتے تھے۔

ہروشا کے پراگ میں نہ ہونے کا نعیم کو بڑا احساس تھا۔ لیکن ہروشا کی ایک دوست اولگا ہرے بک، جس کے نام کا تلفظ صحیح طور پر ادا کرنے میں نعیم کو کبھی کامیابی نہ ہو سکی۔ دوسرے دن صبح کے نو بجے نعیم کو شہر کی سیر کرانے لگی۔ ندی کا پل خوبصورت تھا۔ قلعے کے قریب ایک چھوٹا سا کلیسا ہے، جس کے متعلق یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کے مکان کی نقل ہے۔ قلعہ بھی اچھا خاصا خوبصورت ہے اور واپسی میں اولگا نے پراگ کی گلیاں اور چھوٹے چھوٹے مکانات دکھائے۔ یہ عجیب بات ہے کہ بڑے شہروں کی بڑی بڑی سڑکوں اور عمارتوں میں زیادہ فرق نہیں ہوتا لیکن ہر گلی میں بڑی انفرادیت، بڑا انوکھا پن ہوتا ہے۔

دوپہر کا کھانا نعیم نے ہروشا کے والد کے یہاں کھایا۔

کھانے پر اور بھی مہمان تھے۔ کون؟ میری پاول جواب مسز کراکسلے بن چکی تھی، اور جیمز کراکسلے۔ یہ دونوں ماہ عسل گذارنے یہاں آئے تھے اور ہروشا کے گھر مہمان تھے۔

نعیم پر ایک جنون طاری ہونے لگا۔ باوجود میری اور جیمز کے انتہائی التفات کے وہ ان سے دُور، بہت دُور بھاگنا چاہتا تھا۔ گویا انہوں نے اسے دھوکا دیا تھا۔

چائے اس نے اولگا کے ساتھ ایک ایسے قہوہ خانے میں پی جو ایک بہت بلند چٹان پر ندی کے کنارے واقع ہے اور جہاں سے ندی کا منظر بڑا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اولگا چیکوسلاویکیہ کے سیاسی حالات سمجھانے لگی۔ وہ خود سلوواک تھی۔ لیکن ایک سوڈیتن جرمن سے اسے عشق تھا۔ اس نے کہا ”اس لیے میں جرمنوں کے خلاف زیادہ نہیں کہہ سکتی۔“ لیکن اسے بھی جرمن حملے کا اندیشہ تھا۔ سوڈیتن جرمن ابھی آہستہ آہستہ منظم ہو رہے تھے اور اگرچہ ابھی تک ہٹلر نے آسٹریا پر قبضہ نہیں کیا تھا لیکن جرمنی برابر چیکوسلاویکیہ کی جرمن آبادیوں میں ریشہ دوانیاں کر رہا تھا۔ اولگا نے برسبیل تذکرہ کہا کہ

پراگ کو دراصل جرمنوں ہی نے فروغ دیا ہے۔ اور یہاں کی جرمن بولی بڑی خالص سمجھی جاتی ہے۔ اگرچہ اب سب لوگ چیک زبان میں بات کرتے ہیں اور جرمن زبان کو پسند نہیں کرتے۔

پراگ میں ڈاکٹر راجندر کو گرٹروڈ سیم سن مل گئی۔ غازی الدین کی پستہ قد دوست۔ وہ رات کو اسے کسی رقص گاہ میں لے گیا۔ صبح کو نعیم کو معلوم ہوا کہ وہ بھی ان دونوں کے ساتھ وی آنا چل رہی ہے۔

سفر بڑا دلچسپ رہا۔ گرٹروڈ سامنے کی نشست پر راجندر اور نعیم کے درمیان بیٹھی۔ راستے میں کئی جگہ رُک رُک کے ان لوگوں نے تصویریں لیں۔ گرٹروڈ کبھی راجندر کی طرف زیادہ ملتفت ہوتی کبھی نعیم کی طرف۔ کبھی ایک کی کمر میں ہاتھ حمائل کرتی کبھی دوسرے کے ہاتھ میں۔

شام کو آسٹریا کی سرحد آئی۔ اور وی آنا پہنچتے پہنچتے رات ہو گئی لیکن اس شہر کا پہلا منظر ہی ایسا تھا کہ راجندر، جن کو اس سفر نے شل کر دیا تھا، باغ باغ ہو گئے۔ وسط یورپ کی یہ ملکہ روشنیوں میں نہا رہی تھی۔

ایک چھوٹے سے ہوٹل میں یہ لوگ ٹھہرے۔ کھانا کھایا۔ نعیم اپنے کمرے میں چلا آیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے باہر قدموں کی چاپ سنی اور دیکھا کہ راجندر گرٹروڈ کے کمرے کی طرف جا رہا ہے۔ دروازہ کھلا اور وہ کمرے کے اندر غائب ہو گیا۔

(۸)

ڈاکٹر راجندر نے اپنی راہ لی اور نعیم وی آنا میں ٹھہر رہا۔ یہ رقص اور موسیقی کا شہر۔ یہ عمارتوں اور عورتوں کے جمال و شباب کا شہر۔ نعیم کو ایک لحاظ سے یہ پیرس سے بھی زیادہ پسند آیا۔ اس کی نیم دائرے اور دائرے کی سی وسیع سڑکیں۔ اس کا کلیسا، اس کے کنارے پہاڑ، اس کے اطراف جنگل، اس کے متصل نیلی ڈینیوب، یہ شہر جہاں صدیوں تک ہاپس برگ شہنشاہوں نے اس شان و شکوہ کے ساتھ حکومت کی۔ جس کی فصیلوں تک دو بار ترکی فتوحات کا سیلاب آیا اور اتر گیا۔ یہ وسط یورپ کا پیرس۔ یہ پیرس اور شیراز کا مجموعہ۔ یہاں کے باشندے خلیق۔ یہاں کی عورتیں حسین۔ یہاں کی موسیقی سحر آگیں اور لطیف۔

اب اس شہر پر زوال کا عالم تھا۔ ہاپس برگ خاندان کے ساتھ ساتھ اس کا شباب بھی چھن چکا تھا۔ نوجوانوں میں نازی رجحانات زور پکڑ رہے تھے۔ شاڈش نگ کی حکومت نے نازی اور اشتراکی جماعتوں کو خلاف قانون قرار دیا تھا۔ مگر یونیورسٹی میں، فوج میں، ہر جگہ جتنے نوجوانوں سے نعیم ملا، زیادہ

تر ناتسی تھے اور جرمنی سے اتحاد کے خواہاں۔ ایک مصور سے وہ ایک قہوہ خانہ میں ملا اور مصور نے ناتسی فلسفۂ حیات کی تائید میں اس زور شور سے بحث کی کہ اس کے منہ سے کف جاری ہوگیا۔ اس پر بھی نعیم ناتسی عقیدے کی مخالفت کرتا رہا، تو اس نے کہا۔ ''اب میں آپ سے ایک بات کہوں۔ ہم لوگ بھی ہندوستانیوں کو نیچ اور کم اصل سمجھتے ہیں۔'' اس پر دوسروں نے اسے روکا اور وہ معافی مانگ کے چلا گیا۔

شہر میں غربت کافی تھی۔ اس لیے رومان کی تلاش میں بھی نعیم کو ناکامی نہیں ہوئی۔ ایک حسین لڑکی اسے ایک رقص کے مدرسے میں مل گئی، جس کے اس نے ویز والڈ (وی آنا کے جنگل) میں بوسے لیے اور جس کے ساتھ وہ رات کی تاریکی میں نام نہاد نیلی ڈینیوب کے کنارے ریت پر ٹہلتا رہا۔ ایک اچھے خاندان کی جرمن لڑکی سے وہ کارتزا اشتراسے کے ایک ہوٹل میں ملا۔ اسے ہمل اشتراسے (آسمان کا راستہ) اور کالن برگ لے گیا۔ دن بھر اس کے ساتھ گذارا۔ پھر وہ نہیں آئی۔

ایک دن وہ کالن برگ گیا تھا، جہاں سے وی آنا اور ڈینیوب دونوں نشیب میں بڑے خوبصورت معلوم ہوتے۔ واپسی میں ایک دوسری بس میں اس نے ایک اور لڑکی کو سوار ہوتے دیکھا، جو سفید پگڑی کی سی نہایت فیشن ایبل ٹوپی اور سفید لباس پہنے ہوئی تھی۔ اس نے غور کیا تو دیکھا کہ یہ میری پاول تھی۔

وینس سے اس کے جہاز کے جانے میں تین دن باقی رہ گئے تو اس نے سفر کا ارادہ کیا۔ اسٹیشن پر اس نے پھر میری پاول کو دیکھا۔ وہ اکیلی تھی۔

اس نے نام لے کے میری کو زور سے پکارا۔ وہ ٹھٹک کے کھڑی ہوگئی۔

''تم یہاں کہاں؟'' اس نے میری سے پوچھا۔

''جمیز ابھی ابھی سالزبرگ گیا ہے۔ میں اسے رخصت کرنے آئی تھی۔ تم کہاں جا رہے ہو؟'' میری نے پوچھا۔

''ہندوستان۔'' نعیم نے جواب دیا۔ نعیم نے غور سے دیکھا تو میری کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے۔

''اچھا ہوا تم سے یہاں ملاقات ہوگئی۔ یورپ سے واپس ہونے کا تمہیں افسوس ہے؟'' میری نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

''کچھ ایسا زیادہ نہیں۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ جلد واپس آؤں گا۔'' نعیم نے جواب دیا۔

''بشرطیکہ جنگ جلد نہ چھڑ گئی۔ مگر میں تو یہ محسوس کر رہی ہوں کہ ہم بہت تیز جا رہے ہیں اور ٹکر ہونے ہی والی ہے۔''

اور نعیم کو ورسدن کے قریب موٹر سائیکل والی نوجوان عورت کا حادثہ یاد آ گیا۔

اس نے میری پاول اور اس مردہ عورت میں ایک طرح کی وحدت محسوس کی۔ تمدن کی وحدت، اور پھر اس نے اپنے آپ کو دفعتاً یہ غیر محتاط سوال کرتے سنا:

''میری تم زیادہ خوش نہیں معلوم ہو رہی ہو۔ کیا تم سے اور جمیز سے نہیں بنی؟''

میری نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہم دونوں شادی کے اہل نہیں تھے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ وفاداری سے نہیں رہ سکتے۔ بہت دیر بعد مجھے اس کا احساس ہوا۔''

''کیا کوئی ایسا واقعہ پیش آیا؟''

''نہیں کوئی واقعہ نہیں۔'' میری نے جواب دیا۔ ''مگر یہ احساس پیدا ہو چکا ہے، مجھ کو بھی اور جمیز کو بھی۔'' میری کے لہجے میں تلخی نہیں بلکہ ایک طرح کی آزردگی تھی۔

''مجھے افسوس ہے۔'' نعیم نے ہمدردی کے لہجے میں کہا۔

''شکریہ نعیم! مگر اب تمہاری گاڑی جانے ہی والی ہوگی۔''

وہ نعیم کے ساتھ ساتھ اس کے ڈبے تک آئی۔ سیکنڈ کلاس کے اس حصے میں صرف دو نشستیں تھیں۔ میری اس کے ساتھ اُوپر چڑھ آئی۔ ''اچھی خاصی آرام دہ جگہ مل گئی۔'' اس نے کہا۔

نعیم نے میری کا ہاتھ اٹھا کے چوما اور کہا۔ ''خدا حافظ۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔''

اور ایک ثانیہ کے اندر ایک ہی خیال دونوں کے ذہن میں پیدا ہوا۔ دونوں کے لب ایک دوسرے کے قریب آ گئے اور نعیم نے جب میری کا بوسہ لیا تو محسوس کیا کہ اس کے لب بھی سچائی سے جواب دے رہے ہیں۔ اس نے ہاتھ بڑھایا اور اس کے ہاتھ نے محسوس کیا کہ میری کا سینہ ڈھلک رہا ہے۔

ریل اسٹیشن ہی پر تو تھی۔ میری جلدی سے ہٹ گئی۔ ریل نے سیٹی دی۔ میری نیچے اُتر گئی اور نعیم دیر تک پلیٹ فارم پر اس کے سفید رومال اور اس کے ہلتے لہراتے ہوئے ہاتھ کو دیکھتا رہا۔

پندرھواں باب

نقشِ نازِ بُتِ طنّاز بہ آغوشِ رقیب

صبح سویرے جہاز بمبئی پہنچا۔ نیم برہنہ مزدور ساحل پر اور کشتیوں پر کوئلے سے دانت مانجھ رہے تھے اور ان کے منہ سے کوئلے کے رنگ کا پانی اس طرح نکل رہا تھا گویا ان کے جسم کی سیاہی جو جسم کے اندر بھی موجود ہے، بہہ بہہ کر باہر نکل رہی ہے۔ جہاز سے اُترتے ہی چنگی کے محکمے نے کتابوں کی ایسی سخت جانچ پڑتال کی گویا نعیم سے زیادہ اسٹالن کا کوئی محرمِ راز نہ تھا۔ لیفٹ بک کلب کی تمام کتابیں ضبط کر لیں، پھر آگے بڑھنے کی نوبت آئی۔ نعیم ایک آدھ دن بمبئی میں ٹھہرنا چاہتا تھا۔ ایک گھنی داڑھی والے کوچوان نے اپنی وکٹوریہ پیش کی اور کہا۔ ''آپ بھی مسلمان ہیں۔ میں بھی مسلمان ہوں۔ صاحب میری گاڑی میں چلئے۔'' معلوم نہیں اسے نعیم کے مسلمان ہونے کا حال کیسے معلوم ہوگیا۔ نعیم نے پوچھا تو اس نے کہا۔ ''مسلمان کی صورت کہیں چھپتی ہے؟''

(۲)

کلکتہ میل کے آنے میں ابھی گھنٹہ بھر باقی تھا۔ وہ وکٹوریہ ٹرمنس کے بڑے اور کشادہ ویٹنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا کہ دفعتاً ایک مانوس آواز نے پکار کے اسے مخاطب کیا۔

''میاں نعیم!''

یہ داؤد تھا۔

گلے ملنے کے بعد داؤد نے سوالات کی بوچھار کردی۔ ''کیسی گذری؟ اسی وقت کلکتے جا رہے ہو؟ کہاں تقرر ہوا ہے؟ گپتا نگر میں؟ ولایت میں شادی کی؟ نہیں؟ یہاں بلقیس کی شادی ہوگئی ہے راحت خان جاگیردار سے۔ مگر تم میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ ہم سمجھتے تھے تم یورپ سے موٹے ہوکے آؤ گے۔ حیدرآباد میں کب آؤ گے؟ آنا تو مجھے پہلے سے خط لکھ دینا۔ میں بھی ونگلور سے وہاں آجاؤں گا۔ تمہاری ریل کب جارہی ہے؟''

بلقیس کی شادی کی خبر سن کر نعیم کے دل پر ایک سناٹا سا چھا گیا۔ ایک دریا بہتا ہوا ریگستان میں غائب ہوگیا تھا۔ دفعتاً ریت سے پھر پانی ابلنے لگا۔

''بلقیس کی شادی کب ہوئی؟'' اس نے یہ جان بوجھ کے سوال کیا کہ داؤد دل میں ضرور اس پر ہنسے گا۔

''کوئی دو تین مہینے ہوتے ہیں۔ خانم آخری وقت تک امید لگائے بیٹھی تھیں کہ تم آؤ گے تو تمہیں سے ہوگی۔ مگر بلقیس تم سے شادی کرنے کو بالکل تیار نہیں ہوئی۔ اب پچھتاتی ہوگی۔ خیر جس بلقیس کا منہ دیکھنے میں تمہیں ناکامی ہوئی اس کی شادی ایک ایسے موٹے تازے کالے جاگیردار سے ہوئی ہے کہ یاد ہی کرتی ہوگی۔ مگر ہم تو سنتے تھے کہ تم وہاں شادی وادی کر چکے ہو؟''

''نہیں ابھی تک تو نہیں۔ مگر یہ تو بتائیے کہ میاں عادل کا کیا حال ہے؟''

''برا حال ہے۔''

''میں تو سمجھتا تھا کہ بلقیس سے ان کی شادی ہوجائے گی۔'' نعیم نے کہا۔

''رقیب نیز چنیں محترم نمے خواہد ماند''۔ داؤد نے ہنس کر کہا۔ ''کم سے کم تمہارے لیے یہ تسلی تو ہے۔''

''نہیں مجھے اب بلقیس سے کوئی دلچسپی نہیں۔''

''خیر وہ بھی خوش، تم بھی خوش، چلو اچھا ہوا۔''

''مگر میاں عادل کا کیا قصہ ہے؟''

داؤد نے کہا۔ ''بھئی وہ پہلے تو بلقیس کو تمہارے خلاف بھڑکاتے رہے۔ ایسے ایسے دلچسپ قصے تمہارے متعلق تصنیف کرتے تھے کہ ہنسی آتی تھی۔ ہنسی کی حد تک تو میں بھی گنہگار ہوں۔ یوں بھی میرے خیال میں تمہاری اور بلقیس کی طبیعت ذرا مختلف ہے۔ اور بلقیس کا دماغ شروع ہی سے خراب تھا۔ تمہارے خلاف تو بلقیس کو انہوں نے اتنا بھڑکایا کہ باوجود عاقل چچا اور خانم کی کوشش کے اس نے تم سے شادی کرنے سے انکار کردیا۔ اس سلسلے میں مجھ سے اور عاقل چچا سے لڑائی بھی ہوئی لیکن اس کا ذکر ضروری نہیں۔''

''اب بھی لڑائی ہے؟''

''نہیں اب تو نہیں۔ البتہ میاں عادل اب بھی مجھ سے بہت ناراض ہیں۔ ایک دن مجھے ذرا جوتے کاری بھی کرنا پڑی۔''

''وہ کیسے؟''

''پہلے ان سے ایک بار لڑائی ہو چکی تھی۔ انہوں نے میرے اور بلقیس کے متعلق تہمت تراشی تھی۔ خیر جب وہ قصہ رفع دفع ہوا اور میں عاقل چچا کے یہاں آنے جانے لگا تو ایک دن میں نے میاں عادل کے ہاتھ میں ایک فراست الید کی، یہی ہاتھ دیکھنے کی کتاب دیکھی۔ اس کے آخر میں ایک باب میں پیدائش کے مہینوں کی خصوصیات کا ذکر تھا۔ بلقیس کی پیدائش کا جو دن تھا، اس دن کی پیدائش کی خصوصیتوں میں یہ تھا کہ جو لوگ اس تاریخ کو پیدا ہوتے ہیں وہ اظہار محبت سے نہیں بلکہ دوستی بڑھانے کے بعد قابو میں آتے ہیں، اور اسی قسم کی اور بہت سی مہمل باتیں تھیں لیکن ان سب کے مقابل حاشیے پر عادل صاحب نے بلقیس کا نام لکھا تھا۔ میں نے وہ کتاب ان سے چھین کے ان سب باتوں کی خانم اور بلقیس کے سامنے ہنسی اُڑائی۔ وہ بگڑے تو میں نے کالج میں ان کے بے وقوف بنائے جانے کا تذکرہ کیا اور واقعات سنائے۔ بلقیس ہنستے ہنستے لوٹ ہوگئی۔

''پھر کیا ہوا؟''

''پھر انہیں غصہ آیا۔'' داؤد نے جواب دیا۔ ''جب تک ہو سکا میں طرح دیتا رہا لیکن جب ان کی زبان قینچی کی طرح چلتی رہی تو میں نے جوتا سنبھالا۔''

''مگر بلقیس سے ان کی شادی کیوں نہیں ہوئی؟''

''کوشش تو بیچارے نے بہت کی۔ بلقیس کو خطوط لکھے جو اس نے خانم کے حوالے کردیئے۔ ہر ایک سے کہلوایا۔ باقاعدہ پیام دلوایا لیکن بلقیس جب تم کو خاطر میں نہیں لاتی تھی تو انہیں کیوں پوچھتی۔ وہ انہیں آلۂ تفریح سمجھ کر بناتی رہی اور یہ اُلو داس سمجھتے رہے کہ وہ ان پر جان دیتی ہے۔ جب اس نے کھلم کھلا انکار کردیا تو بے چارے کو اتنا صدمہ ہوا کہ امتحان میں فیل ہوگئے اور کچھ بلقیس کے رنج میں، کچھ بیماری کے بہانے دو تین مہینے فریش بھی رہے۔ اسی اثنا میں بلقیس کے دوسرے پیام آتے رہے۔ یہاں تک کہ راحت خاں جاگیردار سے بات ٹھہری۔''

''مگر بلقیس کو اس جاگیردار میں کیا پسند آیا؟'' نعیم نے پوچھا۔

''پیسہ، میاں پیسہ! ہزار ہا روپے کی ان کی ماہانہ آمدنی ہے۔ پھر یہ کہ میں نے ان نئی روشن خیال لڑکیوں میں ایک عجیب بات دیکھی ہے۔ اپنے خاندان کا اچھے سے اچھا لڑکا انہیں پسند نہیں آتا اور باہر کسی کالے کلوٹے سے شادی کرنے پر تیار ہو جاتی ہیں۔ خیر میاں عادل نے بڑی کوشش کی کہ نسبت ٹوٹ جائے۔ ایک دن گرمیوں کے موسم میں مجھے سائیکل پر ننگے سر جاتے بھی نظر آئے۔ میں نے دل میں کہا۔ دو تین ہفتے میں پاگل ہونا ضروری ہے۔ مگر کچھ ہوا ہوا یا نہیں، شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔''

''عادل شادی میں شریک ہوئے؟''

''نکاح کے وقت تو تشریف نہیں رکھتے تھے۔ ہر ایک نے محسوس کیا کہ ان کی غیر موجودگی خالی از علت نہیں۔ میں نے تو خانم سے یہاں تک عرض کرنے کی جرأت کی کہ انہوں نے اپنے بیان کے مطابق خودکشی کرلی ہوگی۔ مگر دو تین گھنٹے کے بعد آنسو وغیرہ پونچھ پانچھ کر میاں عادل آ پہنچے۔۔۔ مگر تمہاری ریل کا وقت ہو رہا ہوگا؟''

''چلیے پلیٹ فارم تک تو میرے ساتھ چلیے۔'' نعیم نے کہا۔

''ضرور، اور کیا میں نہ چلتا؟''

''اب میاں عادل کا کیا حال ہے؟''

''نوکر ہوگئے ہیں۔ کتابیں لکھتے ہیں۔ اقبال کا بڑا گہرا مطالعہ کرتے ہیں۔ اب تمہاری برائیاں نہیں کرتے۔ عہد کرلیا ہے کہ عروسِ علم کے سوا عمر بھر کسی سے شادی نہ کریں گے۔''

گپتا نگر کے قریب برہم پتر کا پاٹ اتنا چوڑا ہے کہ وہ جھیل معلوم ہوتی ہے۔ کوئی ریل کوئی سڑک اس مقام پر اس وسعت کو عبور نہیں کر سکتی۔ اس لیے لوگ کشتیوں میں بیٹھ کر ایک کنارے سے دوسرے کنارے جاتے ہیں۔ ندی کے کنارے ایک ٹیلے پر صاحب ڈپٹی کمشنر کی سرکاری کوٹھی تھی۔ اس کوٹھی سے اس دریا کا منظر نعیم نے اتنے مہینوں تک دیکھا تھا کہ یہ اس کی زندگی کا ایک جزو سا بن گیا تھا۔ اس کے خیالات کا ایک جغرافیائی پس منظر۔

برہم پتر کی زندگی اس کی اپنی زندگی سے کچھ ملتی جلتی تھی، کچھ مختلف۔ وہ اکثر شام کے وقت کچہری سے واپس آکر برہم پتر کو دیکھ کے یہی سوچا کرتا۔ اس کی زندگی کی روانی بھی اس ندی ہی کی سی تھی۔ جہاں نشیب آیا، پانی ڈھل گیا۔ بارش زیادہ ہوئی، برف زیادہ گری تو پانی زیادہ آگیا۔ کبھی کبھی سیلاب آگیا اور غریبوں کے گھر تباہ ہوگئے۔ برہم پتر کا سیلاب اور ڈپٹی کمشنر صاحب کا غصہ۔ دونوں کی اپیل نہ سرکار کے پاس تھی نہ خدا کے پاس۔ دونوں میں رعونت یکساں تھی مگر رعونت کی وجہیں مختلف تھیں۔ برہم پتر کی رعونت اس کی وسعت تھی نہ گہرائی اور نہ کوئی زورِ حیات۔ یہ رعونت زیادہ جھوٹی تھی۔ برہم پتر کی روانی تو خیر صدیوں سے جغرافیائی حدود کی حد تک کم و بیش معین ہے۔ لیکن نعیم کی زندگی کی رَو میں زورِ حیات اتنا معدوم تھا کہ مستقبل کی تخلیق اس کے بس سے باہر تھی۔

وہ یہی سب باتیں سوچا کرتا اور ایک احساسِ ناکامیابی اسی عمر سے اس پر حاوی ہونے لگا۔ یہ احساس کہ اس کی اپنی زندگی کچھ بے مصرف سی ہوگئی ہے۔ طالب علمی کے زمانے تک وہ پھر بھی زندگی کی تخلیق کے کچھ نہ کچھ خواب دیکھتا رہا۔ مگر اس ملازمت میں وہ مشین کا ایک پرزہ تھا اور بس۔ سرکار اور رعایا کے نزدیک بیش قیمت پرزہ۔۔۔ لیکن یہ محض بھرم ہی بھرم تھا۔

یہ بے مصرف زندگی، یہ آرام کی، دوروں کی اور شکار زندگی۔ کرسمس میں کلکتہ کا سفر اور چورنگی کے ہوٹلوں میں ناچ، گرمیوں میں دارجلنگ، یہ زندگی جس میں ایک پورے ضلع کی رعایا اس کے نام سے کانپ جاتی تھی۔ ہزاروں کا سلام، سینکڑوں کو سلام، یہ خوشامد پسند، خوشامد کرنے والی زندگی جو آہستہ آہستہ عمر کا ایک ایک سال کاٹتی جاتی ہے۔ ہر سال پہاڑ پر بھیجتی ہے۔ انگریزوں سے دوستیاں کراتی ہے اور ان دوستیوں میں ذلت سی محسوس کراتی ہے۔ یہاں تک کہ پنشن کا زمانہ آجاتا ہے اور اس وقت اس

زندگی میں مقام کی تبدیلی ہوتی ہے۔ وقت گذرتا جاتا ہے لیکن زمان و مکان دونوں انسان کی گرفت سے باہر رہتے ہیں۔ یہ عزت کی زندگی، یہ ناکامی کی زندگی یوں ہی گذر جاتی ہے اور سینکڑوں نوجوان جو آئی سی۔ ایس کے امتحان میں فیل ہوتے ہیں، عمر بھر اس کا ماتم کرتے رہتے ہیں۔

گپتا نگر میں برہم پتر کے کنارے یہ احساس نعیم پر حاوی ہونے لگا تھا۔ کیا اس کی ساری زندگی یونہی گذر جائے گی۔ کچھ تخلیق کیے بغیر۔ کیا آرام کے معنی محض اعلیٰ درجے کی حیوانی آسائش ہے۔ کیا یہی اس کا منتہائے نظر ہے۔ وہ جذباتی اضطراب اور کاوش جو یورپ میں تھی وہ یہاں مفقود تھی۔ اس نوکری میں جنس بھی ایک خوراک کی سی چیز تھی۔ پیسے سے اچھی اچھی دیہاتی لڑکیاں آجاتیں۔ تیرہ چودہ سال کی۔ کچھ میمیں کلکتہ یا دارجلنگ میں مل جاتیں۔ ذہنی اضطراب اور کاوش کہاں اور گپتا نگر کہاں۔

نعیم نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس کی شخصیت ٹوٹ رہی ہے۔ انفرادیت مندمل ہو رہی ہے۔ سیاسیات میں اس کا نقطۂ نظر محض ایک تماشائی کا سا رہ گیا تھا۔ ہندوستان آنے کے کچھ ہی دنوں بعد کانگرس اور لیگ کی جنگ میں اس کی نام نہاد اشتمالیت ختم ہوئی۔ سرکار سے اسے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ اس لیے سرکار کا آدمی بن کے چپکنے کا بھی اسے کوئی موقع نہ تھا۔ اسی طرح خارجی سیاسیات میں بھی اس کی ہمدردی، طاقت اور سیاسی ہنر کا ساتھ دیتی اور تمام اعلیٰ تصورات مٹنے لگے تھے۔ یہ غلامانہ ذہن کی خاص علامت ہے۔ یورپ میں جو سلطنت سیاسی اور فوجی طاقت کا سب سے زیادہ مظاہرہ کرتی ہے، ہندوستانی اس کی تعریف کرتے ہیں۔ کھلم کھلا نہیں تو در پردہ۔ پھر جب وہ سلطنت دوسروں سے زک کھاتی ہے تو دوسروں کی تعریف ہونے لگتی ہے۔ گویا سیاسیاتِ عالم اور عالمگیر لڑائیاں گھوڑ دوڑ ہیں۔

یہ نعیم کی بدقسمتی تھی کہ اس کی شخصیت ملازمت کے وقت تکمیل کو نہ پہنچ سکی تھی۔ یعنی کوئی امتزاج نہ پیدا ہو سکا تھا۔ ذہنی تفکرات میں امتزاج کے فقدان کی وجہ سے وہ کوئی فلسفۂ حیات نہ بنا سکا تھا اور اچھا بھی تھا۔ سرکاری ملازمین کو اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ سیاسیات میں اشتمالیت اور اسلام کے درمیان وہ کوئی قطعی فیصلہ نہ کر سکا تھا۔ پہلے اشتمالیت کی طرف جھکا ہوا تھا۔ اب پان اسلامزم اور پاکستان کی طرف مائل ہو گیا۔ پہلے بھی خیالات بے ارادہ، بے عمل تھے، اب بھی رہے۔ جذباتی امتزاج کے بجائے اب انتہا درجے کا انتشار تھا۔ بلقیس، ایلس اور میری تینوں اس کی زندگی میں آکے غائب ہو چکی تھیں۔ تینوں کا خیال ایک ساتھ آنا ہی جذباتی انتشار کی نشانی ہے۔ اب یہاں بھی خلا ہی خلا تھا۔

(۴)

۱۹۳۸ء کے آخر میں وہ حیدرآباد آیا۔ محض بلقیس کو ایک بار پھر دیکھنے کے لیے شہر کے مضافات میں ایک جدید مکعب وضع کے سامنے وہ گاڑی سے اُترا۔ مکان کا باغ بہت اچھا تھا۔ سرخ جاپانی پھولوں کا ایک جھاڑ دیوار کے سہارے کھڑا تھا۔ دوسری دیواروں پر بیلیں تھیں مگر پھولوں کا موسم گذر چکا تھا۔

اسے بلایا گیا۔ ڈرائنگ روم میں بلقیس بیٹھی تھی۔ دیواروں پر نشاۃِ ثانیہ کی چار تصویروں کے عکس تھے۔ جن میں نہ کوئی مذاق تھا نہ کوئی ہم آہنگی۔ فرنیچر میں بھی کوئی خاص سلیقہ، کوئی ہم آہنگی نہ تھی۔ نعیم نے اپنے دل میں کہا۔ ''میں نہیں سمجھتا تھا کہ بلقیس ایسی بے سلیقہ بیوی نکلے گی۔''

بلقیس کے سلام کا جواب دے کر وہ بیٹھ گیا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ بلقیس گپتا گھر کے متعلق، یورپ کے متعلق اور ایسی ہی روزمرہ کی باتوں کے متعلق پوچھتی رہی۔ پھر خانم آگئیں۔ ان کی لچھے دار باتیں اب بھی ویسی ہی تھیں۔ نعیم سے اصرار کرنے لگیں شادی کرلو۔ جس سے کہو، تمہاری شادی کرادوں۔ کوئی درجن بھر لڑکیوں کے نام انہوں نے لے ڈالے۔ سب کا حلیہ بتایا، شجرۂ نسب سمجھایا اور نعیم برابر مذاق میں اڑاتا رہا۔ بلقیس اُٹھ کے چلی گئی تو خانم نے قریب آ کے نعیم کے کان میں کہا۔ ''تم نے بلقیس کو دیکھا؟ پہلے سے آدھی بھی نہیں رہی۔ رنگت کیسی زرد پڑ گئی ہے۔ اس موذی سے خدا سمجھے۔ وہ ایسی ایسی اذیتیں دیتا ہے کہ میری بچی کی زندگی جہنم بن گئی ہے۔''

نعیم نے ذرا پریشان ہو کے پوچھا۔ ''کیوں کیا بلقیس خوش نہیں ہے؟''

خانم نے جواب میں ٹھنڈی سانس لی۔

''آخر بات کیا ہے؟'' نعیم نے ذرا ہچکچا کے پوچھا۔

''بھئی شروع میں تو راحت خاں پردے کے بڑا خلاف تھا۔ خود ہی تمام دوستوں سے ملایا، ساتھ ساتھ لیے پھرتا تھا۔ کئی دفعہ ڈانس میں لے گیا تھا۔ میں اور تمہارے چچا لاکھ کہتے تھے کہ حیدرآباد میں اتنی آزادی ٹھیک نہیں مگر یہ دونوں کب مانتے تھے۔ اور میاں حیدرآباد کا حال تو تم جانتے ہو، چیل اُڑے تو لوگ کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ بھینس اُڑی۔ مگر راحت خاں کو عقل ہوتی تو اتنا تو پہنچانتا کہ میں نے ہی اتنی آزادی دی ہے۔ وہ الٹا جلنے لگا۔ یہاں مت آؤ، یہاں مت جاؤ، اس کے سامنے مت نکلو۔ اس سے پردہ کرو اور بلقیس کچھ کرے یا نہ کرے وہ لڑائیاں ہوتی تھیں کہ الٰہی توبہ۔''

''مجھے بلقیس کی حالت دیکھ کے پہلے ہی یہ شک ہوا تھا کہ وہ زیادہ خوش نہیں۔''

''خیر بلقیس نے پردہ کرنا شروع کر دیا اس کا کہنا ماننے لگی۔ گھر سے باہر جانا چھوڑا تو خود راحت خاں نے عیاشی شروع کی۔ اب سکندرآباد میں ایک اینگلو انڈین عورت کو گھر ڈال لیا ہے۔ اس کے لیے سو روپیہ مہینے کرائے کا ایک مکان لیا ہے اور اسے موٹر میں لیے لیے پھرتا ہے۔ میں تو بلقیس سے کہہ رہی ہوں خُلع کرلو۔''

''بلقیس نے آخر اس سے شادی کیوں کی؟''

''قسمت'' خانم نے جواب دیا۔ ''میں نے کتنا سر مارا مگر تمہارے چچا نے ایک نہ مانی۔ آخر میری لڑکی کی قسمت پھوڑ دی۔ مجھے تو ڈر ہے وہ زیادہ دن جئے گی نہیں۔'' اور خانم رونے لگیں۔

تھوڑی دیر بعد راحت خاں بھی آئے۔ سانولے سے آدمی تھے۔ بات چیت انہوں نے اس قدر اخلاق سے کی کہ نعیم کو شک ہونے لگا کہ ان لڑائی جھگڑوں اور بدمزگیوں میں بلقیس کی بھی اچھی خاصی خطا ہے۔

کھانے پر ظاہرداری کا اچھا خاصہ سلسلہ رہا اور نعیم کو اگر خانم نے سمجھا نہ دیا ہوتا تو اسے محسوس نہ ہو سکتا کہ یہ گھر جو اتنا خوش و خرم معلوم ہو رہا ہے، دراصل جہنم ہے۔

کھانے کے بعد راحت خاں اس کی گاڑی منگوانے باہر گئے۔ بلقیس سے رخصت ہوتے وقت نعیم نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ ''بلقیس! ہرگز ہمت نہ ہارنا۔''

اظہارِ تشکر میں اس کی نگاہیں اُوپر اُٹھیں۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک ثانیے کے لیے اس نے نعیم کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں کے پیچھے ایک عجیب روشنی کی وجہ سے چمک رہی تھیں۔ گویا وہ اپنی غلطی کی معافی چاہ رہی تھیں۔ اپنے غلط انتخاب کی۔ ان میں صدیوں کے تجربے کے برابر تاسف تھا اور وہ اس نوجوان کی ہمدردی کا شکریہ ادا کر رہی تھیں جو لاکھ یورپ کی لڑکیوں میں آوارگی کرتا رہے، بالآخر ان کا غلام تھا اور ان آنکھوں کو اس کا یقین تھا مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ وقت گذر چکا تھا۔

اور یہ سب باتیں ایک ثانیے کے اندر کہہ کے، جو زبان سالہا سال میں اچھی طرح ادا نہ کر سکتی، وہ نگاہیں پھر جھک گئیں۔ ہاتھ ہٹ گیا۔ راحت خان آئے اور نعیم کو ساتھ لے کر باہر چلے گئے۔



سولھواں باب

کوہکن گرسنہ مزدور طرب گاہِ رقیب

"پراہا
چیکوسلاویکیہ
۲۷ر نومبر ۱۹۳۸ء

محبی نعیم!

تمہارا خط پڑھ کے مجھے بڑی مسرت ہوئی۔ یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ تمہاری ہمدردی سے میں بہت متاثر ہوا۔ مجھے علم ہے کہ تمہاری طرح اور بھی بہت سے انسان ہیں۔ جن کو اگر پورے حالات معلوم ہوں تو وہ بھی "وسط یورپ کے اس ملک سے جس کا ہم نے کبھی ذکر بھی نہیں سنا" (یہ دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کے ایک وزیرِ اعظم کے الفاظ ہیں)۔۔۔ ہمارے اس ملک سے ہمدردی محسوس کریں گے۔ میں گذشتہ گرما میں پراگ میں بہت سے اجنبیوں سے ملا۔ سب ہمارے دوست تھے۔ سب نے اپنے اپنے ملکوں کی ہمدردی کا یقین دلایا۔ ہمارے سیاسی دوستوں نے بہت غلو سے اپنے وعدوں کی سچائی کے دعوے کئے۔۔۔ اور نتیجہ؟۔۔۔ نتیجہ تم نے دیکھ ہی لیا۔ لوہے کے ہتھیاروں والے ہمسائے جن کی اصلی جگہ باورچی خانے میں ہے۔ ہمارے ملک کے حصے کاٹ لے گئے اور کیا اچنبھا معلوم ہوتا ہے کہ اب

ہمارے ان صدیوں کے دشمنوں نے ہمارے اپنے بوستانی بھائیوں اور لالچی ہنگرویوں کی طمع سے ہمیں بچانے کا ذمہ لیا ہے لیکن ایک بات اور ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ زمانہ معاشی طبقوں کی جنگ کا زمانہ ہے۔۔۔ مگر نہیں میں سے ضبطِ تحریر میں نہیں لا سکتا۔ یہاں کچھ ایسا دستور زبان بندی ہے۔ پھر کبھی ملے تو ترکی قہوے کے پیالیاں پیتے میں ہم اس مسئلے پر بحث کریں گے۔

تم نے یہ جو لکھا ہے کہ اب بھی تم مجھے ویسا ہی گہرا دوست سمجھتے ہو اس سے مجھے بڑی ہی دلی مسرت ہوئی اور میں نے ایک عزت سی محسوس کی۔ بقول تمہارے ہماری دوستی زمان و مکان کی حدود سے آزاد ہے۔ تم اگر کوئی دس ہزار میل دُور ہو تو کیا پروا، مجھے وہ زمانہ ہمیشہ یاد رہے گا جو پیرس میں ہم دونوں نے ساتھ گذارا ہے۔ وہ میری زندگی کے انتہائی خوشگوار زمانوں میں سے ایک تھا۔ ایک بار پھر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ گویا تم میرے پاس ہو۔ یہ اس وقت جب گذشتہ ستمبر میں میں پراگ میں جواہر لال نہرو سے ملا۔ میرے ایک رومانی دوست کی جو نامہ نگار ہے، مسٹر نہرو سے بڑی دلچسپ ملاقات رہی۔

میں ابھی تک وزارتِ خارجہ کے دفتر میں ہوں مگر مستقبل کی بات کچھ نہیں کہہ سکتا۔ جرمن اثر زیادہ بڑھ گیا تو ممکن ہے مجھے قید کر لیا جائے۔ بہر حال ہمارے پورے ملک کے نظام میں بہت سی تبدیلیاں ہوں گی اور دفتر وزارتِ خارجہ کو محدود کر دیا جائے گا۔ ممکن ہے میں بھی تخفیف میں آ جاؤں۔ بہر حال میں اتنا زیادہ قنوطی بھی نہیں۔ ممکن ہے ایک دن میں ہندوستان آؤں اور باتا کے لیے سانپ پکڑوں۔

یہ بڑا پُر لطف زمانہ ہے۔ عظیم الشان تخریب کا زمانہ۔ معاشرتی اُبال، اقدار اور پیمانوں کے زلزلے کا زمانہ۔ ہم لوگوں کی طرح تم اس کی تکلیف محسوس نہیں کر سکتے۔ تم تاریخ کا ہزار ہزار سال کے ابواب میں تصور کرتے ہو لیکن یورپ والوں کے لیے موجودہ حالات بڑے حیرت انگیز ہیں۔ غارت گروں اور سٹے بازوں اور ڈاکوؤں کا اتنا بڑا کارخانہ۔ چیکوسلاویکیہ کی ہمت ابھی تک نہیں ٹوٹی اور قومی ہمت کی اقدار میں انسانیت اب بھی سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ پھر ہم اپنے ویرانے کی بنیادوں پر نئی عمارت کھڑی کریں گے۔

مجھے امید ہے کہ پھر ہم نئے زمانے دیکھیں گے اور روشن تر آفتاب، اور تب تم بھی یہاں آؤ گے اور اپنی آنکھوں سے دیکھو گے۔۔۔ اور ہمارا شہر اس وقت آزاد شہر ہوگا۔

تمہارا مخلص دوست
"زدینک ہروشا"

(۲)

"گلاوسٹر اسٹریٹ

وکٹوریہ۔ لندن

۷ رجنوری ۱۹۳۹ء

پیارے نعیم!

تمہارے خطوط کا بہت بہت شکریہ۔ میں نہیں سمجھتی تھی کہ تمہاری دوستی۔۔۔ تمہاری محبت اتنی دیر پا ہے گی۔ دونوں خطوط کا میں ایک ساتھ جواب دے رہی ہوں۔

ایک واقعہ پیش آیا جو اور ہزاروں پر بھی گزرا ہوگا۔ لیکن جب خود پر گزرتا ہے تو اس کی تکلیف کا احساس ہوتا ہے۔ میں مجبور ہوں کہ تمہیں اس کی اطلاع دوں۔ جیمز (کراکسلے) نے یہ محسوس کیا کہ اسے اب مجھ سے محبت نہیں رہی، اور ہم الگ الگ ہو گئے۔ مجھے اس سے ابھی تک اتنی ہی محبت ہے مگر یہ انکشاف اس کے اپنے دل کا تھا۔ میں کیسے مجبور کرسکتی اور مجھے بھی اپنی غلطی معلوم ہوگئی۔ یہ نہیں کہ میں نے اسے کیوں اس قدر چاہا بلکہ یہ کہ میں نے مسرت کو اپنے آپ میں ڈھونڈنے کی بجائے کسی اور میں کیوں ڈھونڈا۔ جب تک میں اپنے آپ میں ساری مسرتیں ڈھونڈھتی رہی، مجھے کوئی فکر نہیں ہوئی۔ کوئی رنج نہیں ہوا۔

میں نے ابھی تک طے نہیں کیا کہ کیا کروں گی۔ سیاسی کام کے سوا میں یہ بھی سوچ رہی ہوں کہ بچوں کی تربیت کا کچھ کام سیکھوں۔ انصاف اور انسانیت کی تعلیم بچپن سے ہونی چاہیے۔

کرسمس میں نے اور جیمز نے ساتھ گزارا تھا اور میں کس قدر خوش تھی۔ اب میں بالکل تنہا ہوں۔ دنیا نے اپنی گردش چھوڑ دی۔ نظام شمسی درہم برہم ہوگیا۔ ابھی تک اپنی یہ تنہائی، اس سے یہ جدائی میری سمجھ میں نہیں آئی۔ جب میں مستقبل کے ان لامتناہی لمحوں، گھنٹوں، دنوں، مہینوں کا تصور کرتی ہوں جن میں میں اس سے جدا ہوں گی تو کانپ اٹھتی ہوں۔

اور ایک لحاظ سے یہ اچھا ہوا کہ جلد ہی تصفیہ ہو گیا۔ میں نے تم سے آسٹریا ہی میں کہہ دیا تھا کہ میری اور جیمز کی نبھے گی نہیں۔ ماہ وصل کے زمانے ہی سے دونوں کو ایک دوسرے کی وفاداری کی طرف

سے بدگمانی شروع ہوگئی۔ میں اس سے وفادار رہی۔ باوجود اس کے کہ میں اصولاً میاں بیوی کی جنسی وفاداری کی قائل نہیں لیکن اس کی آوارہ گردی کے بعد اسے جلانے کے لیے میں اس قسم کی باتیں کرتی تھی۔ اب یہ سب کتنا مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے، اور جیمز کو اب ایک اور لڑکی سے محبت ہے۔

مجھے یہ ایک بڑی ظالم اور احمقانہ سی بات معلوم ہوتی ہے کہ وقت کے ایک ثانیے میں اتنی طاقت ہو کہ وہ زندگی کے دن کو رات کردے۔ ایک لمحہ پہلے میں اپنے شوہر سے باتیں کررہی تھی۔ ایک لمحہ بعد وہ اجنبی بن کے چلا گیا۔

اب بجز اس کے کہ میں اپنے آپ کو اس قدر مصروف رکھوں کہ جیمز کا خیال بھی دل میں نہ آئے، میرے لیے اور کوئی صورت نہیں۔

میونخ کی واردات اور مسٹر چیمبرلین کی کارگزاری کے قصے تو تم اخبارات میں پڑھ چکے ہوگے۔ مجھے تو اس کا اندیشہ معلوم ہو رہا ہے کہ ہٹلر رکے گا نہیں۔ آئندہ بہار میں یورپ پر پھر مصیبت آئے گی یا تو وہ پورے چیکوسلواکیہ پر قبضہ کرلے گا یا ہالینڈ پر حملہ کرے گا یا پولینڈ کی باری آئے گی۔ ابھی کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ تعجب معلوم ہوتا ہے کہ اس بین الاقوامی ہیجان کے زمانے میں جب کام کرنے کی اس قدر سخت ضرورت ہے انسان کو اپنے ہی خانگی مسائل اتنے اہم معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن مجھے امید ہے کہ ہر زخم کی طرح یہ بھی مندمل ہوجائے گا۔

تمہاری

میری پاول"

(۳)

لندن

۱۹ رجولائی ۱۹۳۹ء

عزیزی نعیم!

تمہارا خط پڑھ کے بڑی خوشی ہوئی۔ مجھے تعجب ہونے لگا تھا کہ آخر تمہیں ہو کیا گیا، اگر تمہارا یہ خط نہ آجاتا تو میں تو سوچ رہا تھا کہ تمہیں ایک اور مختصر سا خط لکھوں اور پوچھوں کہ تم نے میرے خط کا جواب

کیوں نہیں دیا۔ میں تمہیں اب تک ایک اور خط لکھ بھی چکا ہوتا۔ مگر ایک دو ذاتی معاملات میں مصروف تھا اور ان کے طے ہو جانے کا انتظار کر رہا تھا۔ ہاں اور اگر مہربانی کر کے تم اپنے خطوط پر تاریخ لکھ دیا کرو تو بڑی سہولت ہو۔ اس سے بہر حال آسانی ہوتی ہے اور خصوصاً ہندوستان سے یہاں تک خطوط کے آنے جانے میں کئی دن لگتے ہیں۔

میں تمہارا بہت مشکور ہوں کہ تم نے اپنے اس خط میں میری کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ تم اس قدر دور ہو کہ حالات سے واقف نہیں۔ اس لیے اس ذکر کو چھوڑو۔ کچھ اور حالات سہی۔

مثلاً جدید شاعری۔ تمہیں اس مہینے کی ادبی خبریں سناؤں۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے نئے ڈرامے ''خاندان کا اجتماع'' کے متعلق نقادوں کی کج بحثی کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ اسکروٹنی میں ایک نقاد نے لکھا ہے کہ اس میں جتنے حصے اچھے ہیں، وہ ایلیٹ کی کسی ابتدائی نظم کی صدائے بازگشت ہیں۔ گویا وہ اپنے ابتدائی تخیل کی یاد ہی میں رہنا چاہتا ہے اور پرانے فقرے اُلٹ پلٹ رہا ہے۔ میں نے بھی کم سے کم ایک نقص تو محسوس کیا ہے اور وہ یہ کہ مصرعے چست نہیں ہیں اور کچھ گھٹیا سے ہیں۔ معلوم نہیں، کتاب ہندوستان پہنچی اور تمہاری نظر سے گذری ہے یا نہیں لیکن مجھے تو یہ مشکل سے یقین آتا ہے کہ ایلیٹ جیسے کلاسیکی ماہر سخن نے یہ شعر لکھے ہیں۔

سینکڑوں کتابیں چھپ رہی ہیں۔ جن میں سب سے زیادہ قابل ذکر آرنلڈ ٹائن بی کی ''مطالعۂ تاریخ'' ہے جس کی تین جلدیں شائع ہو چکی تھیں اور تین اب شائع ہو رہی ہیں۔ تحقیق اور مطالعے کا یہ شاہکار گذشتہ دس سال کی بہترین پیداوار ہے۔ باقی بہت سی کتابیں سیاسیات اور سیاسی حالات کے متعلق شائع ہوئی ہیں۔

براعظم کے متاثر حالات کے متعلق بہت سی ''نامہ نگارانہ'' قسم کی کتابیں چھپی ہیں۔ کوئی قابل ذکر ناول دیکھنے میں نہیں آیا۔ یوں شائع تو بہت سے ہوئے ہیں۔

ایک دوسرے فن میں حسب معمول بحث کا سلسلہ جاری ہے۔ اس مرتبہ ایپشٹائن کے نئے مجسمے ''آدم'' کے متعلق۔ لیکن مجموعی طور پر اس کے متعلق یہ رائے قائم کی جا رہی ہے کہ اس مجسمے سے بڑی طاقت اور بصیرت کا اظہار ہوتا ہے۔ میں نے جب یہ مجسمہ پہلی بار دیکھا تو میری نظر جم نہیں سکی۔ کیونکہ اس ناقابل تعرض، امنڈتی ہوئی قوت اور اُبھرنے کی اس تمنا کا تاثر ہی مجھ پر کچھ اس طرح حاوی ہو گیا۔

یہ گویا انسان کے زمین سے اُٹھنے کی مثال ہے۔ اس سے پہلے کسی مجسمے نے مجھے اس طرح مرعوب اور متاثر نہیں کیا تھا۔

موسم۔۔۔ یہ گرمیاں کچھ عجیب ہی ہیں۔ دم گھٹتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کئی بار گرج دار طوفان آئے اور جھڑیاں لگیں۔ جو لوگ چھٹیاں منا رہے ہیں ان کے لیے تو موسم تکلیف دہ ہے مگر گھاس رس دار ہے اور درخت خوب گھنے ہیں۔

سیاسی صورت حال پیچیدہ ہے۔۔۔ بہت زیادہ۔ تمہارے سر میں یہ خیال کہاں سے سما گیا کہ میونک کی شرمناک صورت حال کے بعد ہم بچ جائیں گے۔ ہاں یہ تو بتاؤ کہ تمہیں معلوم ہوا یا نہیں کہ ہروشا کو جرمنوں نے قید کر لیا ہے۔ معلوم نہیں وہ زندہ بھی ہے یا ختم ہو چکا۔ دنیا بھر کی حالت ذلیل ہے۔ فرانس میں دلادئے ایک غیر سرکاری آمرانہ حکومت چلا رہا ہے۔ یہاں کا جو حال ہے سو ہے ہی۔ ترکی، اس جمہوری گلّے میں نئے رنگروٹ بھیڑ کی طرح بھرتی ہوا ہے۔ پولینڈ میں بدترین قسم کی فوجی آمریت ابھی تک باقی ہے لیکن بہر حال انہی ممالک کو اس زمانے کی سب سے بڑی بدنہاد طاقت سے مقابلہ کرنا ہے۔ ڈان تسگ کے معاملے میں ہٹلر اگر کوئی قدم نہ اٹھائے تو اس کے وقار کو اس ملک میں صدمہ پہنچے گا۔ جہاں وہ اگر برسر اقتدار رہنا چاہتا ہے تو اس صدمے کو برداشت نہیں کر سکے گا۔۔۔ یعنی جرمنی میں ۔ اگر وہ قدم اٹھائے اور جمہوریتیں مقابلہ نہ کریں تو ہٹلر مرغ کی طرح بانگ دے گا اور جمہوریتوں کا وقار خاک میں مل جائے گا۔ اگر ہٹلر قدم اٹھائے اور جمہوریتیں مقابلہ کریں۔ تب تو ظاہر ہے کیا نتیجہ ہو گا۔۔۔ جنگ۔

چنانچہ ہر ایک اس کا منتظر ہے کہ کون اگلا قدم اٹھاتا ہے۔ مبصروں کا اندازہ ہے کہ غذا اور مزدوروں کی قلت کی وجہ سے آئندہ فصل کٹنے تک ہٹلر کوئی اقدام نہیں کرے گا۔۔۔ پھر؟

مجموعی طور پر سب یہی کہتے ہیں کہ ٹھہرو، دیکھو کیا ہوتا ہے۔ صورت حال کی نزاکت کا احساس برابر باقی ہے۔ حالانکہ اب یہ ایک مسلسل پستی کی طرح محسوس ہوتا ہے۔ سخت خوف کی صورت میں نہیں۔ حالات اس قدر تیزی سے بدل رہے ہیں کہ اس ہفتے تک کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اگلے ہفتے میں کیا پیش آنے والا ہے۔

اس خط کو بہر حال ختم ہونا ہے۔ میری اور اپنے متعلق میں تمہیں زیادہ لکھنا نہیں چاہتا کیونکہ

واقعات ابھی تازہ ہیں۔ میری مجھے طلاق دینے پر رضا مند نہیں ہو رہی ہے۔ اس لیے میں اس لڑکی سے ۔۔۔ معلوم نہیں میں نے اس سے پہلے کے خط میں اس کا نام تمہیں لکھا تھا یا نہیں۔۔۔ اس کا نام ویکی ہیوز ہے۔۔۔ فوراً شادی نہیں کر سکتا۔ ان حالات کے متعلق میں فی الحال تمہیں زیادہ لکھ بھی نہیں سکتا۔

خط کے ختم پر پھر موسم کا ذکر کرتا ہوں۔۔۔ انگلستان سے جو خط جائے، اسے موسم ہی کے ذکر پر ختم ہونا چاہیے۔ میں دو دن ہوئے اپنی والدہ کے پاس گیا تھا۔ وہاں سے سائیکل پر ایک دوست سے ملنے گیا جو کوئی بیس میل دور رہتا تھا۔ تہائی راستہ ختم کرنے سے پہلے ہی کچھ بوندیں پڑیں۔ پھر زور سے بارش ہونے لگی۔ میں نے ایک بڑے سے درخت کے نیچے پناہ لی۔ جہاں آدھے گھنٹے تک تو پناہ مل سکی۔ پھر پانی اس طرح ٹپکنے لگا کہ میں بھیگ کے شرابور ہو گیا اور گھر واپس لوٹا تو یہ حالت دیکھی کہ ہمارے گاؤں کے اطراف پانی ہی پانی ہے۔ گویا طوفان آ گیا ہو۔ قریب کے ایک گاؤں میں اتنے سخت اولے گرے کے موٹروں کا چلنا مشکل ہو گیا۔ آج ابر چھایا ہوا ہے۔ کبھی کبھی ہلکی سی دھوپ نکل آتی ہے اور کل؟ اس دنیا کا رہنے والا کون انسان کہہ سکتا ہے کہ کل کیا ہوگا؟ انگلستان کے موسم سے بھی زیادہ جلد بدلنے والی صرف ایک چیز ہے۔ یعنی سیاسی صورتِ حال۔ میری دوستی ان دونوں میں سے کسی کی طرح ناپائدار نہیں۔

تمہارا دوست
"جیمز کرا کسلے"

(۴)

کیمبل ہاؤس
ڈنڈی اسکاٹ لینڈ
۴ ستمبر ۱۹۳۹ء

عزیزی نعیم!

دنیا کی حالت کے متعلق اب تمہاری کیا رائے ہے؟ گزشتہ دوشنبہ ہی سے اس ملک میں صاف ظاہر ہو گیا ہے کہ اب جنگ چھڑنے ہی والی ہے۔ اس دن صبح کو لندن میں بچوں کو تخلیہ کرانے کی مشق کی

گئی۔ اصلی تخلیہ دو ایک دن کے بعد شروع ہوگا۔

بہت سے سوالات جو تم نے اپنے گزشتہ خط میں کیے تھے، ان کا جواب زمانے نے دے دیا۔ فی الحال تو میں لندن اور واقعات سے ذرا دور ہوں۔ میں نے غالباً تمہیں لکھا تھا کہ ۳ ستمبر کو مجھے اس نئے اسکول میں ہیڈ ماسٹر کی جگہ کا جائزہ لینا تھا۔ جس ریل سے میں یہاں آیا۔ اس کی کھڑکیوں سے میں انگلستان کے مناظر دیکھتا رہا۔ شاداب اور خوبصورت سرزمین۔ آزاد باشندوں کے گھر۔ ان کی حفاظت کے لیے سب کچھ، یہاں تک کہ جان کو بھی خطرے میں ڈالنا جائز ہے۔

اسی اثنا میں اس گورنمنٹ نے کسی ہٹلر کی بے عیب حکمت کی شان سے جہنم کے دروازے کھول دیے ہیں لیکن اگر یہ دروازے اب نہ کھولے جاتے تو ہم پر اس طرح کھلتے کہ پھر ہمارا جھلس جانا یقینی تھا۔ میں بھی ہیڈ ماسٹری چھوڑ کے ہوائی فوج کی تعلیم کے لیے عنقریب کہیں جاؤں گا۔

یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ یہاں عام لوگوں کا جنگ کے متعلق کیا خیال ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ امید و بیم کا روح فرسا دور گزر جانے کی سب کو خوشی ہے۔ اتوار کے دن ایک بجے کے قریب یہاں ایک سڑک پر میں نے کچھ لوگوں کو باتیں کرتے سنا جو جنگ کو کسی پہاڑ کے ٹوٹ کر گرنے یا کسی کان کے دب جانے کی مصیبتوں سے تشبیہ دے رہے تھے لیکن مجموعی طور پر لوگ خوشی سے لڑنے کے لیے آمادہ ہیں اور پکے قدامت پسندوں کو تو ابھی سے اس بات کا رنج ہے کہ آر، اے، ایف نے جرمنی کے شہروں پر بمباری کیوں نہیں شروع کی۔ اگر غیر فوجی باشندوں اور بچوں پر بمباری کی نوبت بھی آئے۔ تب بھی میری یہی دعا ہے کہ اس بربریت کی ابتدا ہماری طرف سے نہ ہو۔

میں اس خط کو زیادہ طول نہیں دینا چاہتا۔ مجھے اس کا بھی یقین نہیں کہ یہ خط تم تک پہنچ سکے گا۔ لیکن اگر تمہیں مل گیا تو جواب دینے میں دیر نہ لگانا۔ تمہارا خط آئے یا نہ آئے، میں بہر حال تمہیں اگلے مہینے ایک خط اور لکھوں گا۔

اگر خط و کتابت میں کوئی ہرج واقع ہو تو مجھے گھر کے پتے سے خط لکھنا۔ اس پتے پر غالباً مل جائے گا۔

تمہارا دوست
"جیمز کرا کسلے"

(۵)

"گلاڈسٹر اسٹریٹ

وکٹوریہ۔ لندن

۱۰ رمئی ۱۹۴۰ء

پیارے نعیم!

میں ابھی تک تمہارے جواب کی منتظر ہوں۔ شاید میرا ہی خط راستے میں ضائع ہوگیا اور تم اس کا انتظار کر رہے ہو گے۔ معلوم نہیں کتنے دن میں تمہیں میرا خط ملے۔

مجھے بڑی آرزو یہ ہے کہ کاش اس وقت میں تم سے باتیں کر سکتی۔ دل کی بھڑاس نکال سکتی۔ یہ عجیب بات ہے کہ تم اس قدر دور ہو۔ مگر دراصل دور نہیں معلوم ہوتے اگر تم اس وقت آکے میرا دروازہ کھٹکھٹاؤ تو مجھے تم کو دیکھ کے حیرت نہیں ہوگی۔ صرف اس پر تعجب ہوگا کہ جنگ کے زمانے میں تم کیسے آگئے۔

جب سے جنگ چھڑی ہے میں ایک عجیب ذہنی کرب میں مبتلا ہوں۔ روس کی وجہ سے۔ جرمنی اور روس کی مصالحت نے اگست ۱۹۳۹ء سے میرے دماغ کو مختل کر دیا ہے۔ جان اسٹریچی اور بہت سے دوسرے اشتمالیوں کی طرح مجھے بھی روسی اشتمالیت کی مخالفت کرنا پڑی۔ لیکن اس سے بھی میرے قلب کو کوئی تسکین نہیں ہوئی۔ جب روس نے فن لینڈ پر حملہ کیا تو ریڈیو پر یہ خبر سن کے میں ریڈیو کے بٹن کی طرف دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

جرمنوں نے جس برق آسا تیزی سے ناروے پر حملہ کر کے فتح حاصل کی ہے، اس کی وجہ سے میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ بالآخر چیمبرلین کے بعد چرچل وزارت بنانے میں مصروف ہے اور عمالی جماعتیں ساتھ دے رہی ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی میں نے ریڈیو پر خبر سنی ہے کہ جرمنی نے بلجیم اور ہالینڈ پر حملہ کر دیا ہے۔

ذاتی طور پر تو میں یورپ اور تمدن اور اشتمالیت سب سے بیزار ہوگئی ہوں۔ اب جنگ انگلستان سے بہت قریب آگئی ہے۔ جیمز کراکسلے سے میں ڈیڑھ سال سے نہیں ملی لیکن مجھے اس کی جان کا ڈر

ہمیشہ لگا رہتا ہے۔ اب وہ شاہی ہوائیہ میں ہے اور عنقریب بلجیم یا فرانس بھیج دیا جائے گا۔ یہ تو میرا دل ہمیشہ سے کہتا رہا ہے کہ اس جنگ میں اس کا مارا جانا یقینی ہے۔

معاف کرنا کہ میں ایسا پست اور رنجیدہ انداز کا خط لکھ رہی ہوں۔ لیکن اس وقت اگر میں اپنے آپ کو خوش ظاہر کروں تو یہ جھوٹ ہوگا اور تمہیں مہملات تحریر کرنا نہ صرف بے سود ہے بلکہ میرا دل بھی اس سے مطمئن نہ ہوگا۔ میری والدہ البتہ بہت پُرامید ہیں۔

میرے دن ہمیشہ کی طرح گذر رہے ہیں۔ دن کو تخلیہ شدہ اطفال کے چال چلن کی نگرانی کرتی ہوں اور شام کو سپاہیوں کے لیے پائتابے بنتی ہوں اور نیٹشے کو پڑھتی ہوں۔ یہ دونوں کام ساتھ کرتی ہوں۔ اس طرح میرا وقت نہ صرف سپاہیوں کے پائتابے بننے میں ضائع ہوتا ہے نہ صرف نیٹشے کو پڑھنے میں۔

ہمیشہ کی طرح تمہیں بے انتہا چاہنے والی

"میری پاول"۔

(۶)

بیگم شہزور خاں نے نعیم کی طرف چائے کی پیالی بڑھانے سے پہلے پوچھا "کتنے چمچے شکر؟"

"دو۔ شکریہ۔" نعیم نے جواب دیا اور موٹی ادھیڑ بیگم شہزور خاں کی ساڑی کو دیکھنے لگا۔

یہ جنوری ۱۹۴۲ء کا واقعہ ہے۔ نعیم ان دنوں دہلی میں نواب شہزور خاں کے یہاں مہمان تھا۔ جب نواب صاحب نے اسے کرسمس کی چھٹیوں میں بلایا تھا۔ اسی وقت وہ سمجھ گیا تھا کہ بیگم شہزور خاں کا اس کے مستقبل کے متعلق کوئی ارادہ ہے۔ کیونکہ بیگم شہزور خاں منصوری، نینی تال اور دہلی میں محض اسی وجہ سے بہت مشہور تھیں کہ انہوں نے سینکڑوں نوجوانوں کی پکڑ دھکڑ کے شادیاں کرائی تھیں۔

چنانچہ یک لخت بیگم شہزور خاں نے پوچھا۔ "تم شادی کیوں نہیں کرتے؟"

نواب شہزور خاں اپنی بیوی کے اس فوری حملے کا اثر نعیم کے چہرے پر دیکھنے لگے۔ جب نعیم مسکرایا تو وہ بھی مسکرانے لگے۔

نعیم نے جواب دیا۔ "کیا عرض کروں بیگم صاحبہ! کوئی لڑکی نہیں ملتی۔"

"خدا کی شان ہے۔ تم ماشاء اللہ آئی۔ سی۔ ایس۔ اچھی خاصی شکل و صورت، جہاں پیام بھیجو، لوگ قدموں پر گر کے شادی کریں۔"

اس کے بعد ایک دلچسپ سلسلۂ گفتگو شروع ہو گیا۔ بیگم صاحب نے بکثرت لڑکیوں کے نام گنا ڈالے۔ ان کی صفات اور ان کے حُسن کا تجزیہ کیا۔ تصویریں دکھائیں اور لڑکیوں کو دکھانے اور ان سے ملانے کا وعدہ کیا۔

دوسرے دن شام کو بیگم صاحب ایک مقامی کالج میں انعامات تقسیم کرنے جا رہی تھیں۔ بیگم صاحب نے کچھ اس معصومانہ خلوص سے نعیم کو اس کالج چلنے اور وہاں کی لڑکیوں میں سے کسی ایک کو انتخاب کرنے کی دعوت دی کہ وہ کم از کم ساتھ چلنے سے انکار نہ کر سکا۔

جلسے کی کارروائی شروع ہوئی۔ مرد مہمان بہت کم تھے۔ لڑکیوں کے اقارب اور سب ہی طرح کی لڑکیاں تھیں۔ ہندو، مسلمان، عیسائی، پارسی۔ رنگ کے اعتبار سے کئی گوری لڑکیاں بھی تھیں۔ کالی بھی، سانولی بھی۔ ہندوستان کے ہر صوبے کی لڑکیاں۔ جلسے کے دوران میں نعیم اُردو افسانہ نگاروں کی ان ہیروئنوں کو دیکھتا رہا۔ بالآخر اس کا ذہن ایک ناقابلِ حل گتھی کے سُلجھانے میں مصروف ہو گیا۔ شلوار زیادہ بہتر لباس ہے یا ساری، کرتے اور شلوار میں سینہ زیادہ نمایاں معلوم ہوتا ہے لیکن شلوار میں اتنی نسوانیت نہیں جتنی ساری میں ہے۔ خصوصاً رفتار کا لطف تو ساڑی میں ہی آتا ہے۔ ذوق اور آسائش میں بھی ساڑی بڑھ کے ہے۔ لیکن شلوار کی خوبیاں بھی کچھ کم نہیں۔۔۔ کوئی لڑکی دراز قد ہو اور اس کا سینہ اُبھرا ہوا ہو تو شلوار اس پر ساڑی سے ہزار درجے زیادہ اچھی معلوم ہوگی۔

ایک لڑکی تقریر کرنے لگی۔ تنگ مہری کا پاجامہ، اونچی ایڑی کے جوتے، اطلس کی واسکٹ پہنے اور دوپٹہ اوڑھے تھی مگر رنگ سانولا تھا۔ اور خدوخال بالکل معمولی تھے۔

نعیم سوچنے لگا کہ جو لڑکیاں قمیص اور شلوار پہنتی ہیں، ان کے دوپٹے عموماً ان کی گردنوں کا ہار بن کے رہ جاتے ہیں۔ سینے پر نہیں رہتے اور ان کے سینے بڑے خوشنما معلوم ہوتے ہیں۔

جلسے کے باہر سبزے کے تختے پر چائے کا سلسلہ شروع ہوا۔ وہ دو تین تین کی ٹولیوں میں وہ اِدھر اُدھر آتی جاتی لڑکیوں کو دیکھتا رہا۔ زیادہ تر لڑکیاں رنگین قمیص اور سفید شلواریں پہنے تھیں۔ ایک کالی شلوار پہنے تھی۔

نعیم پھر سوچنے لگا۔ اگر مزدوروں کی تمام تحریکیں مٹا دی جائیں، اگر روس کو فی الحقیقت شکست ہو جائے تو اس صورت میں بجائے سرمایہ داری کی مخالفت کی تحریکوں کے اگر ساڑی کی مخالفت کی ایک تحریک شروع کی جائے تو کس قدر مناسب ہوگا۔ ساڑی کی مخالفت میں ہر ضلع اور ہر تحصیل میں کمیٹیاں اور سب کمیٹیاں قائم کی جائیں۔ اور کوہ ہندوکش سے لے کر برہم پتر کے اس پار تک اور کنچن چنگا سے کولمبو تک شلوار ہی شلوار ہو۔ شلوار زندہ باد۔

سامنے کی میز پر دو بڑی خوبصورت پارسی لڑکیاں ایک قشقہ بر جبیں ہندو لڑکی سے ہنس ہنس کے باتیں کر رہی تھیں۔ اتنے میں کالی شلوار والی لڑکی کو بیگم شہزور خاں نے ہاتھ کے اشارے سے بلایا۔ یہ لڑکی قریب آئی تو نعیم نے دیکھا کہ اس کے خوبصورت ہونے میں شک کی گنجائش ہی نہ تھی۔ ہلکے بھورے بال جو گھٹنوں کے قریب قریب پہنچتے تھے۔ دراز قد، جسم ذرا گداز، رنگ نہایت صاف، ناک نقشہ بہت اچھا۔ بیگم شہزور خاں نے نعیم سے اس کا تعارف کرایا اور لڑکی کا نام ماہ پارہ صلاح الدین بتایا۔ وہ پنجاب کے کسی کمشنر (پنشن یافتہ) کی لڑکی تھی۔ اس نے نعیم سے باتیں بھی کیں لیکن نعیم کو بلقیس یاد آنے لگی۔ یہ سب موم کی گڑیاں اس کے لیے نہیں بنی تھیں اور بلقیس اس کی قسمت میں نہ تھی۔

واپسی میں موٹر میں بیگم شہزور خاں نے نعیم سے پوچھا۔ "کیوں ماہ پارہ تمہیں پسند آئی؟"

نعیم نے جواب دیا۔ "جی ہاں، بڑی اچھی لڑکی ہے، کسی اچھی جگہ اس کی شادی کرا دیجیے۔"

"تم نہیں کرو گے؟" بیگم شہزور خاں نے سوال کیا۔

نعیم مسکرا کے آٹوگراف کی کتابیں اُلٹنے پلٹنے لگا۔

بیگم صاحب نے پھر وہی سوال دُہرایا تو نعیم نے بات ٹالنے کے لیے پوچھا: "بیگم صاحب، آپ اجازت دے دیں تو میں ان آٹوگراف کی کتابوں کے کچھ حصے آپ کو سناؤں جو ان لڑکیوں نے آپ کی دستخط کی عزت حاصل کرنے کے لیے پیش کی ہیں؟"

بیگم صاحب خاموش ہو گئیں تو نعیم نے ایک آٹوگراف کی کتاب کھولی:

نعیم نے سنانا شروع کیا۔ "صاحبزادی کا نام ہے، جہاں آرا قریشی۔"

بیگم صاحب بول اٹھیں۔ "ہاں میں اس لڑکی کو جانتی ہوں۔"

نعیم نے کہا۔ "سُنیے ان کی ایک بے کل روح پرور بانو نے ان کی آٹوگراف بک میں کیا لکھا ہے:

''جہانی تم نے مجھ سے لکھنے کو کہا ہے اور ایسے زمانے میں جب میرے رنج کا سیلاب صبر وسکون کی حد سے ٹکرا رہا ہے اور ڈر ہے کہ کہیں اس بند کی بندش کو توڑ نہ دے۔ غور کرتی ہوں کہ کیا لکھوں۔ خیر جو کچھ دماغ میں آتا ہے صفحۂ قرطاس پر لکھتی ہوں۔

جہاں آرا تم اس حسین دھنک کی طرح ہو جو بارش کے بعد آسمان پر نمودار ہوتی ہے۔ تم اس تیتری کی مانند ہو جس کے پروں پر قوس قزح کے رنگ ہوتے ہیں۔ تم عطر بیز نسیم، غرض اور کیا کچھ لکھوں۔ بس یہیں تک لن ترانی ٹھیک ہے۔ خدا تمہاری ہر ایک خواہش میں تم کو کامیاب اور کامران رکھے۔

تمہاری قابل فراموش

''روح پرور بانو۔''

نعیم نے ہنس کے رائے دینی شروع کی ''سبحان اللہ، سبحان اللہ، بیگم صاحبہ ملاحظہ فرمائیے، کیا انشا پردازی ہے، اور سہیلیوں کے آپس کے جذبات تو ملاحظہ فرمائیے۔''

بیگم شہزور خاں نے کہا۔ ''تم رہنے بھی دو۔ لڑکیوں نے یہ کتابیں اس لیے تو نہیں دی ہیں کہ تم ان کا مذاق اڑاؤ۔''

نعیم نے ورق گردانی کرتے ہوئے کہا۔ ''اور سنئے، کچھ نظم نما نثر بھی ہے جو صاحبزادے اس کے مصنف ہیں ان کا اسم گرامی خالد ہے۔ ارشاد فرماتے ہیں:

''ایسی کتاب میں کچھ لکھنا
جسے خواتین دیکھیں
اور جسے مرد چھپ چھپ کے پڑھیں
یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا
میں شرمیلا ہوں
اس لیے خدا حافظ
بے انتہا پیار کے ساتھ۔۔۔۔

تمہارا اپنا خالد''

''یہ صاحبزادی تو معلوم ہوتا ہے، دل ول دے چکی ہیں۔ اب بیگم صاحبہ ان سے شادی کرانے سے کیا حاصل؟''

بیگم شہزور خاں نے کہا۔ ''بھئی تم بڑے شریر ہو۔ میں تم سے ماہ پارہ سے شادی کرنے کو کہہ رہی ہوں۔''

''اچھا دیکھئے یہ ہے ماہ پارہ کی آٹوگراف کی کتاب۔ کیوں کچھ سنئے گا؟''

''بھئی تم رہنے دو۔ ان کتابوں میں کیا رکھا ہے؟''

''سنئے آپ کی ماہ پارہ بیگم کی ایک سہیلی گیتی کا ارشاد ہے۔۔۔ اچھا، یہ ماہ پارہ بیگم کونوٹ میں بھی پڑھ چکی ہیں، گریجویٹ ہیں، یہاں ایم۔اے میں ہیں۔۔۔؟ بیگم صاحبہ دلہن تو آپ نے میرے لیے خوب انتخاب کی ہے۔ اب ملاحظہ فرمائیے۔ ان کی سہیلی گیتی بیگم کا ارشاد ہے:

''میری پیاری ماہ پارہ تم نے ایسے وقت میں مجھے آٹو عنایت کی ہے کہ ایک تو امتحان سر پر سوار ہے، دوسرے رمضان شریف تشریف رکھتے ہیں۔ تم خود انصاف کر سکتی ہو کہ مجھ جیسی کمزور ناتواں بھولی بھالی لڑکی کس طرح اپنے خیالوں کو یکجا کر سکتی ہے۔ مگر تم جیسی ہستی کے لیے ہر بات ممکن ہو سکتی ہے۔ اب میرے اس لکھے ہوئے پر عمل کرو۔ محبت دنیا کو آباد کرتی ہے۔ محبت کی طاقت بے انتہا ہے۔۔۔ بے حد ہے۔ جو لوگ محبت کی دنیا سے باہر رہتے ہیں۔۔۔ ان کی زندگی سرد۔۔۔ خشک۔۔۔۔۔۔۔ بے مزا۔۔۔۔۔۔۔ بے کار اور بے معنی ہوتی ہے۔ اپنے آپ کو محبت کے حوالے کر دو اور اسے رہبری کرنے دو۔۔۔ وہ تمہیں ایسے راستوں پر لے جائے گی جو تجربوں سے پر ہوں گے۔۔۔ تم پر طرح طرح کی بلائیں ٹوٹ پڑیں گی جو تمہاری دنیا کو عارضی جنت یا جہنم میں تبدیل کریں گی۔۔۔ مگر۔۔۔ کچھ دنوں کے لیے۔۔۔ ان سے مت گھبراؤ۔ کبھی محبت کا ساتھ بھولے سے بھی مت چھوڑو۔ محبت کا دامن ہمیشہ پکڑے رہو۔ بلکہ محبت سے چمٹی رہو۔ محبت کے سائے میں پیدا ہوئی ہو، اسی میں رہو۔ اسی میں مرو۔ تم قانون قدرت کی پابندی کرو گی اور۔۔۔ یہی تمہاری زندگی کا اصل مقصد ہے۔

تمہاری اپنی دوست

''گیتی آرا''

بیگم شہزور خاں نے پوچھا۔ ''کیوں چپ کیوں ہو گئے۔ اس میں بری بات کیا ہے؟''

''کچھ بھی نہیں۔'' نعیم نے جواب دیا۔ ''بجز اس کے میرے خیال میں گیتی آرا بیگم نے یہ پورا مضمون کسی تیسرے درجے کی اُردو کتاب یا رسالے سے اُڑایا ہے۔''

''تو اس میں ماہ پارہ کا کیا قصور ہے؟'' بیگم صاحب نے پوچھا۔

''کچھ نہیں، اور سنیے کوئی عالیہ صاحبہ ہیں۔ انہوں نے آپ کی ماہ پارہ کو اسی مضمون کا ایک شعر مرحمت فرمایا ہے۔ لکھتی ہیں:

کوئی حد نہیں شاید محبت کے فسانے کی
سناتا جارہا ہے جس کو جتنا یاد ہوتا ہے

ماہ پارہ کے لیے ایک خاص نصیحت آمیز شعر

آپ کی بہن ''عالیہ''

''ماشاءاللہ کیا دل چھینک لڑکیاں واقع ہوئی ہیں۔''

اتنے میں موٹر نواب شہزور خاں کی کوٹھی میں جاکے ٹھہر گئی۔ نواب صاحب باہر ٹہل رہے تھے۔ وہ فوراً ہی موٹر کے قریب آئے اور پوچھنے لگے۔ ''کیوں نعیم صاحب جلسہ کیسا تھا؟''

''جلسہ تو اچھا خاصا تھا۔ میں نے طے کیا ہے۔ اگر کسی سبب سے مغرن ختم کر دی جائے تو اشتمالیوں کو مشورہ دوں کہ ایک کل ہند حمایت شلوار قائم کی جائے اور ایک بین الاقوامی محاذ سازی کے خلاف تیار ہو۔''

''کوئی لڑکی پسند آئی؟'' نواب شہزور خاں نے پوچھا۔

''ایک لڑکی کو بیگم صاحب نے میرے لیے پسند فرمایا ہے۔ ماہ پارہ نام ہے۔۔۔ پنجاب میں پیدا ہوئی۔ لکھنؤ میں تعلیم پائی اور دہلی میں تعلیم کی تکمیل کر رہی ہے۔ ماشاءاللہ بالکل بین الصوبہ جاتی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ اس کی آٹوگراف کی کتاب ہے۔ نواب صاحب ذرا یہ نقشہ ملاحظہ فرمایئے۔''

نام	سہیلی	نوجوان دوست بشرطیکہ کوئی ہو	محبوب جانور	محبوب پھول	مشغلہ	پسندیدہ ایکٹر	پسندیدہ ایکٹرس	مستقبل کا ارادہ
ماہ پارا	گیتی آرا	''س''	خرگوش	کوکنار	کھانا	لیزلی ہوورڈ	نمّا	غالباً شادی
گیتی آرا	ماہ پارا	''ی، ح''	کتا	جوہی	تصویریں جمع کرنا	اشوک کمار	نسیم	ڈاکٹری
جہاں آرا	روح پرور	''ک، ز''	بلی	گلاب	پرانے ٹکٹ جمع کرنا	پاروی لال	خورشید	شادی

نعیم اور نواب صاحب دونوں ہنسنے لگے۔ بیگم صاحب نے کہا۔ ''ذرا میں بھی دیکھوں۔'' نعیم نے آٹوگراف البم ان کے سپرد کردی۔ بیگم صاحب نے کہا۔ ''اس میں کیا ہے۔ یہ تو لڑکیوں کا کھیل ہے۔''

نعیم نے جواب دیا۔ ''بجا ارشاد ہوا۔ لیکن آپ ہی فرمایئے میں نہ تو ماہ پارہ بیگم کا نوجوان دوست ''س'' ہوں۔ نہ ان کا محبوب جانور خرگوش، نہ ان کا پسندیدہ ایکٹر لیزلی ہوورڈ اب آپ نے اگر مجھ سے ان کی شادی کرا بھی دی تو بتایئے وہ بھلا کیا خوش رہیں گی۔ پھر معلوم نہیں یہ 'غالباً شادی' کیسی ہوتی ہے۔''

نواب صاحب نے کہا۔ ''یہ تو سب بے ضرری باتیں ہیں۔''

(۷)

۱۹۳۲ء میں کشمیر۔ گلمرگ کے مزدور اب بھی کئی کئی من کے ٹرنک اپنی پیٹھ پر لا کر تین ہزار فیٹ کی بلندی پر چڑھ رہے تھے۔ اب بھی جہلم کے کنارے مزدور سینوں پر رسیاں باندھے دریا کے بہاؤ کے خلاف ڈونگوں کو کھینچے جاتے، گویا دانتے کے جہنم میں گنہگاروں کی روحیں جانوروں کی طرح اپنے گناہوں کے بوجھ کھینچ رہی ہیں۔ کبھی کبھی مرد تو ڈونگوں اور کشتیوں میں بیٹھے رہتے، اور مزدور عورتیں اور بچے سینوں پر رسیاں باندھے ان کشتیوں کو کھینچتے دکھائی دیتے اور نعیم کو تعجب ہوتا کہ کیا ان عورتوں کے شفاف سینے اسی لیے بنائے گئے ہیں۔ اب بھی ٹٹو والے اپنے ٹٹو کے ساتھ پہلگام سے چندواڑی تک اٹھارہ میل کا چکر لگاتے تو ان کو دو روپے تین آنے مزدوری ملتی اور اگر وہ پہلگام کے ایک ہوٹل میں کسی مسافر سے اپنے

کرائے کے پیسے مانگنے آتے تو ہوٹل کا مالک چھڑی سے انہیں جانوروں کی طرح مارتا۔ اس سال سیاحوں کی کثرت تھی کیونکہ جنگ کی وجہ سے انگریز یورپ نہیں جا سکتے تھے۔ بہت سوں نے کشمیر کا رخ کیا۔

نعیم نے کشمیر کی اچھی خاصی سیر کی۔ سری نگر میں نیڈوز ہوٹل میں ناچا۔ نشاط باغ دیکھا، شالامار دیکھا، نئے اور پرانے محل دیکھے۔ ڈل جھیل دیکھی، جس کے مقابلے میں کومو اور جھیل لیمان حقیر معلوم ہوتی ہیں۔ سونا مرگ گیا، جہاں ہر سال سڑک بنتی ہے اور ہر سال پہاڑ سے بڑی بڑی چٹانیں ٹوٹ کر گرتی ہیں۔ ایک چٹان ٹوٹ کر گری تھی اور اب تک راستے پر پتھر گرتے تھے۔ تاجواس سے اس نے گلیشیروں کی وادی کا منظر دیکھا۔ نیچے وادی میں ایک تیز رفتار چشمہ بہتا ہے۔ صنوبر کے درخت پہاڑوں پر چڑھتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک بلندی پر پہنچ کے صنوبروں کی زندگی مشکل ہو جاتی تھی اور پھر برف ہی برف تھی۔ ہزاروں فیٹ کی چوٹیوں تک بلند ہوتی ہوئی برف۔ سامنے تاجواس کا گلیشیر تھا۔ تہ بہ تہ، قاش بہ قاش برف۔ برف کی چٹانیں۔ گلیشیروں کی وادی کے سرے پر کولاہوئی کا گلیشیر تھا اور کولاہوئی کے پہاڑ کی چوٹی۔ اس وادی کا حسنِ ہیبت ناک انسان کی نفسیاتِ خودی پر پہاڑ کی طرح حاوی معلوم ہوتا تھا۔ گویا قدرت کی بلندی بجائے خود ایک اوبے لائش ہے جو انسانی نظر تک کو وہیں کے رکھ دیتی ہے۔

تاجواس میں اس وادی کے سامنے خیمے لگائے، آرام کرسی پر دراز نعیم، شیلے کی نظم الاسٹر پڑھ رہا تھا۔ وہ ان اشعار تک پہنچا، جو بڑے حسب حال معلوم ہوئے:

”شاعر بھٹکتا ہوا

عرب اور ایران اور کارمنی بنجر زمینوں سے ہوتا ہوا گذرا

اور ان ہوائی پہاڑوں پر سے جو اپنے برفانی غاروں سے

دریائے سندھ اور دریائے جیحوں کو انڈیلتے ہیں

مسرت اور انبساط اس کے ہمرکاب تھے

یہاں تک کہ کشمیر کی وادی میں (کشمیر کی) سب سے پیاری گھاٹی

میں بہت دور، جہاں خوشبودار پودے

کھوکھلی چٹانوں کے نیچے آپس میں لپٹ کے

ایک قدرتی برگ پوش مسکن بناتے ہیں

ایک پھنتی ہوئی ندی کے کنارے

اس نے اپنے تھکے ہوئے ہاتھ پاؤں پھیلائے۔“

لیکن دو ہی چار منٹ کے بعد جب نعیم نے ٹٹو والے سے اس منظر کی تعریف کی تو اس نے جواب دیا۔ ”جناب ہم کیا کرے گا۔ ہمارے واسطے تو یہ جہنم ہے، جناب! ادھر غربت بہت ہے۔ ہم پر بڑا ظلم ہوتا ہے۔ سال میں چھ مہینے بخشش مل جاتا ہے چھ مہینے ہم گھر میں بیٹھتا ہے۔ بھیڑ کے اُون سے کپڑے بناتا ہے۔ کپڑا بہت مہنگا ہو گیا ہے۔ ادھر غریب پر بہت ظلم ہوتا ہے۔“

زوجی لا کا پہاڑ سونا مرگ کے ہرے بھرے مرغزاروں سے بڑا خوشنما نظر آتا ہے۔ ہوا اتنی لطیف ہے کہ کبھی کبھی مسافر دن کے تین بجے زوجی لا کی چوٹی سے اُوپر بے نور چاند کو صاف دیکھ لیتا ہے۔ سونا مرگ کے ایک تنگ راستے پر ٹٹو پر بیٹھے نعیم زوجی لا کی سفید چوٹی سے بھی بہت اونچے چاند کو دیکھ رہا تھا کہ ایک ٹٹو والے نے جو سامنے سے آ رہا تھا، زور سے ”ہوشا ہوش ہوش“ کہا۔ اس ٹٹو پر ایک انگریز عورت سوار تھی۔ کارڈوارے کے سلیک پہنے۔ دفعتہً اس نے اپنا ٹٹو روک لیا اور تعجب اور خوشی سے کہا۔ ”نعیم!“

نعیم نے اسے پہچاننے کی کوشش کی۔ آنکھوں کے گرد حلقے تھے۔ چہرے پر کہیں کہیں ہلکی ہلکی شکنیں تھیں لیکن ان سیاہ حلقوں، ان شکنوں کے پیچھے اس نے میری پاول کو پہچان لیا۔

”میری!“ اس نے بھی اسی خوشی اور استعجاب سے اس کا نام دُہرایا۔ ”مگر تم یہاں کہاں؟“

”دنیا بہت مختصر ہے، ہے نا؟“ میری نے جواب دیا۔

ہمیشہ غیر متوقع طور پر میری سے اس کی ملاقات ہوئی۔ سہ پہر انتظار کرا کے رات کو وہ ہروشا کے ساتھ پیرس کے قہوہ خانے میں نمودار ہوئی تھی۔ اس کے اپنے کمرے میں وہ اس وقت آئی جب اسے سان گمان بھی نہ تھا۔ اسی طرح ہندوستان جاتے وقت وی آنا کے اسٹیشن پر اس سے ملاقات بھی عجیب اتفاق تھا، اور اب یہاں۔ سونا مرگ میں۔

دونوں اپنے ٹٹوؤں سے اُتر پڑے۔ میری یہاں خیمہ لگا کے گلیشیر کی تصویر بنانا چاہتی تھی۔ معلوم نہیں، اس نے مصوری کب سے شروع کی تھی۔ نعیم نے بھی سری نگر واپس جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

میری پر یکلخت خزاں آ گئی تھی۔ بلکہ آ کے گذر بھی گئی تھی اور اب سرما ہی سرما تھا۔

اس قدر جلد تیس سال سے کچھ اُوپر اس کی عمر تھی مگر وہ چالیس کی معلوم ہوتی تھی۔ وہ ذرا جھک بھی

نی سی۔ ''گلِ سرخ'' کی ساری شادابی اور سرخی رخصت ہو چکی تھی۔ سفیدی کے سوا اب زردی ہی زردی تھی۔

میری نے کہا۔ ''جیمز کے متعلق تمہیں معلوم ہوا؟''

نعیم نے کہا۔ ''نہیں سال ڈیڑھ سال سے نہ جیمز کا کوئی خط ملا نہ تمہارا۔''

میری نے آہستہ سے جواب دیا۔ ''جیمز کرا کیلے اب کبھی تمہیں خط نہ لکھے گا۔ ڈنکرک سے وہ واپس نہیں آیا۔ اس کی موت کی تصدیق ہو چکی ہے۔''

اور اس کے بعد میری نے اپنا قصہ سنایا۔ وہ یونان میں تھی۔ وہاں سے اور تخلیہ کنندگان کے ساتھ ساتھ وہ ترکی اور پھر ایران آئی۔ جب ایران پر اتحادی فوجوں نے حملہ کیا تو وہ بلوچستان پہنچی اور وہاں سے کشمیر، اپنی پریشانیوں کی وجہ سے وہ نعیم کو خط نہ لکھ سکی لیکن اسے یقین تھا کہ نعیم سے ہندوستان میں ضرور ملاقات ہوگی۔

نعیم نے میری کا بوسہ لیا تو اس نے اس کے لبوں پر موت کی سی سردی محسوس کی۔ میری کے پسلیاں نکل آئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں بھی ایک بھوت کی آنکھوں کی سی چمک تھی۔ ان بلند و بالا برف پوش پہاڑوں کے درمیان وہ ایک لاش معلوم ہوتی تھی۔ موت آ چکی تھی اور اب نہ اس کا جسم زندہ تھا، نہ اس کی روح۔ ہروشا نے کہا تھا کہ جب میری پر خزاں آئے گی تو یکلخت آئے گی۔ جب تک ''گلِ سرخ'' زندگی کا مقابلہ کرتی رہے گی، اس کے رنگ و بو میں فرق نہ آئے گا مگر جس دن وہ زندگی سے ہار مان لے گی۔ اسی دن وہ بوڑھی ہو جائے گی۔

(۸)

شکارے میں بیٹھ کر سری نگر کے سات پلوں کی سیر کرتے وقت نعیم کے دل میں عجیب عجیب خیالات آ رہے تھے۔ جہلم کتنی گندی ہے۔ اس کا پانی کتنا بدبودار اور کنارے پر یہ بوسیدہ مکانات۔ یہ قرونِ وسطیٰ کا سا منظر، اور یہ ہارون الرشید کے زمانے کا بغداد۔ اس جنت کی حوریں، غلیظ اور کثیف کپڑوں کے باوجود حسنِ نسوانی کا یہ عالم کہ آنکھیں دیکھتی کی دیکھتی رہ جائیں۔ ان حوروں کو دیکھ کر نظربازی گناہ نہیں۔

کور بہ چشمی کہ لذت گیرِ دیداری نہ شد
بشکند دستی کہ خم در گردنِ یاری نہ شد

اس غلاظت اور اس غربت میں بھی حسن اس طرح نمایاں ہے، یہ حسن کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ بدلیوں میں بھی آفتاب کی چمک باقی ہے۔

لیکن اس کا اپنا ہاتھ بھی کسی کی گردن میں خم ہوگا؟ ایلس کا کچھ پتہ نہیں۔ دو تین سال سے اس کا خط نہیں آیا۔ میری بھوتنی بن گئی ہے۔ بلقیس کسی اور کی ہو چکی ہے لیکن کیا اس کا امکان نہیں کہ بلقیس کے اور راحت خاں کے تعلقات دن بدن خراب ہوتے جائیں اور جیسا کہ خانم نے کہا تھا، واقعۃً خلع کی نوبت پہنچے۔ کیا جذبِ دل سے بلقیس تب بھی اس کی طرف نہ جھکے گی؟ بلقیس کی آنکھوں نے تو بہت کچھ کہہ دیا تھا۔ ممکن ہے، ممکن ہے، کون جانے؟

یا ماہ پارہ صلاح الدین؟ ماہ پارہ اور صلاح الدین کا بھلا ذرا جوڑ بھی ہے — فاتحِ فلسطین کے ہمنام کی لڑکی کا نام ترکی کنیزوں جیسا۔ مگر یہ اس کا نوجوان دوست ''س'' کون ہے۔ غالباً بچپن کا خواب و خیال کا بے ضرر سا عشق ہو۔ جس کی اصلیت کچھ نہیں اور اگر کہیں ماہ پارہ سے شادی ہو جائے تو گھر کا نقشہ کتنا دلچسپ ہوگا۔ کوئی دس پندرہ پالتو خرگوش۔ فرسٹ شو میں لیزلی ہوورڈ کا کوئی فلم اور ویک اینڈ شو میں نیما کا فلم۔ گھر کے صحن میں کوکنارے کے پھول۔ معلوم نہیں برہم پتر کے کنارے کوکنار اُگیں گے بھی یا نہیں۔ خیر کھانا تو اچھا ملے گا۔ اور کبھی کبھی گیتی آرا بیگم آ کے محبت کے فضائل پر تقریریں کیا کریں گی۔ ماشاءاللہ کیا دلچسپ زندگی ہوگی اور بالآخر نعیم نے مسکرا کے فیصلہ کیا۔ ''نہیں بھئی یہ ماہ پارہ بیگم تو میرے بس کی نہیں۔ بیگم شہزور خاں برا مانیں یا نہ مانیں۔ میں تو معذور ہوں۔''

شکارا پلٹ کے یار قند سرائے سے آگے بڑھ چکا تھا۔ دور پہاڑوں کے پس منظر کے ساتھ، اور خود ایک بلندی پر ہری پربت کا قلعہ بڑا خوبصورت معلوم ہو رہا تھا۔

جہانگیر بھی اسی طرح جہلم کی سیر کرتا ہوگا۔ اگر روشنی سے زیادہ ہلکے ہو کے روشنی سے زیادہ تیز رفتار سے ماضی میں سفر کیا جائے تو جہانگیر کے زمانے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ مگر آئن سٹائن نے یہ بھی تو کہا ہے کہ کسی مادی جسم کا روشنی سے زیادہ تیز سفر کرنا ناممکن ہے۔ چلئے جو امید بندھی تھی وہ ٹوٹ گئی۔ اس مختصر سی زندگی میں انگلستان کے تین بادشاہوں کی بادشاہت دیکھ لی۔ یہی کیا کم غنیمت ہے۔

وہ تمام عمر کنوارا ہی کیوں نہ رہے؟ اس میں کیا برائی ہے۔ جنگ کے بعد ہر دوسرے تیسرے سال یورپ کا سفر۔

جہلم کی غلاظت۔ خدا کی پناہ۔

اور اس وقت ڈان کا رنگ سُرخ ہے۔ حملہ آور جرمنوں کے خون سے۔ کیا اب بھی نعیم کے دل میں اشتمالیت اور انسانی مساوات کے تصور کی ذرا بھی چنگاری باقی تھی؟ کاش اس میں اتنی ہمت ہوتی۔ کاش اس میں اتنی جرأت ہوتی۔ وہ برہم پتر کے کنارے کی کوٹھی اور جہلم کی سطح کے شکارے دونوں کو چھوڑتا ـ ـ ـ جمو کراکسلے کی طرح اس کا ہوائی جہاز بھی ناتسی آسمانوں پر اُڑتا۔ وہ ڈان میں ظالموں اور مظلوموں کے خون کی سرخ روانی کو دیکھتا اور پھر اس کے بعد دنیا کا کوئی اور منظر نہ دیکھ سکتا۔ لیکن اس کی قربانی اور اس جیسے دوسرے کی قربانی سے یہ تو ہوتا کہ ناتسی بھی ڈان کے آگے نہ بڑھ سکتے۔

لیکن جہلم کے شکاروں کے گدے بہت نرم ہوتے ہیں اور جہلم لاکھ غلیظ سہی شہر کی عمارتیں، ہارون الرشید کے بغداد اور دجلہ کی یاد دلاتی ہیں۔

(۹)

اس کی چھٹیوں کا زمانہ ختم ہونے کو آیا۔ سرکاری عہدہ دار کو پھر اپنے فرائض منصبی بجالانے گپتا گر جانا تھا۔ کشمیر میں ڈیڑھ مہینہ اچھا گزرا۔ فطری مناظر اور افکار انسانی کی باہمی ہمدردی کا مشاہدہ کرنے کا ذرا سا موقع ملا۔ غریبوں پر ترس بھی آیا لیکن تفریحات کی بھی ایک سرکاری حد ہوتی ہے اور انسانی ہمدردیوں کی بھی۔ ڈپٹی کمشنر صاحب کو ڈیوٹی پر واپس جانا تھا۔ نعیم کے سرکاری جوتوں کے نیچے پھر گپتا گر کی زمین کانپنے لگی۔ حکومت کرنے والے اور ہوتے ہیں اور محبت کرنے والے اور۔

مگر برہم پتر کا پانی اسی شان بے اعتنائی سے بہتا رہے گا۔ جیسے ہزاروں سال سے بہتا رہا ہے۔ برہم پتر نے بھی جہلم اور دجلہ اور رہائن اور ڈینیوب کی طرح بہت سے تماشے دیکھے ہیں۔ ان دریاؤں کی طرح وہ بھی اقبال کا یہ شعر دہراتی ہے ؎

ہے نقش اگر باطل تکرار سے کیا حاصل
کیا تجھ کو خوش آتی ہے آدم کی یہ ارزانی

✓

عزیز احمد کے ناول

یوسف سرمست

اس دور کے اہم ترین ناول نگاروں میں عزیز احمد مقام رکھتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء تک ان کے جو اہم کارنامے سامنے آئے ان میں 'ہوس'، 'مرمر اور خون' ان کے ابتدائی ناول ہیں لیکن 'گریز' اور 'آگ' ایسے ناول ہیں جن میں ان کے فن کا شباب نظر آتا ہے۔ یہ ناول ان کی فنی پختگی اور فن کارانہ چابک دستی کی روشن مثالیں ہیں، اس لیے شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ عزیز احمد کی ناول نگاری پر ایک اعتراض عام طور پر یہ کیا جاتا ہے کہ وہ جنسی کیفیات کے اظہار میں بے باکانہ انداز اختیار کرتے ہیں۔ علی عباس حسینی نے ان کی ناول نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے 'ہوس' اور 'مرمر اور خون' کو یہی کہہ کر رد کر دیا کہ 'زمانہ طالب علمی کی لکھی ہوئی چیزیں ہیں جب اعصاب پر جنسی ہیجان غالب تھا' اور 'گریز' کی تعریف کرتے ہوئے اس پر بھی یہی اعتراض کیا ہے کہ 'جنسیات کے بیان میں وہ نامناسب افراط سے کام لیتے ہیں۔' علی عباس حسینی نے تو عزیز احمد کے فن کے مختلف روشن پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ اعتراض کیا ہے لیکن دوسرے نقاد عزیز احمد کے پاس سوائے جنس کے اور کوئی چیز دیکھتے ہی نہیں۔ وقار عظیم کو بھی سوائے جنس کے کوئی دوسری قابل ذکر بات 'گریز' میں نظر ہی نہیں آئی۔ وہ لکھتے ہیں:

"ناول کے سیاسی اور معاشی پس منظر میں جنسی حقائق کا غلبہ ہے جنھیں مصنف نے مزے لے لے کر بیان کیا اور اپنے قاری کو اس مزے میں پوری طرح شریک ہونے کی دعوت دی ہے۔ جنسی معاملات کے اس طرح غیر ضروری آزادی اور بے باکی سے بیان کرنے میں بظاہر فرائڈ کی جنسی نفسیات کا سہارا لیا گیا ہے — لیکن اس ناول میں یہ سہارا نفسیاتی یا فنی سہارا ہونے کی بجائے محض اس کا فریب معلوم ہوتا ہے۔"[3]

ڈاکٹر احسن فاروقی نے بھی عزیز احمد کی ناول نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے جگہ جگہ یہی اعتراض کیا ہے۔ وہ 'گریز' کے ہیرو کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اس کی خاص بیماری جنسی بھوک ہے۔ وہ اپنے خاندان کی ایک لڑکی بلقیس سے محبت کرتا ہے اور ساتھ ساتھ اس لڑکی کی جوان ماں کے بدن میں بھی اپنے درجہ کے موافق دلچسپی لیتا ہے۔۔۔ (گریز میں) کوئی عورت ایسی نظر نہیں آتی جس کی جنس کے علاوہ اس کی بابت کوئی اور تاثر بھی قائم ہو۔ اس معنی میں 'گریز' فرائڈ فلسفہ کی ایک چیز ہی سمجھی جائے گی مگر غور سے دیکھیے تو ڈی۔ ایچ لارنس نے عریاں نگاری کو اس کے صنفی اثر کی بنا پر جائز رکھا تھا اور اس طرح اس پر عمل کیا تھا کہ اس تمام ماحول سے نفرت پیدا ہو جس کی جکڑ بندیوں نے انسان کے لاشعور کو گندہ کر رکھا ہے۔۔۔ مگر عزیز احمد تو اس رنگ پر مچل گئے اور باوجود تمام علمیت اور قابلیت یہ نہ سمجھے کہ یہ عریاں نگاری کیا تھی۔"[4]

اس طرح عزیز احمد کی ناول نگاری کو صرف جنس کی کسوٹی پر کس کر رد کر دینا صحیح نہیں ہے۔ معترضین نے یہ اعتراضات بیسویں صدی کی انقلابی تبدیلیوں اور باغیانہ رجحانات کو پیش نظر رکھ کر نہیں کیے تھے۔۔۔ جدید ناولوں میں عریاں نگاری دنیا کے بدلے ہوئے حالات کا نتیجہ تھی۔ سائنس نے مذہب اور قدیم اخلاقی اقدار کی بنیادیں ہلا دی تھیں اور جدید نفسیاتی علم نے انسانی زندگی کی حقیقت شعارانہ عکاسی کے لیے جنسی کیفیات کے اظہار کو لازمی اور ضروری قرار دے دیا تھا۔ اس لیے عریاں نگاری اور جنس سے دلچسپی، پورے جدید عالمی ادب کی امتیازی نشانی بن گئی ہے۔

عزیز احمد کی امتیازی خصوصیت ان کی نفسیاتی بصیرت اور ژرف نگاہی ہے۔ ناول میں جذباتی زندگی کے مدوجزر کو پیش کرنے میں وہ اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اسکاٹ جیمس نے لارنس کی خوبی اور قوت اس بات میں مضمر دیکھی ہے کہ اس نے جسمانی احساسات اور محسوسات کو ترفع بخشا ہے۔ صرف جنس ہی

نہیں بلکہ تمام جسمانی احساسات کو۔[5] بالکل یہی بات عزیز احمد کے متعلق کہی جا سکتی ہے۔ اگرچہ 'ہوس' اور 'مرمر اور خون' ان کے ابتدائی اور زمانہ طالب علمی کے ناول ہیں لیکن ان میں بھی ان کی نفسیاتی بصیرت پورے طور پر نمایاں ہے۔ وہ نفسیاتی اور جنسیاتی احساسات کو حد درجہ فنکارانہ سلیقہ سے پیش کر کے انھیں ترفع بخش دیتے ہیں۔ جیسا کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق جیسے اخلاقی اقدار کو ملحوظ رکھنے والے ثقہ نقاد نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے:

"اس ناول میں مصنف نے آرٹ کی آڑ میں عقل و جذبات، محبت، ہوس، مرد و عورت کے تعلقات کی کشاکش کو بڑی خوش اسلوبی سے دکھایا ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے کہ اس خوش اسلوبی اور صحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ پڑھنے والا قائل ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔۔"[6]

پھر اس کے بعد مولوی عبدالحق نے بتایا ہے کہ عزیز احمد کس درجہ نفسیاتی حقائق کو پیش نظر رکھتے ہیں اور ان کے اظہار میں کس قدر فن کارانہ سلیقہ کا ثبوت دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"دراصل مصنف کا مقصد اس ناول کے لکھنے سے موجودہ رسم پردہ کا تاریک پہلو دکھانا ہے۔۔۔ اس پر غور کرتے وقت نفسیاتی عنصر جو اس کا لازمی جز ہے فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ اس اہم جز کو مصنف نے اس موقعہ پر بڑے سلیقہ سے دکھایا ہے۔ اس سے اس کی نظر کی گہرائی اور سچائی ظاہر ہوتی ہے اور یہی نظر ہے جو روزمرہ کی معمولی باتوں اور واقعات میں ان چیزوں کو دیکھ لیتی ہے، جو دوسروں کو نظر نہیں آتیں، اور یہی تصنیف کی جان ہوتی ہے۔۔۔ مصنف کو خیالات کے ادا کرنے کی قدرت ہے، خصوصاً جہاں وہ نفسیاتی کیفیتیں بیان کرتا ہے وہاں اس کا قلم مصور کا موقلم بن جاتا ہے۔"[7]

مولوی عبدالحق کا یہ تبصرہ ان کی وسیع النظری کو ہی نہیں ظاہر کرتا بلکہ وہ ناول کے فن کو سمجھنے کی جو بصیرت رکھتے تھے اس پر بھی روشنی ڈالتا ہے لیکن یہ کتنے تعجب کی بات ہے کہ علی عباس حسینی خود ناول نگار ہوتے ہوئے بھی 'ہوس' اور 'مرمر اور خون' میں جنسی ہیجان کے سوا کچھ نہیں دیکھ سکے ہیں اور ہمارے دوسرے جدید نقاد بھی عزیز احمد کی جنسیت کو تو ظاہر کرتے ہیں لیکن جنسی جذبات کو پیش کرنے میں عزیز احمد نے جو حیرت ناک فنی رکھ رکھاؤ اور سلیقہ کا ثبوت دیا ہے، اس کا کہیں ذکر نہیں کرتے۔ حالانکہ ناول

میں بقول فورسٹر انسان کی 'اندرونی یا داخلی' زندگی کی پیش کش ہی سب کچھ ہوتی ہے لیکن داخلی زندگی کو پیش کرنا کچھ آسان نہیں ہوتا۔ یہ ناول نگار کے لیے کٹھن ترین مرحلہ ہوتا ہے، جیسا کہ مڈلٹن مرے نے کہا ہے کہ جذبات واحساسات کو بیان کرنا مشکل ترین کام ہے۔ عزیز احمد اس مشکل ترین کام سے اس تکمیل کے ساتھ عہدہ برآ ہوتے ہیں، وہ اس سے ظاہر ہے کہ بقول عبدالحق ان کا قلم مصور کا 'موقلم' بن جاتا ہے۔ جذبات نگاری کا یہ سلیقہ ان کے ہر ناول میں موجود ہے۔ 'ہوس' اگرچہ کہ ان کی ابتدائی کوشش ہے لیکن وہ بھی اپنی اس خصوصیت کی بنا پر اردو ناول نگاری میں امتیازی مقام پانے کا مستحق بن جاتا ہے۔

اس ناول میں انھوں نے 'محبت' اور 'ہوس' کے فرق کو بڑی عمدگی سے نمایاں کیا ہے۔ گو 'ہوس' عزیز احمد کا سب سے پہلا ناول ہے لیکن اس میں بھی جذبات کے اتار چڑھاؤ کی وہ بہترین عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔ عزیز احمد انسانی فطرت کے بہترین نباض ہیں۔ رابرٹ لیڈل نے کہا ہے کہ بہترین زبان میں انسانی فطرت کی گہری واقفیت کا ثبوت دینا اور اس کی سچی عکاسی کرنا ناول نگاری کا کام ہے۔ اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ اگر ناول نگار انسانی فطرت سے واقف ہے اور ان کے فرق کو پوری طرح سے نمایاں کرنے پر قادر ہے تو اس کی قدریں انسان پرستانہ (HUMANIST) ہوں گی۔[10] عزیز احمد کی بڑائی کا راز اسی انسانی فطرت کی واقفیت اور اس کے فن کارانہ اظہار میں مضمر ہے۔ ان کا ہر ناول اس لحاظ سے بڑی قدر و قیمت رکھتا ہے۔ 'مرمر اور خون' بھی ان کا ابتدائی اور طالب علمی کے زمانے کا ناول ہے لیکن اس کے متعلق بھی بجا طور پر مولوی عبدالحق نے یہ لکھا ہے:

> ''نفسیاتی اور خاص کر جذباتی کیفیتوں کو بعض موقعوں پر بڑی خوبی اور دلکشی سے بیان کیا ہے جس میں کہیں استادانہ کمال نظر آتا ہے۔''[11]

'مرمر اور خون' میں عزیز احمد نے جذباتی کیفیات کے اتار چڑھاؤ کو پیش کرنے میں جو استادانہ کمال دکھایا ہے وہ ناول میں ہر جگہ نظر آتا ہے۔ نفسیاتی اور جذباتی کیفیات کا یہ اظہار عزیز احمد کا ایک امتیازی وصف ہے جو ان کی ناول نگاری میں شروع سے لے کر آخر تک جاری و ساری نظر آتا ہے۔ ان کی ناولوں کو ایک خاص اخلاقی نقطۂ نظر سے دیکھنے سے پہلے اس بات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ ناول، لائینل ٹریلنگ کے کہنے کے مطابق مستقل طور پر سچائی اور صداقت کی تلاش اور کھوج کا نام ہے۔ یہ کھوج کا میدان سماجی زندگی ہوتی ہے اور اس تلاش کا موضوع اور مواد انسانی طور طریقے ہوتے ہیں، جس سے انسان کی روح ظاہر ہوتی ہے۔[12] اس لیے ٹریلنگ کہتا ہے کہ ایک سنجیدہ ناول وہی ہوگا جو سماج کی عکاسی کرے اور سماج

کے اس عکس کو دیکھ کر ہم اسے رد یا قبول کر سکیں۔[13] ظاہر ہے کہ جو ناول نگار سماجی زندگی کی عکاسی اس انداز سے کرتا ہے، وہ ہمارے لیے لمحۂ فکر پیدا کرتا ہے اور ہم سماجی خرابیوں کو ان کی اصلی شکل میں دیکھنے لگتے ہیں۔ اس لیے ٹریلنگ کہتا ہے کہ ناول کی بڑائی اور افادیت اس بات میں مضمر ہے کہ وہ قاری کو اخلاقی زندگی پر غور کرنے پر مجبور کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ حقیقت صرف وہی نہیں ہے جس کو اس کی رواجی اور رسمی تعلیم نے پیش کیا ہے بلکہ حقیقت کے اور بھی روپ ہیں۔ پھر ٹریلنگ نے کہا ہے کہ ناول ہی وہ صنف ہے جس میں انسانوں کے فرق اور اس فرق کی قدر و قیمت کو نمایاں کیا جاتا ہے۔[14] اس لیے ایسا ناول جو مذکورہ بالا تمام باتوں کو پیش کرے گا اہمیت رکھے گا۔ عزیز احمد کے تمام ناول ان تمام حقائق کو پوری طرح پیش کرتے ہیں۔ عزیز احمد کے ناولوں کی اخلاقی اہمیت اصل میں اس بات میں پوشیدہ ہے کہ وہ حقائق کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ قاری ان کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ فورسٹر کے کہنے کے مطابق ناول نگاری بڑائی کا انحصار صرف اس بات پر ہے کہ وہ ہم کو کس قدر 'چونکا' سکتا ہے۔[15] عزیز احمد کے ناولوں میں یہی چونکا دینے والی کیفیات ہے۔ ہم ان کے ناولوں کو پڑھ کر چونکتے ہیں اور ان کی پیش کردہ باتوں کو رد یا قبول کرنے سے پہلے ان پر غور کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ان کی عریاں نگاری کی اہمیت بھی اسی بات میں مضمر ہے اور ان کی ناول نگاری کی اہمیت کا راز بھی یہی ہے۔

اپنی اس چونکا دینے والی خصوصیت کے اعتبار سے 'گریز' ان کے ناولوں میں امتیازی مقام رکھتا ہے۔ یہ ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا۔ 'گریز' عزیز احمد کا بے حد مشہور و مقبول ناول ہے۔ یہ ایک ایسے ہندوستانی نوجوان کی کہانی ہے جو آئی سی ایس کے لیے منتخب ہوتا ہے اور امتحان دینے کے سلسلے میں انگلستان اور یورپ کی سیر کرتا ہے۔ ناول میں ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۲ء تک کا زمانہ دکھایا گیا ہے۔ ایک ہندوستانی آئی سی ایس کی ذہنیت انگلستان جا کر کیا ہو جاتی ہے، زندگی کو وہ کس رنگ سے دیکھتا ہے اور اس کی زندگی میں عیش کوشی اور لذت پرستی، یورپ کے ماحول سے جس طرح داخل ہوتی ہے۔ اس کی بہترین تصویر 'گریز' میں پیش کی گئی ہے۔ 'گریز' زندگی سے گریز ہے، زندگی کے تلخ حقائق سے گریز ہے۔ حد یہ کہ محبت اور عشق کی تلخیوں سے بھی ناول کا ہیرو نعیم گریز کرتا ہے۔ نعیم ناول کا مرکزی کردار ہے۔ یہ کردار بیسویں صدی کے تمام اہم رجحانات اور میلانات کا آئینہ دار ہے۔ نہ تو اس کے پاس اخلاقی قدروں کا واضح تصور ہے، نہ ہی مذہبی بندشوں کا لحاظ۔ وہ ایک تشکیک کی حالت میں ہے۔ وہ سائنس اور نئے علوم اور نئے نظریات سے پوری طرح واقف ہے لیکن اس آگہی کی وجہ سے وہ زندگی سے غیر مطمئن ہے

کیونکہ 'گریز' کا ہیرو ذہین ہے۔ فرانسیسی ناول میں ذہین ہیرو کے مرکزی اور محوری کردار بن جانے کے متعلق وکٹر برومبٹ نے کہا ہے کہ اس کی وجہ سماجی، تاریخی اور تہذیبی عوامل کے ساتھ نظریاتی ادب کے اثر ونفوذ میں دیکھی جاسکتی ہے۔"[16] 'گریز' میں بھی ذہین ہیرو کا مرکزی کردار بن جانا اصل میں سماجی، تاریخی اور تہذیبی عوامل کا نتیجہ ہے۔ ان عوامل کی وجہ سے ہندوستانی زندگی میں جو تبدیلیاں آئیں، انھوں نے غور وفکر کو مہمیز لگائی اور ان ہی عوامل کے نتیجے میں تعلیم عام ہوئی اور علم کی وجہ سے دنیا کے مختلف بڑے بڑے نظریات سے آگہی حاصل ہوئی۔ پھر جدید سائنسی ترقی کی وجہ سے حمل ونقل کے ذرائع آسان ہوجانے کی بنا پر علوم ونظریات تیزی سے جدید ذہنوں کو متاثر کرنے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کے ناولوں کے ہیرو جس قدر ذہین ہیں اور دنیا کے مختلف علوم اور نظریات سے آگاہ ہیں، اس سے پہلے کے کسی دور کے ہیرو نہیں ہیں۔ اسی لیے 'گریز' میں صرف نعیم کی زندگی کے ذہنی اور جذباتی انداز سے سامنے آجانے کی وجہ سے اس دور کے ہندوستان اور عالمی مسائل اور نظریات سامنے آجاتے ہیں۔
اس کے علاوہ 'گریز' میں اس کردار کی اضافت سے ناول کے ہر واقعے اور ہر کردار کو پیش کیا گیا ہے۔ اس ناول میں مختلف واقعات بڑے یقین آفریں طریقے سے پیش کیے گئے ہیں۔ یہ یقین آفرینی اس لیے بھی پیدا ہوگئی ہے کہ ناول میں اکثر جگہ واحد متکلم کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ اس طریقے سے جارج بی ایلیٹ کے کہنے کے مطابق واقعات معتبر اور مستند سے بن جاتے ہیں۔ کیونکہ کہنے والا وثوق سے کہتا ہے کہ میں وہاں تھا، میں نے یہ دیکھا۔"[17] گو بعض جگہ ہی واحد متکلم کا طریقہ استعمال کیا گیا ہے لیکن چونکہ پورا ناول نعیم کے نقطۂ نظر سے پیش کیا گیا ہے اس لیے پورے ناول میں یہی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ اڈورڈ روزن ہیم کے کہنے کے مطابق جب ناول کسی ایک کردار کے نقطۂ نظر سے پیش کیا جاتا ہے تو بھی بالکل واحد متکلم کا تاثر پیدا ہوجاتا ہے کیونکہ اس طریقے کی وجہ سے اس کردار کے تجربات اور اس کے محسوسات ہی کے ذریعہ ناول کا پلاٹ ابھرتا ہے۔"[18] اس طریقے کو استعمال کرکے عزیز احمد نے اس ناول میں بڑا ڈرامائی انداز پیدا کردیا ہے۔ انھوں نے 'گریز' میں راست طور پر اپنے کرداروں کی نفسیات کو پیش کیا ہے۔ جوزف وارن بیچ نے ڈرامائی طریقے کی تعریف ہی یہی کی ہے کہ یہ وہ طریقہ ہے جس میں مصنف کرداروں کی تشریح یا ان پر تبصرہ کیے بغیر راست طور پر ان کی ذہنی حالتوں کو نمایاں کرتا ہے۔"[19] گویا یوں ناول داخلی ڈرامہ بن جاتا ہے۔ 'گریز' میں بھی یہی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ اس میں بھی شروع سے آخر تک نعیم کی داخلی اور نفسیاتی حالت قاری کے سامنے رہتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی خارجی زندگی کی

وہ تمام باتیں جو نفسیاتی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہیں وہ بھی ناول میں بڑی تکمیل اور عمدگی کے ساتھ دکھائی گئی ہیں۔ جوائیس کے 'یولیسیس' کے بارے میں کولیس نے کہا ہے کہ اس میں ہیرو کے شعور کے داخلی احساسات کے ذریعہ خارجی دنیا کی تصویر کشی کی گئی ہے۔"[20] بالکل یہی بات 'گریز' کے متعلق بھی کہی جاسکتی ہے۔ اگر چہ کہ عزیز احمد نے شعور کی رو کی تکنیک کو اس ناول میں استعمال نہیں کیا ہے لیکن چونکہ انھوں نے صرف نعیم کے شعور اور نقطۂ نظر کے ذریعہ پورے ناول کو بیان کیا ہے اس لیے اس ناول میں اس تکنک کی بعض جھلکیاں آگئی ہیں۔ جیسے نعیم اور بلقیس کی محبت کو پیش کرتے ہوئے انھوں نے ظاہر کیا ہے کہ بلقیس کی محبت نعیم کی نفسیاتی زندگی کا ایک جز بن کر رہ جاتی ہے۔ بلقیس کی یاد نعیم کو طرح طرح سے ستاتی ہے۔ نعیم کے شعور کی رو گھوم پھر کر بلقیس کی یاد کا طواف کرتی ہے اور وہ بار بار اس کا تصور کرتا ہے:

> "رات کو سونے سے پہلے طرح طرح کے رومان انگیز خواب، عاشقانہ تخیلات عشرت منزل ایک ڈاک بنگلہ بن گئی۔ موٹر کا سفر، مسافر بنگلے میں رات، بند کمرہ، دروازے بند، باہر حفاظت کے لیے آدمی۔ حادثہ کا پہلا تصور کہ میں زخمی ہوں اور بلقیس تیمارداری کررہی ہے۔ پھر بلقیس حادثہ میں زخمی ہوگئی اور میں تیمارداری کررہا ہوں۔ عین دم واپسیں بلقیس کا اقرار محبت۔"[21]

اس طرح نیم خوابی کی حالت کو ایک دوسری جگہ پیش کرتے ہوئے انھوں نے نعیم کی ذہنی کیفیت یوں نمایاں کی ہے:

> "دماغ نے ذرا سی کوشش کی تو بلقیس سامنے کھڑی تھی۔ مذاق اڑا رہی تھی کہ سمندر کے اس ذرا سے تلاطم میں آپ کا یہ حال ہوگیا۔ واہ نعیم واہ۔ پھر مذاق اڑاتے اڑاتے مجھے بیمار اور پریشان دیکھ کر وہ خود بھی پریشان ہوگئی اور تسلی دینے لگی۔ جہاز نے داہنی جانب حرکت کی تو اس نے میرے بائیں کان میں جھک کے محبت کا اقرار کیا۔ پھر وہ مسکرائی۔ پھر میں نے مذاق اڑایا، پھر ہنسی، پھر میری ہنسی اڑائی، پھر فرشتوں کی طرح میری پریشانی سے پریشان ہوئی۔ مجھے تسلی دی اور نیند کے ساتھ مل جل کر غائب ہوگئی۔"[22]

اس طرح نیم خوابی کی حالت میں شعوری رو کو پیش کرتے ہوئے عزیز احمد نے فرائڈ کی نفسیاتی تحلیل کو پیش نظر رکھا ہے۔ فرائڈ کے کہنے کے مطابق دن کے خواب یا حالتِ بیداری کے خواب ہماری

ذہنی زندگی کا ایک لازمی جزو ہیں۔ [۲۳] کیونکہ خواب خواہ دن کے ہوں یا رات کے، ہماری غیر آسودہ
خواہشوں کی آسودگی کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ یہاں بھی بلقیس کا نعیم کے تصور اور خیال میں اس کے اتنے
قریب آجانا نعیم کی اس غیر آسودہ خواہش کی آسودگی کا ذریعہ تھا۔ نعیم جدید زمانے کا پڑھا لکھا
نوجوان ہے، وہ فرائڈ کے نظریات سے بخوبی واقف ہے اور وہ فرائڈ کے مجموعۂ مضامین کو پڑھا کرتا
ہے۔ [۲۴] اس لیے وہ اپنی نفسیاتی حالت کا تجزیہ پوری طرح کرتا ہے۔ وہ اپنی ڈائری میں بلقیس سے اپنی
محبت کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"جب سے میں نے سنا تھا کہ خانم چاہتی ہیں اس کی شادی مجھ سے ہو، تب سے بلقیس
کی 'شانِ نارسائی' میں فرق آگیا تھا۔ کشش کا بہت بڑا باعث یہ تھا کہ میری مفلسانہ
طالب علمی کے زمانے میں وہ میری پہنچ سے باہر تھی۔ آئی سی ایس کے انتخاب نے مجھے
اتنا اوپر اٹھا دیا کہ میرا ہاتھ اس تک پہنچ سکتا تھا۔ اس سے ناامیدانہ اشتیاق کا خاتمہ
ہو گیا، اس کی جگہ دلچسپی، لطف اور زیادہ مادی قسم کے جذبات نے لے لی تھی۔" [۲۵]

نعیم آج کا وہ نوجوان ہے جس کا ذہن بیسویں صدی کے نئے علوم کی آماجگاہ ہے۔ وہ اپنی اور اپنے
اطراف کی زندگی کی پوری آگہی رکھتا ہے۔ اس لیے زندگی سے قطعی ناآسودہ ہے۔ رابرٹ لیڈل نے آج
کے ناول نگار کے لیے یہ ضروری قرار دیا ہے کہ نہ صرف وہ اپنے کردار کی زندگی کو پیش کرے بلکہ اپنے
اطراف کی زندگی کو بھی پیش کرے۔ [۲۶] لیڈل کا کہنا ہے کہ ہم آج ایسے ناول نگاری کی تخلیق پر بھروسہ نہیں
کر سکتے جو زندگی کی بے اطمینانی اور غیر یقینی کیفیت کو پیش کرنے سے قاصر ہے۔ [۲۷] 'گریز' کی اہمیت
اور بڑائی یہی ہے کہ اس میں موجودہ دور کی غیر یقینی اور بے اطمینانی کی حالت کو پوری شدت کے ساتھ
پیش کیا گیا ہے۔ نعیم کی نفسیاتی حالت بیسویں صدی کی زندگی کی غیر اطمینان بخش حالت کی پوری پوری
عکاسی کرتی ہے۔ نعیم کی بے اطمینانی کی کیفیت کو ناول میں جگہ جگہ بڑی عمدگی سے پیش کیا گیا ہے۔ ایک
جگہ عزیز احمد بتاتے ہیں:

"ایک طرح کی اعصابی کمزوری نعیم پر حاوی ہونے لگی۔۔۔۔ وہ سوچنے لگا، میں اس
طرح کب تک گریز کرتا رہوں گا۔ کب تک یہ ذہنی اور جذباتی انتشار باقی رہے گا اور
کوئی ترکیبی نتیجہ، کوئی امتزاج میری روح اور ذہن اور جسم کی فضا میں ابھرے گا۔ کب

تک میں زندگی سے گریز کرتا رہوں گا۔ کب تک میں زندگی سے بچ بچ کے خوابوں کی
دنیا میں عاشقی میں پناہ لیتا رہوں گا اور عاشقی بھی خالص جذباتی عاشقی، جس میں کوئی
ذہنی اطمینان نہیں۔" [۲۸]

یہ وہ ذہنی انتشار ہے جو روح کی گہرائیوں میں اتر گیا ہے، جو ایک عظیم جنگ کو بھگت چکنے کے
بعد دوسری جنگ کے شروع ہونے پر ذہن اور فکر کے ہر گوشہ پر موت کے اندیشے کی وجہ سے مسلط ہے۔
لیوامین نے نئی دنیا میں یونانی ٹریجڈی کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ ایک بات جو انسانی زندگی
کے تعلق سے یقینی ہے وہ ہے اس کی موت۔ موت کے خوف کا مقابلہ کرنے کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔
یا تو ہم مرنے والوں کو اپنی نظروں کے سامنے نہ آنے دیں یا پھر اپنے میں موت سے آنکھیں چار کرنے کا
حوصلہ پیدا کریں۔ پھر وہ موجودہ حالات کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ 'موت کا خیال اور خوف آج کے
دور میں ہر جگہ اور ہر وقت ملتا ہے۔ صبح جب ہم اخبار اٹھاتے ہیں تو کوئی نہ کوئی سرخی ضرور ایسی مل جاتی ہے
جو موت کے خیال کو تازہ کر دیتی ہے۔ اس دور کی ذہنی آگہی ہم کو بتاتی ہے کہ ہم چاروں طرف سے تخریبی
قوتوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ آج ہم موت کے متعلق سوچنے پر جتنے مجبور ہو گئے ہیں ہمارے اجداد
کبھی نہ ہوئے تھے۔' [۲۹] جدید دور کی اس ذہنی فضا کو عزیز احمد نے انتہائی فنکارانہ صداقت سے ہر جگہ
ابھارا ہے۔ نعیم ایک حادثہ میں ایک عورت کو مرتا ہوا دیکھتا ہے اور موت کا احساس پوری شدت سے اس
کے ذہن پر چھا جاتا ہے۔ وہ سوچتا ہے:

"اس حادثہ کی ہیبت نعیم پر دن بھر رات طاری رہی۔ زندگی کا غیر معمولی ایک اصلی
واقعہ اور تمام افسانوی نقوش باطل معلوم ہونے لگے۔ یہی زندگی کا ڈرامہ تھا۔ ایک
منٹ کے اندر انسانی جسم کی شکست چند لمحوں میں موت۔ برتھا اکسل سن کی ہرجائی
نگاہیں۔ ایلس کی وفا اور بے وفائی۔ بلقیس کے متعلق شاعرانہ تخیلات، میری پاؤل کا
عشق، کرا کیلے اور ہروشا کی دوستی، خانم کی دنیاداری، سب کھیل تھے۔ مگر قدرت کے
اس معمولی کھیل کے سامنے ہیچ۔ ایک سواری سنبھل نہ سکی اور جوشِ حرکتِ حیات ہمیشہ
کے لیے خاموش اور زندگی کی ساری دلچسپیاں کیا ہیں؟ اس خاموشی اور خاتمہ کو بھول
جانے کی ناکام کوششیں، تمام عشق، محض افزائشِ نسل اور افزائشِ نسل کا انجام فنا۔" [۳۰]

یوں عزیز احمد نے اپنے دور کی مکمل نمائندگی کی ہے۔ عزیز احمد نے 'گریز' میں خارجی اور داخلی

زندگی کے بے شمار گوشے بے نقاب کیے ہیں۔ جنگ کے دوران میں ساری دنیا کی جو ذہنی اور جذباتی حالت تھی، دنیا پر جو کچھ بیت رہی تھی، اس کا بھی مکمل تاثر 'گریز' میں ملتا ہے۔ ہکسلے کے ناولوں کے متعلق ، ہوفمین نے کہا ہے کہ اس کے ناولوں کی اہم ترین بات یہ ہے کہ وہ اپنے عہد کی بڑی روشن تصویریں ہیں یا کم از کم اس کی ذہنی دلچسپیوں اور عادات کی تصویریں ہیں۔ "۳۱ یہی بات 'گریز' پر بھی صادق آتی ہے۔

عزیز احمد نے اس ناول میں اپنے عہد کی تصویر پیش کردی ہے۔ جدید نوجوان ذہن، جن خیالات ، تصورات اور علوم سے واقف تھا اور دنیا کے حالات نے جس طرح اس کی ذہنی زندگی میں ہیجان پیدا کر رکھا تھا اس کی مکمل تصویر جگہ جگہ اس ناول میں ملتی ہے۔ ہروشا اور کراکسلے کی یہ گفتگو دوسری جنگِ عظیم کے سائے میں پلنے والے ذہین نوجوان کی عکاسی کرتی ہے:

"زور، حرکت، حیات۔۔۔ ہروشا نے اپنے پائپ کا ایک کش لیا، اور کش بھی طنز کے انداز میں لیا۔ یہ زندگی کیا ہے جو محض ایک کارتوس سے بجھائی جاسکتی ہے۔ یہ زور حرکت حیات کیا کہ اگر درجۂ حرارت ذرا کم ہوجائے تو اس کائنات کا خاتمہ ہوجائے۔ 'کراکسلے نے کہا، لیکن ارتقائے تخلیقی سے کارتوس اور درجۂ حرارت کا توڑ پیدا ہوجائے گا۔ اور ہروشا نے اب پہلی مرتبہ ذرا جوش سے اپنا پائپ جھٹک کر کہا 'میرے دوست یہ بھی نہ ہوگا۔' اس وقت فرانس میں کسی گوشۂ تنہائی میں بیٹھا ایک شخص ارتقائی تخلیقی کا افسانہ گھڑ رہا ہے اور ایک ہزار کارخانے کارتوس بنا رہے ہیں۔ یہ ہے آپ کا زور حرکتِ حیات۔ یہاں برگساں اور نٹشے ملتے ہیں۔"۳۲

عزیز احمد نے حد درجہ فن کارانہ چابک دستی سے اس طرح دنیا اور یورپ کی ذہنی فضا کو پیش کرتے ہوئے اس کے سیاسی پس منظر کو بھی ابھارا ہے۔ جنگ کے قریب یورپ کی جو مخصوص حالت تھی اور ایک کرب اور بے چینی جس طرح پھیلی ہوئی تھی، اس کی عکاسی ہروشا کے اس خط سے بھی ہوتی ہے:

"یہ بڑا پرلطف زمانہ ہے۔ عظیم الشان تخریب کا زمانہ، معاشرتی اخلاقی اقدار اور پیمانوں کے زلزلوں کا زمانہ۔"۳۳

اس طرح بیسویں صدی کے ہیجان اور اس کی غیر یقینی حالت کو ہر جگہ عزیز احمد نے نمایاں کیا ہے۔ ایک خط میں کراکسلے نعیم کو لکھتا ہے:

"دنیا بھر کی حالت ذلیل ہے۔۔۔ اس دنیا کا رہنے والا کون انسان کہہ سکتا ہے کہ

کل کیا ہوگا۔۔۔"۳۴

ان تمام حالات سے، ہر چیز سے، ہر اعتقاد سے جو بیزارگی، بے تعلقی اور بے اطمینانی کا احساس پیدا ہو رہا تھا اس کا ذکر میری پاول کی زبانی یوں کیا گیا ہے:

"ذاتی طور پر تو میں یورپ اور تمدن اور اشتمالیت سب سے بیزار ہوگئی ہوں۔"۳۵

اس طرح جدید دور کا نوجوان ذہن اور اس کی تشکیلی حالت پوری طرح سے سامنے آجاتی ہے۔ ان حالات میں ایک ذہین جدید علوم سے واقف ہندوستانی نوجوان کی جو حالت ہوسکتی ہے وہ بھی بے حد عمدگی سے نمایاں کی گئی ہے۔ نعیم غلام ہندوستان کا باشندہ ہے اور غیر قوم کی خدمت کرنے پر مجبور ہے۔ اگرچہ کہ اسے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوگئی ہے، جس کی اس نے خواہش کی تھی یعنی وہ آئی سی ایس ہوگیا ہے اور ایک بڑے عہدے پر مامور ہے لیکن ایک ذہین اور حساس نوجوان کی قومی اور بین قومی حالات کی اس کشمکش میں جو حالت ہوسکتی ہے اس کی بہترین تصویر کشی کرتے ہوئے عزیز احمد بتاتے ہیں:

"نعیم نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس کی شخصیت ٹوٹ رہی ہے۔ انفرادیت مندمل ہورہی ہے۔ سیاسیات میں اس کا نقطۂ نظر محض ایک تماشائی کا سا رہ گیا تھا۔ ہندوستان آنے کے کچھ ہی دنوں بعد کانگریس اور لیگ کی جنگ میں اس کی نام نہاد اشتمالیت ختم ہوئی۔ سرکار سے اسے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ اس لیے سرکار کا آدمی بن کے چمکنے کا اسے کوئی موقع نہ تھا۔ اس طرح خارجی سیاسیات میں بھی اس کی ہمدردی نہ تھی۔۔۔۔۔ ذہنی تفکرات میں امتزاج کے فقدان کی وجہ سے وہ کوئی فلسفۂ حیات نہ بنا سکا۔ اور اچھا بھی تھا، سرکاری ملازمین کو اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ سیاسیات میں اشتمالیت اور اسلام کے درمیان وہ کوئی قطعی فیصلہ نہ کرسکا تھا۔۔۔۔ پہلے بھی خیالات بے ارادہ بے عمل تھے، اب بھی رہے۔۔۔۔ جذباتی امتزاج کی بجائے انتہا درجہ کا انتشار تھا۔"۳۶

نعیم کی یہ ذہنی انتشار کی کیفیت خارجی اور داخلی زندگی کی آسودگیوں کا نتیجہ تھی۔ ناول میں شروع سے آخر تک نعیم کی جذباتی اور ذہنی کیفیت قاری کے سامنے رہتی ہے اور اس کی پیش کش میں عزیز احمد کا کمال نظر آتا ہے۔ عزیز احمد کو اردو کا ڈی ایچ لارنس کہا جاسکتا ہے۔ لارنس کے متعلق ڈیوڈ ڈیچس نے کہا ہے کہ وہ ہمیشہ انسانی تعلقات کی پیش کشی کو مدنظر رکھتا ہے۔ وہ انسانی زندگی کے تعلقات جیسے محبت، دوستی، شادی اور اچھی زندگی سے، فرد کی زندگی کے بھرپور بننے کے امکانات پر غور کرتا ہے۔ ان تعلقات

کا فقدان یا کمی جس طرح فرد کی زندگی کو اداس، مایوس کن یا مسخ بنا سکتی ہے اس کی پیش کش لارنس کی ناول نگاری کا مقصد رہتی ہے۔ وہ فرد کے ان تعلقات کو پیش کرتے ہوئے پرانے یا بے جان طریقوں اور روایتوں کو رد کرتا ہے۔"[37] بالکل یہی بات عزیز احمد کے پاس ملتی ہے۔ نعیم کی زندگی کو پیش کرتے ہوئے عزیز احمد نے بتایا ہے کہ نعیم کی ناآسودہ زندگی میں بنیادی طور پر اچھی تعلقات کی کمی رہتی ہے۔ ڈیچس نے یہ بھی کہا ہے کہ لارنس کی ناول نگاری راست اور مرکزی طور پر شادی اور دوستی بلکہ موجودہ سماج میں سچی دوستی اور سچی شادی کے امکانات سے متعلق رہتی ہے۔"[38] 'گریز' میں نعیم کے سارے تعلقات ان ہی دو بنیادی باتوں کے گرد گھومتے نظر آتے ہیں اور مردوں کے ساتھ سچی دوستی کے امکانات اور تمام عورتوں کے ساتھ سچی دوستی اور شادی کے امکانات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ نعیم کی محبت جو بلقیس سے لے کر ایلس تک اور ایلس سے لے کر میری پاول تک پیش کی گئی ہے اس میں سچی شادی کے امکانات مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ نعیم اور میری کی ساری خط و کتابت اسی سچی دوستی اور شادی کے امکانات کے موضوع پر مبنی ہے۔ یہی حال بلقیس اور ایلس سے نعیم کی محبت کا ہے۔

لارنس کے ناول 'سنز اینڈ لورس' کے متعلق ڈیوڈ ڈیچس نے یہ کہا ہے کہ یہ ناول جدید تمدن اور تہذیب کے ساتھ محبت کی مختلف قسموں اور نوعیتوں کو پیش کرتا ہے۔ نعیم کے مختلف معاشقے مختلف نوعیت رکھتے ہیں۔ 'گریز' میں نعیم کی بلقیس سے خیالی اور تصوری محبت بھی ہے، اور برتھا اکسل سن سے جسمانی اور جنسی محبت بھی ہے۔ میری پاول یا 'گل سرخ' سے اس کی محبت ذہنی، فلسفیانہ اور 'دوستانہ' نوعیت رکھتی ہے۔ میری پاول سے نعیم کی محبت میں مشرقی اور مغربی محبت میں فرق اور فلسفۂ محبت کے تعلق سے بڑی فکر انگیز باتیں اور بحثیں بھی ملتی ہیں۔ پھر نعیم کی ایلس سے محبت ہے۔ یہاں 'ہوس' کا سلسلہ 'پیار' تک پہنچتا دکھایا گیا ہے۔ نعیم کی امریکی لڑکی ایلس سے وابستگی ابتدا میں یکسر جنسی نوعیت رکھتی ہے لیکن رفتہ رفتہ وہ عشق میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جنسیت جس طرح رفتہ رفتہ عشق میں تبدیل ہو جاتی ہے اس کو دکھانے اور پیش کرنے میں عزیز احمد نے کمال دکھایا ہے۔ نعیم جو ایلس سے اپنے جنسی جذبات کی آسودگی چاہتا تھا اور اس کے پورے نہ ہونے پر بے چین ہو کر تعلقات کو ترک کر دینے کے متعلق سوچا کرتا تھا۔ ابتدا میں نعیم کی جذباتی کیفیت کی یہ حالت ہوتی ہے:

"اس تشنگی کی وجہ سے نعیم بہت بے چین ہو جاتا۔ بعض وقت وہ یہ بھی چاہتا کہ ایلس کا پیچھا چھوڑ دے اور کوئی اور ایسی لڑکی تلاش کرے جس سے اس کی مدعا برآری زیادہ

آسان ہو۔"[39]

لیکن بعد میں وہی نعیم رفتہ رفتہ یہ محسوس کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے:

"بہت جلد نعیم کو محسوس ہونے لگا کہ وہ صبح ہی سے سہ پہر کا منتظر رہتا ہے، جب ایلس کے ساتھ کا وقت آئے گا، اس کو کہیں ساتھ لے جانے کا وقت آئے گا اور پھر اسے یہ بھی محسوس ہونے لگا کہ ایلس اس کے لیے کتنی ضروری ہوتی جا رہی ہے۔۔۔۔ اس کا دل نرم ہونے لگا، یہ ایسی نرمی تھی جو اس نے اب تک کسی عورت کے لیے محسوس نہیں کی تھی۔ وہ ایلس کے لیے محسوس کرنے لگا۔ اسے بات بات کا خیال رہنے لگا۔ اگر رات زیادہ آ گئی ہے اور دونوں کھلی سڑکوں پر ہیں تو اس کا خیال ہوتا ہے کہ کہیں ایلس کو سردی نہ لگ جائے۔۔۔ جس دن اس کی طبیعت کسل مند ہوتی نعیم اس سے زیادہ پست ہو جاتا۔"[40]

اس طرح نعیم کی پوری جنسیت محبت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ایلس کی پوری شخصیت اب اس کے سامنے ایک دوسرے ہی رنگ میں آتی ہے۔ محبت کی بنیاد جنس ہے لیکن اس بنیاد پر جب محبت کی عمارت کھڑی ہوتی ہے تو یہ نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے، اب ایلس کی ہر بات میں نعیم ایک جداگانہ کیفیت پانے لگتا ہے:

"اب تک وہ ہزاروں بار ایلس کے بوسے لے چکا تھا لیکن ان بوسوں میں کوئی خاص کیفیت نہ تھی۔ جیسے اور کسی لڑکی کے بوسے لے جائیں۔ جیسے ان تمام لڑکیوں کے بوسے جو اس نے اب تک لیے تھے مگر اب جب وہ ایلس کا بوسہ لیتا تو معلوم ہوتا کہ اس کا دل اس کے ہونٹوں میں آ گیا ہے۔ معلوم ہوتا کہ جتنی لذت اس ایک بوسے میں ہے اتنی لذت اور کسی چیز میں نہیں اور ایلس کی انگلیوں کے ناخن تک اسے عزیز معلوم ہوتے۔"[41]

محبت جب جنسیت پر غالب آ جاتی ہے تو پھر مرد اور عورت کے تعلقات ایک نئی فضا میں پرورش پانے لگتے ہیں۔ اس فضا کو پیش کرنے میں عزیز احمد کی نفسیاتی ژرف نگاہی اور انسانی جذبات سے مکمل آگہی ظاہر ہوتی ہے وہ اس بدلی ہوئی فضا کو جو جنسیت کے محبت میں تبدیل ہونے سے پیدا ہوئی تھی، یوں پیش کرتے ہیں:

"اور وہ خواہش جو ایلس کی دوستی کے ساتھ ظہور میں آئی تھی ایلس کے جسم، ایلس کے کنوارے پن کو فتح کرنے کی خواہش، اب اس کا کہیں نام ونشان بھی نہ تھا۔ ایلس اب بھی کنواری ہی تھی لیکن وہ احترام جو ایک عرصے سے آہستہ آہستہ نسیم کے دل میں پیدا ہو رہا تھا، اس ایک لمحے میں جذبۂ پرستش بن گیا۔ اس کی محبوبہ، اس کی ہونے والی بیوی، کسی سے یہاں تک کہ اس سے بھی آلودہ نہیں ہوئی۔ مشرق کا تصور عصمت اسے ایلس کے اطراف اس وقت اس طرح چھایا ہوا نظر آ رہا تھا — جیسے مہتاب کے گرد ہالا۔"[۴۲]

عزیز احمد نے اس ناول میں انتہائی فنکارانہ انداز سے اس بات کو پیش کیا ہے کہ محبت کی 'لطافت' جنسیت کی 'کثافت' کو زنگار بنا کر جلوہ پیدا کرتی ہے۔ پھر محبت کی اس جلوہ نمائی میں جو پاکی اور روحانیت پیدا ہو جاتی ہے اور جو سکون بخش کیفیت ظاہر ہوتی ہے، اس کو نمایاں کرنے میں عزیز احمد اپنا جواب نہیں رکھتے۔ وہ محبت کی لطیف کیفیت کو یوں ظاہر کرتے ہیں:

"لطافت: نرمی، دل کی نرمی، جسم کی نرمی، روح کی نرمی، یہی وہ چیز تھی جو اسے اپنی اور ایلس کی محبت کی اصل معلوم ہوتی تھی۔ کہیں جذبات کی آندھی نہیں تھی، کہیں طوفان نہیں، کہیں طغیانی نہیں، کوئی زور وشور نہیں، کوئی ہلچل نہیں، محبت کی ہوا آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔۔۔۔ ہر طرف سکون، ایسا سکون، ایسا لطیف سکون، ایسی لطافت جو اس کی روح نے آج تک محسوس نہیں کی تھی اسے کچھ کچھ اندازہ ہونے لگا کہ صوفیائے کرام جب خدا سے لو لگاتے ہوں گے تو ان کی روحیں کیسا سکون کیسا لطیف سکون محسوس کرتی ہوں گی۔ کائنات کا سارا جوش وخروش، اجزائے کائنات کا سارا تصادم ختم ہو چکا تھا۔ زمیں اپنے محور پر سکون کے ساتھ گھوم رہی تھی۔"[۴۳]

اس طرح عزیز احمد نے جنسیت کو محبت کے لطیف ترین جذبہ میں تبدیل ہوتے دکھایا ہے جو اردو ناول نگاری میں اپنی مثال آپ ہے۔

عزیز احمد کی ناول نگاری ہر اعتبار سے اردو ناول نگاری کے ایک اہم موڑ کی نشاندہی کرتی ہے۔ وہ زندگی کو بھرپور طریقے سے پیش کرنے کی جتنی اور جیسی قوت رکھتے ہیں، وہ اردو ناول نگاروں میں کمیاب ہے لیکن اگر اس کے باوجود ہم ان کی ناول نگاری میں سوائے جنس کے اور کچھ نہ دیکھ سکیں تو شاید یہ خود

ہماری جنس زدگی ہوگی۔ پھر جنسی جذبات کی جیسی لطیف اور حقیقی عکاسی انھوں نے کی ہے، اردو کے دوسرے ناول نگار بہت کم کر پائے ہیں۔ لارنس نے کہا ہے کہ جنسی جذبات میں کوئی برائی نہیں ہے اگر وہ کھلے اور راست طریقے سے پیش کیے جائیں۔ صحیح قسم کی جنسی بیداری روزمرہ کی زندگی کے لیے ضروری ہے۔[۴۴] اس کا کہنا ہے کہ فحش نگاری نہ ہونا چاہیے۔ پھر وہ بتاتا ہے کہ جب بھی جنس کو پیش کرنے میں جنس کو ذلیل کرنے یا اس کو ذلیل سمجھنے کی خواہش کام کرتی ہے، تب ہی جنسیت فحش بن جاتی ہے۔[۴۵] عزیز احمد راست اور کھلے طور پر جنسیت کو پیش کرتے ہیں۔ وہ جنسی جذبہ کو ذلیل سمجھتے ہیں، نہ ذلیل دکھانے کی کوشش کرتے ہیں، اس لیے آج تک ان کی عریاں نگاری فحش نہیں بنی ہے بلکہ اس کے برخلاف جنس کا عنصر ان کی ناول نگاری میں بڑی فنی قدر وقیمت رکھتا ہے جس کا اظہار پچھلے صفحات پر ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ اردو ناول نگاری کو سچی جنسی محبت کی پیش کشی کی ضرورت بھی تھی کیونکہ نذیر احمد سے لے کر پریم چند تک محبت اور جنس میں جو گہری اور اٹوٹ وابستگی ہے اور جس طرح جنسی خواہش محبت کی رفعت حاصل کر لیتی ہے اور محبت جنسی اتصال سے جس طرح مستحکم ومضبوط ہو سکتی ہے اس کو پیش ہی نہیں کیا گیا تھا۔ اس لحاظ سے بھی عزیز احمد کے ناولوں میں جنسی جذبہ کا عنصر بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

عزیز احمد نے 'گریز' میں خارجی اور داخلی زندگی کے بے شمار پہلو پیش کیے ہیں۔ انھوں نے خالص جنسی وابستگی کو بھی پیش کیا ہے۔ جنسی محبت کو بھی اور روحانی محبت کو بھی۔ یورپ کی سماجی زندگی بھی پیش کی ہے اور سیاسی زندگی بھی۔ جنگ عظیم کے خوف کو بھی پیش کیا ہے اور خارجی ہیجان کو بھی۔ زندگی کی بے کیفی کو بھی پیش کیا ہے اور اس کی غیر یقینی حالت کو بھی۔ ذہنی زندگی بھی پیش کی ہے، نفسیاتی زندگی بھی۔ نئے علوم کی آگہی کو بھی پیش کیا ہے اور اشتراکی اور اشتمالی خیالات کو پھیلتے ہوئے بھی دکھایا ہے۔ غرض زندگی کے اتنے بے شمار پہلو اتنے بھرپور طریقے سے پیش کرنا نہ صرف ان کی زندگی سے گہری واقفیت کو ظاہر کرتا ہے بلکہ اس سے ناول نگاری کی تکنیک پر ان کی غیر معمولی قدرت بھی نمایاں ہوتی ہے۔ اس بات کا اعتراف احسن فاروقی بھی کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"عزیز احمد کا تکنیک پر قابو داد کے قابل ہے۔ ان کے مطالعہ اور علم نے اس معاملہ میں ان کی پوری مدد کی اور اردو ناول کا تکنیکی معیار انھوں نے بہت بلند کیا۔"[۴۶]

تکنیک پر عزیز احمد کی غیر معمولی قدرت اس بات سے ظاہر ہے کہ انھوں نے اس ناول میں جہاں ضرورت پڑی ہے وہاں وہی انداز اختیار کیا ہے جو ان کے مواد کو مکمل اور بہتر سے بہتر طریقے پر ظاہر

کر سکے۔ چونکہ ان کا مواد بے حد وسیع تھا اور انھیں زندگی کے مختلف اور متضاد گوشوں کو پیش کرنا تھا اس لیے انھوں نے اس ناول میں ناول نگاری کے مختلف طریقوں سے کام لیا ہے۔ اس لیے 'گریز' میں خطوط بھی ملتے ہیں، ڈائری بھی اور تاثراتی انداز بھی۔ پرسی لبک کے کہنے کے مطابق ناول نگاری کے اتنے طریقے ہیں اور ان مختلف طریقوں کو ترکیب دینے سے ایسے طریقے پیدا ہو سکتے ہیں جن کا اب تک استعمال نہیں کیا گیا۔"[47] 'گریز' میں عزیز احمد نے ناول نگاری کے مختلف طریقوں سے فائدہ اٹھایا ہے اور ان کے امتزاج سے اپنا ایک مخصوص انداز پیدا کیا ہے۔ پرسی لبک کے کہنے ہی کے مطابق ناول کی بہترین ہیئت وہی ہوتی ہے جو ناول کے پورے مواد کو مکمل طریقے پر ظاہر کرتی ہے اور بہترین طریقہ وہی ہوتا ہے جس میں پورا مواد کھپ سکتا ہے۔"[48] 'گریز' میں یہی خصوصیت پورے طریقے سے ملتی ہے۔ عزیز احمد نے اس میں مکتوباتی طریقہ بھی استعمال کیا ہے۔ ڈائری کے طریقے کو بھی کام میں لایا ہے اور کسی حد تک شعور کی رَو اور تاثراتی طریقے کو بھی اختیار کیا ہے۔ یہ تمام طریقے اپنی اپنی علیحدہ اور مختلف نوعیت رکھتے ہیں۔ خطوط اور ڈائری کے طریقے سے متعلق ڈیچس نے لکھا ہے کہ خطوط کے ذریعہ کرداروں کے خیالات اور موڈ پیش کیے جا سکتے ہیں اور ڈائری میں مختلف موقعوں پر جو ذہن کی کیفیت اور حالت ہوتی ہے اس کو پیش کیا جا سکتا ہے۔"[49] شعور کی رو اور تاثراتی طریقے سے کردار کی نفسیاتی حالت کو مکمل ترین انداز میں پیش کیا جا سکتا ہے اور زندگی کے ہر رخ کو بے نقاب کیا جا سکتا ہے لیکن جیسا کہا جا چکا ہے کہ انھوں نے اس ناول میں شعور کی رو کے طریقے کو کہیں بھی پورے طریقے سے اپنایا نہیں ہے۔ البتہ تاثراتی انداز سے انھوں نے موقع محل سے استفادہ کیا ہے۔ اس طرح انھوں نے مختلف طریقوں کو اختیار کر کے اپنے مواد کا مکمل ترین اظہار کیا ہے۔ مجموعی طور سے دیکھا جائے تو 'گریز' کی ہیئت بظاہر روایتی معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس میں ایک واضح پلاٹ ہے، کہانی ہے اور پھر ناول کا ابتدائی، درمیانی اور اختتامی حصہ پوری طرح واضح ہے۔ عزیز احمد نے گو ناول کی ہیئت میں کوئی ایسی غیر معمولی تبدیلی نہیں کی ہے لیکن اس کے باوجود ان کا انداز بالکل منفرد ہے۔ لارنس کے ناولوں کے متعلق بھی یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس نے روایتی انداز کے خلاف نہ تو کوئی بغاوت کی ہے نہ ہی کوئی تجربہ کیا ہے لیکن وہ بظاہر روایتی انداز میں بالکل نئی چیز پیش کرتا ہے اور نئے انداز میں پیش کرتا ہے۔"[50] لارنس کے متعلق یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ ایسے رجحانات اور عناصر کو پیش کرتا ہے جو مخصوص طور پر اور قطعی طور پر جدید ہوتے ہیں۔"[51] یہ تمام باتیں عزیز احمد پر صد فی صد صادق آتی ہیں۔ اس لیے ہر لحاظ سے عزیز احمد اردو کے ایک بہت بڑے اور منفرد ناول

نگار ہیں اور ان کا ناول 'گریز' اردو کے عظیم ناولوں میں سے ایک ہے۔

عزیز احمد کا دوسرا اہم کارنامہ ان کا ناول 'آگ' ہے۔ یہ ناول ۱۹۴۷ء سے پہلے لکھا گیا ہے۔ اس میں ۱۹۰۸ء سے لے کر ۱۹۴۲ء تک کی کشمیری زندگی پیش کی گئی ہے۔ یہ ناول اردو ناول نگاری میں عزیز احمد کا دوسرا اہم کارنامہ ہے۔ اس ناول میں اور ڈی ایچ لارنس کے ناول 'ایرونس رڈ' (A RON's ROD) میں بڑی مماثلت ہے۔ ڈیوڈ ڈیچس نے اس کے متعلق کہا ہے کہ اس ناول کو سفرنامہ کی طرح پڑھا جا سکتا ہے۔"[52] بالکل یہی حال 'آگ' کا ہے جس طرح وہ بغیر ہیئت کا ناول ہے ویسے ہی 'آگ' بھی ہے جس طرح اس میں اٹلی کو پیش کیا گیا ہے اسی طرح 'آگ' میں کشمیر کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ ناول دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ 'شنیدہ' ہے اور دوسرا حصہ 'دیدہ' ہے۔ دوسرا حصہ زیادہ تر ایک سفرنامہ کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ اور وہ شروع بھی ہوتا ہے اس طرح سے:

> "میں واحد متکلم بڑے شش و پنج میں ہوں۔ کسی ایسی قوم کا کارنامہ لکھنا جس سے لکھنے والا خارجی طور پر واقف ہو بہت مشکل ہے۔ اور شنیدہ سے دیدہ کی طرف آتے ہوئے بھی میں واحد متکلم محض ناظر رہ جاتا ہوں۔۔۔۔۔ ظاہر ہے کہ اندر کی زندگی مجھ واحد متکلم نے کم دیکھی ہے اور اس لیے میں واحد متکلم ناظر ہوں، تماشائی ہوں۔۔۔۔ اور ۱۹۴۲ء کے اپریل کے پہلے ہفتے میں ناظر میں تماشائی کشمیر آتا ہوں۔"[53]

اس طرح یہ ناول بظاہر صرف کشمیری زندگی تک محدود ہے لیکن اصل میں اس ناول میں کشمیر کی زندگی کی اضافت سے ۱۹۰۸ء سے ۱۹۴۵ء تک کے ہندوستانی حالات کو بھی ایک طرح سے پیش کیا گیا ہے۔ کیونکہ اس دوران میں ہندوستان کی سماجی، سیاسی اور معاشی زندگی میں جو تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں ان کی جھلکیاں کشمیری زندگی کی تبدیلی میں صاف طور پر نمایاں ہو گئی ہیں۔ اس طرح سے بہت بڑے پیمانے پر 'آگ' میں کشمیر کی زندگی کی اضافت سے ہندوستانی زندگی کی جھلکیاں بھی دکھائی گئی ہیں۔ اس وسیع زندگی کے سارے حقائق ناول نگار اپنے مشاہدے اور تجربے کی بنا پر حاصل کرتا ہے اور ان کو پیش کرتا ہے۔ اس لیے ناول میں یا تو کسی قدر 'شنیدہ' حصہ ہے یا پھر بڑا حصہ 'دیدہ' ہے۔ موجودہ عہد کے ناول نگار کے متعلق جی ایس فریسر نے کہا ہے کہ ایک اچھا ہم عصر ادیب خاص طور پر ناول نگار حقیقت اور سچائی کا احترام رکھتا ہے۔ لیکن اس سچائی اور حقیقت کو خود دریافت کرتا ہے اور اس طرح سے اپنے نقطہ نظر سے

اس کو پیش کرتا ہے۔"[54] آگ میں یہی خصوصیت ملتی ہے۔ عزیز احمد نے اپنے مشاہدے اور تجربے کی بنا پر کشمیری زندگی اور ہندوستانی زندگی کو پیش کیا ہے۔ اس طرح سے 'آگ' ہنری جیمس کی ناول کی تعریف پر بھی پورا اترتا ہے۔ ہنری جیمس زندگی کی راست اور شخصی اثر کو ناول کہتا ہے۔"[55] 'آگ' میں ہر جگہ زندگی کا یہی راست اور شخصی اثر ملتا ہے۔ ان باتوں کے لحاظ سے 'آگ' اردو ناول نگاری میں ایک امتیازی مقام رکھتا ہے۔

'آگ' عزیز احمد کا ایسا ناول ہے جس میں کشمیر کی زندگی بالکل بے نقاب ہوگئی ہے اور اس کا ہر رخ سامنے آگیا ہے۔ یہاں کشمیر 'جنت نشاں' ہی نہیں، 'جہنم زاد' بھی نظر آتا ہے۔ یہاں قدرت کا رحم و کرم ہی نہیں بلکہ اس کا قہر و غضب بھی اپنی نمایاں ترین شکل میں سامنے آتا ہے۔ کشمیر کی ایسی اور اتنی سچی تصویر اردو کے کسی اور ناول میں نظر نہیں آتی۔ کشمیر کا افلاس اور اس کی غربت، اس کی گندگیاں اس کی نجاستیں، اس کے بے کس و مجبور عوام، اس کی بھوک اور افلاس سے روندی ہوئی مخلوق اور اس بھوک اور افلاس کے ہاتھوں تباہ ہوتی ہوئی اخلاقی حالت۔ غرض اس میں کشمیری زندگی کے سب ہی کرب ناک پہلو سامنے آگئے ہیں۔ پھر اس افلاس اور غربت میں اضافہ کرنے والوں کی زندگی کو بھی نمایاں کیا گیا ہے جو دن بہ دن امیر سے امیر ترین بنتے جارہے ہیں، جو اپنے سرمایہ سے کشمیری غریبوں کی محنت، عزت اور حمیت کو کوڑیوں کے مول خرید لیتے ہیں اور اس سے ہر طرح کا ناجائز فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ کشمیر کی زندگی کو زہر آلود بنانے میں ڈوگرہ شاہی، سرمایہ داری اور انگریزی تسلط کا جو ہاتھ رہا ہے وہ بھی ہر جگہ دیکھا جاسکتا ہے۔ اس ناول کی اہم ترین خوبی یہی ہے کہ اس میں کشمیری زندگی کا ہر پہلو نمایاں ترین صورت میں ملتا ہے۔ اس میں 'خواجہ غفنفر جو' 'سکندر جو' اور 'انور جو' کا خاندانی سلسلہ ہے، جو سرمایہ داری کے نمائندے ہیں، جن میں سے 'غفنفر جو' اور 'سکندر جو' کی زندگی صرف دولت کمانے اور عیاشی کرنے میں گزرتی ہے۔ ان کی دولت کشمیری حسن کو خریدتی ہے۔ ان کے چاندی اور سونے کے سکوں کے مارے مفلس حسن کے عصمت و عفت کے شیشے چکنا چور ہوتے رہتے ہیں۔ اس میں ظہری صاحب جیسے متوسط طبقے کے پڑھے لکھے لوگ ہیں، جو تعلیم کی اہمیت اور ضرورت کو بھی واضح کرتے ہیں اور جو جمہوریت پسند بھی ہیں اور غریبوں کے حامی بھی اور جو یہ کہتے ہیں:

"با خدا خواجہ صاحب، اپنے ملک کی حالت دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اتر آتا

ہے۔ ہم لوگوں سے بھیڑ بکریاں گھوڑے خچر اچھے ہیں۔ وہ مار کھاتے ہیں تو کبھی کبھی سرکشی بھی کرتے ہیں۔ ہم کو تو کسی چیز کا احساس ہی نہیں۔ یہ بھوک دیکھیے۔ یہ غربت دیکھیے۔ یہ افلاس، یہ سب دیکھ کے میرا خون کھولتا ہے۔"[56]

لیکن یہی ظہری صاحب جو غریبوں کی حمایت میں یہ تقریر کرتے ہیں وہی جب ڈوگرہ حکومت کی ملازمت اختیار کرلیتے ہیں تو انھیں ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد، 'واہیات' معلوم ہوتی ہے۔ یہاں امیر اور متوسط طبقے کے ان خود غرض افراد کے ساتھ بے حس، مجبور اور غریب نچلے طبقہ کے افراد بھی ہیں۔ ان میں زون اور فضلی بھی ہیں جن کا بے مثال حسن چند چاندی کے ٹکڑوں کے عوض 'غفنفر جو' اور 'سکندر جو' خرید لیتے ہیں۔ یہاں زون کا شوہر رجبا ہے جو اپنی بیوی کو غفنفر جو کے حضور میں پیش کرتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں 'زون' کے نئے پھیرن بنتے گئے۔ کنواج اور دور اور تالا زر پر سونے کا ملمع ہوگیا۔ رجبا کے کپڑے سفید اور نئے معلوم ہونے لگے۔ یہاں تک کہ چھوٹی سی فضلی بھی اجلے اجلے کپڑے پہننے لگی۔ یہ سلسلہ 'غفنفر جو' تک ہی محدود نہیں رہتا، جب اس کا لڑکا 'سکندر جو' علی گڑھ سے تعلیم پا کر واپس آتا ہے تو زون کی لڑکی فضلی کے حسن سے مسحور ہو کر رہ جاتا ہے۔ ان دونوں کو ملانے میں 'غفنفر جو' کا قدیم اور وفادار نوکر امدا ایڑی چوٹی کا زور لگاتا ہے اور آخر 'سکندر جو' کی شادی کی دوسری رات ہی نقب لگا کر فضلی اور 'سکندر جو' کو ملا دیتا ہے۔ اور اس طرح اپنی وفاداری کو سرخرو کرتا ہے، اور حق نمک ادا کرتا ہے۔ اس طرح یہاں غریبوں امیروں کا وہ 'لین دین' سامنے آتا ہے جو دونوں کے لیے باعث شرم ہے۔ پھر اس میں حالات کی وہ تبدیلی بھی ملتی ہے جب کہ 'سکندر جو' کا لڑکا انور جو نئے حالات کو محسوس کرتے ہوئے بڑی حد تک اپنے آپ کو ان کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ 'آگ' میں اس طرح کشمیر کی زندگی اپنی پوری گہرائی اور گیرائی کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ یہ کشمیری زندگی کی حقیقی تصویر ہے۔ اس تصویر میں امراء اور سرمایہ دار طبقہ سے غریب طبقہ تک ہر ایک کی زندگی پوری طرح نمایاں ہوتی ہے۔ بے شمار کردار سامنے آتے ہیں اور کئی کہانیاں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ اور یوں زندگی کی ساری گھما گھمی سامنے آجاتی ہے۔ بالزاک کے متعلق ہنری جیمس نے کہا تھا کہ کیت اور شدت اس کے ناولوں کا امتیازی وصف ہے اور یہ کہ وہ بہت سے حقائق کو دیکھتا ہے۔ سماجی حقائق کو بھی، تاریخی حقائق کو بھی اور پھر ان کے متعلق بے شمار خیالات اور تصورات رکھتا ہے۔"[57] بالکل یہی بات عزیز احمد کے اس ناول کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔ 'آگ' میں انھوں نے کشمیری زندگی کو پیش کرتے ہوئے بے شمار سماجی، تاریخی، سیاسی اور

معاشی حقائق کو پیش کیا ہے۔ ان حقائق کو پیش کرنے کے لیے عزیز احمد نے ناول کی کسی بندھی ٹکی تکنیک کی پیروی نہیں کی ہے۔ اس لیے اس ناول میں سرمایہ دار طبقے کی تین نسلوں کی زندگی کی اضافت سے کشمیری زندگی کے ہر رُخ کو اور اس کی ساری تبدیلیوں کو پیش کیا گیا ہے۔

اس طرح 'آگ' میں بظاہر کشمیر کی تین نسلوں کی کہانی بیان کی گئی ہے، لیکن حقیقت میں یہ 'جو' خاندان کی کہانی بھی نہیں ہے۔ 'آگ' ایک ایسا ناول ہے جس کا کوئی پلاٹ نہیں ہے، جس کی کوئی واضح کہانی نہیں ہے۔ ایک طرح سے اس ناول کا کوئی ہیرو بھی نہیں ہے نہ ہی کوئی ہیروئن ہے۔ البتہ کشمیری سماج اور کشمیری زندگی ہی اس ناول کے مرکزی اور محوری کردار ہیں۔ پرسل نے کہا ہے کہ ناول نگار کا کام فرد کو سماج میں پیش کرنا ہے اس لیے سماج خود بڑے ناولوں میں ایک اہم کردار بن جاتا ہے۔[58] 'آگ' میں بھی کشمیری سماج اس ناول کا اہم ترین اور مرکزی کردار بن گیا ہے۔ اس لیے ناول نگار خود کہتا ہے:

> "میں واحد متکلم پھر سوچ رہا ہوں۔ اس ناول میں ہیروئن کا ملنا تو مشکل ہی تھا کیونکہ شریف گھر کی کشمیرن کو کون دیکھ سکتا ہے۔ معصومیت سے اجنبی سیاح اسے کیا جانے۔ اس کا جسم، اس کا چہرہ، اس کا حسن، اس کی آواز سب پردہ کرتی ہے۔۔۔۔ صرف کھڑکیوں پر جھروکوں سے جھانکتی ہے اور اس کی ٹوپی اور سر سے لٹکتا ہوا کپڑا ابھی ایسا ہی میلا ہوتا ہے، جیسے اس کی نوکرانیوں کا۔ وہ ظلم سے، آزادی سے، سورج کی روشنی سے، تازہ ہوا سے، مرد کی نگاہوں سے، سچی محبت سے محروم ہے۔"[59]

اس طرح 'آگ' میں ہیروئن کی بجائے کشمیری زندگی ہی کی تفصیل ملتی ہے اور ہیروئن کے نہ ملنے کا سبب بتاتے ہوئے ناول نگار نہ صرف کشمیری زندگی کو پیش کرتا ہے بلکہ اس کی کھوج میں وہ ان سارے سماجی معاشی اور سیاسی اسباب تک بھی پہنچ جاتا ہے جس کی وجہ سے یہ ہیروئن کہیں گم ہوگئی ہے۔ وہ بتاتا ہے:

> "برطانوی حکومت، برطانوی سرمایہ کی غلام ہے۔ گورنمنٹ آف انڈیا برطانوی حکومت کی، ریاست گورنمنٹ آف انڈیا کے سیاسی محکمے کی، کشمیر کے شرفا ریاست کے غلام ہیں اور شرفا کی بیویاں، شرفا کی غلام ہیں، اور یہ پورا نظام کھنکتے ہوئے سکوں کی جھنکار پر چمکتے ہوئے سکوں کی جگ مگ پر قائم ہے۔ میں واحد متکلم اجنبی ملک کا رہنے والا اس سرزمین میں ہیروئن کہاں سے ڈھونڈوں، جہاں سوائے مزدور عورتوں کے دوسرے طبقے کی عورتیں سڑکوں پر چلتی پھرتی دکھائی نہیں دیتیں، دکانوں میں سودا

> نہیں خریدتیں، ڈونگوں میں بیٹھ کر باغوں کو ضرور جاتی ہیں مگر ان کے ساتھ ان کے مرد ہوتے ہیں جو ان کی ہر اٹھتی نگاہ ان کی گردن کی ہر جنبش، ان کے برقعے کی ہر شکن پر احتساب کرتے ہیں۔ میں واحد متکلم ان عورتوں اور ان کے احساسات کی تفصیل، ان کی ذہنیت، ان کا طرز عشق کیا جانوں، کیا لکھوں۔"[60]

اس طرح تہ در تہ غلامی کے اس سلسلے میں اس ناول کی ہیروئن گم ہوگئی ہے لیکن اس میں ناول کے ہیرو کی بھی حیثیت ثانوی ہی ہے۔ پرسی لبک نے 'مادام بواری' کے متعلق کہا تھا کہ یہ ناول ایک قسم کا ڈرامہ ہے جس میں ایک عورت مختلف حقائق سے دوچار ہوتی ہے۔ یہ ڈرامہ اپنے اندر جو تصویر رکھتا ہے اس کو پیش کرنے کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ یہ ڈرامہ اس لیے سامنے آتا ہے کہ مختلف لوگ جس طرح زندگی بسر کرتے ہیں اس کو نمایاں کیا جائے۔[61] اس لیے اس کے نزدیک 'مادام بواری' اور اس کا سماج اور ماحول ناول کے اہم ترین کردار ہیں۔ 'آگ' کا ڈرامہ بھی اپنے اندر جو تصویر رکھتا ہے اس کو نمایاں کرنے کے لیے لکھا گیا ہے۔ یہ تصویر کشمیری زندگی کی تصویر ہے، اسی کو پیش کرنے کے لیے 'جو' خاندان کی زندگی پیش کی گئی ہے۔ اس طرح سے یہاں بھی 'مادام بواری' کی طرح 'جو' خاندان اور ان کا ماحول اور سماج یعنی کشمیری زندگی ناول کے اہم ترین کردار بن گئے ہیں لیکن ان دونوں کرداروں میں فوقیت کشمیری زندگی ہی کو حاصل ہے۔ جیسا کہ 'واحد متکلم' لکھتا ہے:

> "مجھے سب سے زیادہ فکر اس بات کی ہے کہ ہیرو بھی میرے ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے، سکندر جو کی جگہ کشمیر کے مناظر اور کشمیر کی زندگی اس ناول کے ہیرو بنے جا رہے ہیں۔ کیونکہ میرا ہیرو ایک امیر تاجر ہے۔ اس کے جذبات میں گہرائی نہیں۔ اس کے دل میں سچے عشق کی آگ بھڑکتی ہی نہیں یا اگر زون کی لڑکی فضلی کے لیے بھڑکی بھی تو وہ جھوٹی آگ تھی۔ جہنم کی آگ نہیں لالے کی آگ نہیں، پھلجھڑی کی آگ، پٹاخے کی آگ۔ اس کا دماغ زیادہ سے زیادہ پیسے کمانے اور زیادہ سے زیادہ عورتوں کو پھانسنے کے سوا کسی فکر سے آشنا نہیں۔"[62]

حقیقتاً 'آگ' کے ہیرو اور ہیروئن 'کشمیر کے مناظر اور کشمیر کی زندگی' ہیں۔ فلپ ہنڈرسن کا کہنا ہے کہ ناول کا سب سے اہم اور تخلیقی کام یہ ہے کہ وہ انسانی زندگی سے وابستہ رہے اور اس طرح سماجی مسائل کو پیش کرے۔ اس کا کہنا ہے کہ بڑے لکھنے والوں کا مقصد ہمیشہ انسان اور اس کے ماحول کو دیکھنا

اور دکھاتا رہا ہے۔[۶۳] 'آگ' میں بھی بنیادی مقصد کشمیر کے باشندوں، ان کے سماجی مسائل اور اس پورے ماحول کو پیش کرنا ہے جس میں ان کی زندگی جکڑی ہوئی ہے۔ اس لیے اس ناول کا موضوع 'آگ' ہے اور اس کا عنوان بھی 'آگ' ہے۔ اس میں کشمیر میں بھڑکنے والی ہر قسم کی آگ کو پیش کیا گیا ہے۔ نئے حالات کی آگ، سیاسی حالات کی آگ، اشتراکیت کی آگ، بیداری کی آگ، انقلاب کی آگ اور ان سب سے بڑھ کر بھوک کی آگ کشمیر میں بھڑکتی نظر آتی ہے۔ عزیز احمد لکھتے ہیں:

''واقعتاً کشمیر میں آگ کے سوا ہے کیا۔ بھوک کی آگ جو خواجہ سکندر جُو اور ان کی طرح کے بیچ کے پونچھ کھانے والوں نے پھیلائی ہے۔ لکڑی کے کھودنے والے دیدے سے پھوڑ کر کپڑے پر رنگ برنگی پھول کاڑھنے والے دیدہ ریزہ کر کے قالین بنانے والے ہر سال ابتدا بہار میں زولاجی کے گیارہ ہزار فیٹ عبور کرنے والے مزدوروں کی محنت کا یہ ثمر — مگر کیا یہ آگ اس کو اور اس مہاجنی نظام، جاگیرداری نظام کو نہ جلائے گی۔ ہر طرف آگ ہی آگ، بھوک کی آگ، چنار کی آگ، لالے کی آگ، بیماریوں کی آگ۔''[۶۴]

یہاں عزیز احمد نے کشمیر میں بھڑکنے والی ہر قسم کی آگ کو پیش کرتے ہوئے انقلاب اور بغاوت کی اس آگ کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو کسی قدر رفتہ رفتہ پھیل رہی تھی اور جو کسی بھی موقعہ پر پوری شدت کے ساتھ بھڑک سکتی تھی۔ لینن نے اپنے ایک مضمون میں کہا ہے کہ ایک صحیح معنوں میں بڑا فن کار انقلاب کے بعض پہلوؤں کی لازمی طور پر عکاسی کرتا ہے۔[۶۵] عزیز احمد نے ہندوستان اور خاص طور پر کشمیری زندگی میں رفتہ رفتہ جو انقلاب آ رہا تھا اس کی سچی عکاسی کی ہے، جس کی ایک روشن مثال انور جو کے خیالات کی تبدیلی میں نظر آتی ہے۔ 'انور جو جو ملک التجار سکندر جو' کا لڑکا ہے وہ بعض ایسی سرگرمیوں میں حصہ لیتا ہے اور اس کی ہمدردیاں محنت کش طبقے اور سیاسی جدوجہد سے ایسی وابستہ ہو جاتی ہیں کہ 'انور جو پر سرکار کی نظریں ذرا شک کے ساتھ کھٹک کھٹک کر پڑ رہی تھیں۔[۶۶] اس لحاظ سے 'آگ' کو پرولتاری ناول کہا جا سکتا ہے۔ فلپ ہنڈرسن کہتا ہے کہ پرولتاری ادب میں محنت کش اور غریب عوام کی مصیبتوں اور ان کی تکالیف سے بحث کی جاتی ہے اور ان کو پیش کیا جاتا ہے۔[۶۷] 'آگ' میں بھی بنیادی طور پر وہاں کی مفلسی، غربت، بھوک اور نچلے اور محنت کش طبقے کی زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ اونچے طبقے

کی زندگی کو بھی مکمل انداز میں پیش کر کے اس استحصال کو بھرپور طریقے سے نمایاں کیا گیا ہے جو وہاں صدیوں سے ہو رہا تھا۔

کشمیر میں بھڑکتی ہوئی مختلف قسم کی آگ اس ناول کا موضوع بھی ہے اور اس کا پس منظر بھی۔ ناول میں ۱۹۰۸ء سے لے کر ۱۹۳۵ء تک کا زمانہ پیش کیا گیا ہے۔ اتنے طویل عرصہ کی بازتعمیر بڑا مشکل کام تھا لیکن عزیز احمد نے انتہائی خوش اسلوبی سے اس پورے عرصہ کو تین سو صفحات کے اندر اسیر کر لیا ہے۔ ناول نگار کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ہندوستان ہی نہیں بلکہ دنیا کی تبدیلی کے پس منظر میں کشمیری زندگی کی تبدیلی کو پیش کرنے کی انتہائی کامیاب کوشش کی ہے۔ نئے حالات کی رو، نئے خیالات کی آمد، نئے رجحانات، نئی بیداری، نئی سماجی اور سیاسی تبدیلیاں کشمیری زندگی میں سرایت کرتی دکھائی گئی ہیں۔ اس تبدیلی کو جس طرح پیش کیا گیا ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے:

''یہ ۱۹۱۸ء کا ذکر ہے۔ اس زمانہ میں 'غضنفر جو' کے کاروبار میں کئی طرح کے انقلاب آ گئے تھے۔ سمرقند اور بخارا وغیرہ کی طرف بدامنی کی وجہ سے ادھر کا مال آنا بالکل رک گیا تھا۔ کابل میں بھی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی اور اس کی وجہ سے چمڑوں اور سموروں کی تجارت پر اثر پڑ رہا تھا ـــــ 'سکندر جو' کے کالج میں پڑھنے کی ان کے خیال میں ایسی زیادہ ضرورت نہیں تھی۔ ان کے لالہ خوشحال چند نے جو اس زمانہ میں ہوم منسٹر تھے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ زیادہ پڑھنے سے دماغ خراب ہوتا ہے۔ اس کی مثال لالہ خوشحال چند نے اپنے لڑکے کے حالات بیان کر کے دی تھی، جو پہلے لاہور اور پھر بمبئی میں پڑھتا تھا اور ایم اے تک پڑھنے کے بعد سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے گاندھی جی کے ساتھ ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے سارے سوٹ اتار کر رکھ دیے تھے، یا شاید انھیں جلا دیا تھا اور ایک کھادی کی لنگوٹی باندھے پڑا پھرتا تھا، بہرحال 'خواجہ غضنفر جو' اس روپ میں سکندر جو کو ہرگز نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔''[۶۸]

اس طرح جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے ناول میں ہندوستان کے سیاسی حالات کا تذکرہ بڑھتا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ سارے ہندوستان میں سیاسی بیداری، اور آزادی کی جدوجہد پھیلتی جا رہی تھی، بڑھتی جا رہی تھی۔ کانگریس اور لیگ کے اختلافات، دوسری جنگ عظیم کے اثرات، پاکستان کے قیام کی بحثیں، اشتراکیت کی طرف میلان، آزادی حاصل کرنے کی خواہش اور اس کے لیے جدوجہد،

سیاسی شورشیں اور ہنگامے، غرض حقیقی زندگی کے یہ مختلف پہلو اور یہ ساری چہل پہل 'آگ' میں جھلکتی نظر آتی ہے اور اس کے ساتھ ان تمام حالات سے زندگی میں جو بے چینی اور اضطراب پیدا ہو رہا تھا وہ بھی ہر جگہ انتہائی خوبی سے پیش کیا گیا ہے۔ زندگی کے پورے نظام اور موجودہ تمدنی ڈھانچہ سے جو بے اطمینانی پھیل رہی تھی وہ بھی عمدگی کے ساتھ نمایاں کی گئی ہے۔ سکندر جو کے یہ الفاظ جدید دور کی زندگی اور اس کی تمدنی کیفیت کو ظاہر کرتے ہیں:

''اس تمدن کی ہر چیز سڑی اور گلی ہوئی ہے۔ غریب اور امیر کوئی اس اثر سے بچ نہیں سکتے۔ اس تمدن کی ہڈیاں تک سڑ گل گئی ہیں۔''

غرض اس ناول میں زندگی کے مختلف اور متضاد روپ اور اس کی تبدیلیاں مکمل انداز میں پیش کی گئی ہیں۔ اس میں ان تمام باتوں کی پیش کش بھرپور طریقے سے اس لیے ممکن ہو سکی ہے کہ اس ناول میں کوئی مرکزی کہانی اور پلاٹ ایسا نہیں ہے جو مواد کو پھیلاؤ سے روک سکے۔ یہ پورا ناول تاثراتی انداز کا ہے۔ تاثراتی انداز میں صرف بیرونی خدوخال کو نہیں بلکہ پورے جسم کو دیکھا جاتا ہے۔ جوزف وارن بیچ نے تاثراتی انداز کے متعلق لکھا ہے کہ اس میں کسی بات کو ڈرامائی شکل میں پیش نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے حقیقی اور زندہ احساس سے تعلق رکھا جاتا ہے۔ یعنی ناول نگار اس طریقے میں اپنے محسوسات کو پیش کر دیتا ہے۔ آگ میں بھی مختلف باتوں اور واقعات کی ڈرامائی پیش کش نہیں ملتی بلکہ یہ واقعات اور باتیں جو تاثر مرتسم کرتے ہیں اور جو احساس پیدا کرتے ہیں انھی کو پیش کیا گیا ہے۔ ناول کی یہ خوبی کہیں کہیں اس کی خامی بھی بن گئی ہے چونکہ اس میں کشمیری زندگی کے بے شمار تاثرات کو اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ اس لیے دلچسپی کا کوئی ایسا مرکز نہیں ہے جو قاری کی توجہ کو مستقل طور پر اپنی طرف منعطف رکھ سکے لیکن اس کے باوجود اس ناول کی اہمیت میں کوئی فرق نہیں آتا کیونکہ اس ناول میں ہم عصری تاریخ ملتی ہے۔ اس کی یہی خصوصیت اس کو ممتاز بناتی ہے۔ ایسی ناول نگاری میں سب سے بڑی دشواری اور مشکل ترین کام یہی ہے کہ ناول نگار کو کہانی وقتی بنانے کے بجائے غیر وقتی بنانی ہوتی ہے۔ اپنے ناول کو وقتی بنانے سے بچانے کے لیے ناول نگار کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ بقول جان ہنری کے واقعات پر روشنی نہ ڈالے بلکہ ان انسانوں کو ابھارے جو ان واقعات اور حادثات کا شکار ہیں۔ عزیز احمد ہم عصری تاریخی ناول نگاری کی اہم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ وہ وقتی حالات یا واقعات کو پیش نہیں کرتے بلکہ مختلف کرداروں کو اس طرح اور ایسے انداز سے ابھارتے ہیں کہ مختلف واقعات کی اہمیت اور اس کا اثر صاف

طور پر نمایاں ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 'آگ' میں بیسیوں کردار پیش کیے گئے ہیں لیکن ہر کردار اپنی پوری انفرادیت کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ ہر کردار واضح اور روشن ہے۔ اتنے سارے کرداروں کو اس طرح پیش کرنا کہ زندگی کی گھما گھمی سامنے آئے، ناول نگار کی کامیابی کی زبردست دلیل ہے۔ پرسیٹ نے ناول نگار کی بڑائی اور عظمت کی کسوٹی یہی قرار دی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ بہت سے کرداروں اور لمبے مناظر کو مسلسل انداز میں پیش کرنے کی قدرت ہی کے ذریعہ ناول نگار کی آزمائش ہوتی ہے۔ عزیز احمد اس کسوٹی پر پورے اترتے ہیں جو ان کی بڑائی کی دلیل ہے۔

'آگ' کی سب سے اہم ترین خصوصیت اور اس کا ممتاز وصف جو اردو ناول نگاری میں اس کو بڑی اہمیت بخشتا ہے، یہ بھی ہے کہ 'آگ' میں وقت کے بہاؤ اور زمانے کے گزرنے کو اپنے پورے فطری رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ یہاں 'غفنفر جو' کی جوانی بڑھاپے میں تبدیل ہوتی دکھائی گئی ہے اور بڑھاپا موت کی آغوش میں جاتا ہوا دکھایا گیا ہے اور 'سکندر جو' کا بچپن جوانی میں، جوانی بڑھاپے میں اور بڑھاپا موت میں تبدیل ہوتا دکھایا گیا ہے۔ اس کے ساتھ 'انور جو' کی بچپن سے لے کر جوانی تک کی تبدیلیوں کو پیش کیا گیا ہے۔ ان تینوں کرداروں کی عمریں بالکل فطری اور حقیقی انداز میں گزرتی دکھائی گئی ہیں۔ عمر کے ساتھ انسان کے کردار میں جو تبدیلی آتی ہے اس کو صحیح اور حقیقی رنگ میں پیش کرنا صرف بڑے ناول نگار ہی سے ممکن ہے۔ پرسی لبک نے ٹالسٹائی کے ناول 'جنگ و امن' کے متعلق کہا تھا کہ وقت اس ناول میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ 'جنگ و امن' کی بنیادی خوبی بھی اسی میں مضمر دیکھتا ہے، اور کہتا ہے:

''وقت خاموشی سے گزر جاتا ہے، لوگ زندگی کے کاموں میں مصروف رہتے ہیں اور اسے بھول جاتے ہیں لیکن وقت ان کے چہروں سے مترشح ہوتا ہے، ان کی حرکات سے بھی اور ان کے خیالات سے بھی۔ وہ اس کے گزرنے کا اس وقت خیال کرتے ہیں جب کہ اس کا بہترین حصہ چلا جاتا ہے۔''

'آگ' میں بھی وقت کا یہ خاموش فطری بہاؤ اپنے حقیقی ترین رنگوں میں نمایاں کیا گیا ہے۔ جو اس ناول کو غیر معمولی اہمیت بخشتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ اردو کا منفرد ناول ہے جس کی بڑائی میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا۔

مجموعی طور پر عزیز احمد کی ناول نگاری اردو ناول نگاری کا بڑا ہی گراں قدر سرمایہ ہے اور وہ اردو کے عظیم ناول نگاروں میں سے ایک ہیں۔

حواشی

۱ ناول کی تاریخ و تنقید، ص ۳۳۶

۲ ایضاً، ص ۳۳۸

۳ داستان سے افسانے تک، ص ۸۵

۴ ناول کی تنقیدی تاریخ، ص ۳۳۵-۳۳۴

۵ Fifty years of English Literature, p.129

۶ دیباچہ، ہوس

۷ ایضاً

۸ Aspects of the Novel, P.53

۹ The Problem of Style, p.30

۱۰ A Trazatise on the Novel, p.53

۱۱ مقدمہ 'زہر اور خون' ص ۷

۱۲ 12The Liberal Imagination, p.2

۱۳ ایضاً، ص ۲۱۷

۱۴ The Liberal Imagination, p.222

۱۵ Aspects of the Novel, p. 86

۱۶ The Intellectual Hero, P.14

۱۷ American Review (Quaterly) Jan. 1965. p.93

۱۸ What Happens in Literature, p.72

۱۹ The Twentieth Century Novel, p. 180

۲۰ English Literature of the Twentieth Century, p.136

۲۱ گریز، ص ۳۰

۲۲ ایضاً، ص ۳۱

۲۳ Freud: His Dream and Sex Theories, p.49

۲۴ گریز، ص ۳۰

۲۵ ایضاً، ص ۳۳

۲۶ Some Principles of Fiction, P.17

۲۷ ایضاً، ص ۱۳

۲۸ گریز، ص ۱۶۸

۲۹ Greek Tragedy and the Modern World, p.1

۳۰ گریز، ص ۲۷۷

۳۱ Forms of Modern Fiction, p.200

۳۲ گریز، ص ۱۳۳

۳۳ ایضاً، ص ۲۹۳

۳۴ ایضاً، ص ۲۹۷-۲۹۸

۳۵ گریز، ص ۳۰۱

۳۶ ایضاً، ص ۲۸۷

۳۷ The Novel and the Modern World, p.162

۳۸ ایضاً، ص ۱۳۶

۳۹ ایضاً، ص ۱۰۲

۴۰ ایضاً، ص ۱۲۱

۴۱ ایضاً، ص ۱۲۱-۱۲۲

۴۲ ایضاً، ص ۱۳۸

۴۳ گریز، ص ۱۳۹

۴۴ Sex, Literature and Censorship, p.74

۴۵ ایضاً، ص 76-77

۴۶ The Craft of Fiction, p.173

۴۷ The Novel and the Modern World, P.19-20

۴۸ The Craft of Fiction, p.40

۵۰ The Novel and the Modern World, P.19-20

۵۱ ایضاً، ص 139

(پروفیسر یوسف سرمست کی کتاب "بیسویں صدی میں اردو ناول" سے لیا گیا ہے)

✓

عزیز احمد اور نیچرلزم

پروفیسر عبدالسلام صدیقی

آکسفورڈ ڈکشنری میں نیچرلزم کے معنی اس طرح بیان کیے گئے ہیں:

"A style or method characterized by close adherence to, and faithful representation of nature or reality... That unnecesasarily faithful portrayal of offensive incidents for which Zola has found the new name of 'Naturalism'.[1]

ایک مختصر انسائیکلو پیڈیا میں اس لفظ کے معانی بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"Close adherence to nature in art or literature esp. (in literature) the technique, chiefly associated with Zola, used to present a naturalistic philosophy, esp. by emphasizing the effect of heridity and environment on human nature and action."[2]

اس نقطۂ نظر کا سب سے مشہور ترجمان ایمیلی زولا ۱۸۴۰ء تا سنہ ۱۹۰۲ء ہے دوسرے اہم ادیب HAUPTMANN' DREISER اور FARREL ہیں۔

نیچرلزم کی اولین مثال زولا کی 'Therese Requin' مصنفہ سنہ ۱۸۶۷ء ہے۔ اس کی اہم ترین تصنیف جس کا آغاز اس نے سنہ ۱۸۶۹ئ میں کیا وہ اس کی بیس جلدوں پر مشتمل کتاب 'Roguen-Macquart' ہے۔ یہ کتاب سنہ ۱۸۹۳ء میں مکمل ہوئی۔ اس کے بارے میں مندرجہ بالا انسائیکلوپیڈیا میں لکھا ہے:

"He traces the social and natural history of a family whose members are under the controling power of heredity and environment."[3]

نیچرلزم کو عام طور پر نقادوں نے زیادہ پسند نہیں کیا۔ اس لیے کچھ عرصہ کے بعد اس کا رواج تقریباً ختم ہو گیا۔ DICTIONARY OF WORLD LITERATURE میں اس انداز کے متعلق لکھا گیا ہے:

"Broadly speaking, naturalistic writing (e.g. Zola, Hauptmann, Dreiser, Farrel) presents, explicity or implicity, a view of experience that might be characterized aspessimistic materialistic determinism. It emphasize the strenght of external force (social and natural) that obstruct human freedom, and the strength of internal forces (genetic and unconscious) that limit human rationality and moral responsibility. There is a tendency to look upon life as a downhill struggle with the only issue in death or quiescene....writers in this mode are likely to take a behaviouristic or epiphenomenal view of mind and to show the primacy of tropestic or instructive behaviour to sex, hunger etc.... from the begining naturalism has been under attack for beiug sordid, gloomy, and subversive, notably (in recent years) by the New Humanists. Its pre-occupation with the less cerebral functions of behaviour has led many writers to an unjustified sensationalism and has helped produce the popular cofusion which identifies anything raw, stark, or sordid as naturalistic."[4]

نیچرلزم اور اس کے امام کے بارے میں MARTIN TURNELL نے لکھا ہے:

"Artistically, naturalism (as the nineteenth century understood it) was never anything more than a blind alley; and for the most part Zola's novels belong to the study of political and social propaganda rather than to the study of fiction."[5]

اردو میں نیچرل ازم یا فطرت نگاری کی مثال ہمیں صرف عزیز احمد کے یہاں ملتی ہے۔ وہ شعوری طور پر زولا کی تقلید کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور زندگی کی پیش کش صرف اسی انداز سے کرنے کے قائل ہیں۔

عزیز احمد کے اب تک چھ ناول شائع ہو چکے ہیں۔

۱۔ 'ہوس' ۱۹۳۲ء میں لکھا گیا (جب کہ وہ تھرڈ ایئر پاس کر کے گرمی کی چھٹیاں گزارنے گھر گئے تھے۔)
۲۔ 'مرمر اور خون' اسی سال موسم سرما میں لکھا گیا۔
۳۔ 'گریز' ۱۹۴۳ء میں کشمیر کے سفر میں مکمل ہوا۔
۴۔ 'آگ' ۱۹۴۶ء میں۔
۵۔ 'ایسی بلندی ایسی پستی' ۱۹۴۷ء میں اور
۶۔ 'شبنم' ۱۹۴۹ء میں لکھا گیا۔

'ہوس' اور 'مرمر اور خون' پر مولوی عبدالحق نے مختصر مقدمے لکھے ہیں۔ مولوی صاحب نے دراصل اپنے ہونہار طالب علم کی ہمت افزائی فرمائی تھی۔ ان دونوں ناولوں کو مصنف نے بعد میں خود عاق کر دیا ہے۔ ہمیں ان ناولوں کو بی اے کے ایک طالب علم کے نتیجۂ فکر کی حیثیت سے دیکھنا چاہیے۔ اس قسم کے نوجوانوں کی عام فطرت یہ ہوتی ہے کہ اگر انھیں کچھ لکھنے کا اتفاق ہو تو وہ اپنی تمام تر معلومات اُگل دینا چاہتے ہیں۔ ان دونوں ناولوں میں عزیز احمد نے یہی کیا ہے۔ اس زمانے کے مطالعے اور اثر پذیری کے بارے میں خود لکھا ہے:

''اس زمانے میں مجھے ناولوں کے پڑھنے کا شوق بھی بہت تھا اور خصوصیت سے میں ترگی نیف، دوما خورد، الفرے دموسے اور ایسے دوسرے انیسویں صدی کے روسی اور فرانسیسی رومان نگاروں سے متاثر تھا جو محبت کے جذبے کو اس طرح بیان کرتے ہیں گویا وہ ایک طرح کا 'جبر' ہے اور افراد خصوصاً عورتوں کے اختیار سے باہر۔ اسی عشقیہ یا

جنسی جبر کے جراثیم آپ کو اس نیم پختہ ناول 'ہوس' میں نظر آئیں گے۔ اس زمانے میں کنوٹ ہامزان کی نفسیات نگاری سے بھی میں بہت متاثر تھا اور خصوصاً 'بھوک' کی ہیئت اور تکنیک کا مجھ پر بہت اثر تھا۔ 'ہوس' میں جتنی بھی نام نہاد نفسیات نگاری ہے وہ کنوٹ ہامزان کی جھوٹی نقل ہے۔"[6]

اس ناول کے بارے میں خود عزیز احمد لکھتے ہیں:

" 'ہوس' بڑی حد تک زمانہ جاہلیت کے آثار سے بھری پڑی ہے۔ شروع کے حصے میں تفصیلات بہت ہلکی ہیں۔ زندگی کے زیادہ تر روشندان بند ہیں اور عنفوان شباب کی سستی جنسیت کے علاوہ کوئی خاص داخلی روشندان بھی نہیں کھل سکا، پھر ہیئت کی حد تک یہ کہ پہلے دو حصوں میں جیسی کچھ نفسیاتی اٹھان ہو رہی تھی وہ آخری دو حصوں میں پکی دیوار کی طرح بیٹھ جاتی ہے۔ اس کی کئی وجہیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان میں جذبات کی 'خیالی سیرابی' بہت زیادہ ہے۔ نہ ہیرو کی کامیابی میں کوئی خاص واقعیت ہے نہ اس انتقام میں جو منتقم حقیقی کے ہاتھوں سے بھگتنا پڑتا ہے اور نتیجہ یہ ہے کہ آخر میں ناول بہت پھنس پھنسا ہو کر رہ گیا ہے۔"[7]

یہ کتاب پردے کی مخالفت میں لکھی گئی ہے۔ اس میں وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ پردے کی پابندیاں، لڑکیوں میں ایسی گھٹن پیدا کر دیتی ہیں کہ وہ بہت جلد مردوں کے دام فریب میں پھنس جاتی ہیں۔ اس ماحول کا محرک گویا ان کا اصلاحی جذبہ ہے۔ عام اصلاحی ناولوں کی طرح اس میں برائی کا انجام برا ظاہر کیا گیا ہے۔ ناول کا ہیرو زلیخا کو خراب کرتا ہے وہ حاملہ ہو جاتی ہے اور جمیل کی تدبیروں سے وہ ذلت اور بدنامی سے بڑی مشکل سے بچ پاتی ہے۔ زلیخا کی بہن سلیمہ سے جب ہیرو کی شادی ہوتی ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ سلیمہ کو بھی اسی طرح خاندان کے کسی فرد نے خراب کر دیا ہے اور وہ بھی حاملہ ہے۔ اسی طرح اس میں شاعرانہ انصاف (POETIC JUSTICE) کا تقاضا بھی پورا کیا گیا ہے۔ گویا یہ ناول اصلاح کے ساتھ ساتھ عبرت آموزی کی خدمت بھی انجام دیتا ہے۔

اپنے دوسرے ناول کے بارے میں عزیز احمد لکھتے ہیں:

" 'ہوس' کی ہمت افزائی ہوئی تو لکھنے کا چسکا پڑ گیا اور چند ہی ماہ کے عرصے میں 'مرمر اور خون' لکھی، جسے میں اپنا بدترین ناول سمجھتا ہوں۔۔۔ عام طور پر 'مرمر اور خون' پسند

نہیں کی گئی۔ سب ہی نے اس کی برائی کی۔ اس کی مداح صرف ایک صاحب ہیں جو خود بہت معروف مصنفہ ہیں، مس قرۃ العین حیدر، انھیں میرا یہ ناول میرے اور تمام ناولوں کے مقابل زیادہ پسند ہے، معلوم نہیں کیوں؟

اس ناول یعنی 'مرمر اور خون' کا زندگی سے قطعاً کوئی تعلق نہیں۔ یہ آرٹ اور خصوصاً نشاۃ ثانیہ کی بت تراشی پر بہت سی کتابوں اور ہیولاک ایلس کی نفسیات جنسی کا ابال ہے جس نے ایک قطعاً فرضی ناممکن سے افسانے کی شکل اختیار کی ہے۔"[8]

ریاض احمد چودھری نے اپنے ایم اے اردو کے مقالے میں اس سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عزیز احمد کا بدترین ناول 'ہوس' ہے۔[9]

اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ان کا بدترین ناول 'ہوس' ہے یا 'مرمر اور خون' اس لیے کہ دونوں نہایت کمزور ناول ہیں۔ جب مکتبہ جدید نے ان ناولوں کو دوبارہ سہ بارہ چھاپنا چاہا تو عزیز احمد نے مکتبہ جدید کے مالک چودھری رشید احمد سے اس کی مخالفت کی تھی۔ لکھتے ہیں:

"چودھری صاحب باوجود میرے اصرار اور خوشامد کے 'ہوس' کو تیسری مرتبہ اور 'مرمر اور خون' کو دوسری مرتبہ چھاپنے پر تلے ہوئے ہیں۔ مجھے ان دونوں ناولوں کو اپنا کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔"[10]

فطرت انسانی کے بارے میں مصنف کے رجحان طبع کو سمجھنے کے لیے یہ ناول کافی اہمیت رکھتا ہے۔ جنسی جذبے سے جو دلچسپی اس ناول میں نظر آتی ہے وہ بعد کے تمام ناولوں میں برقرار رہتی ہے۔ ہیولاک ایلس کے اثر سے وہ ساری عمر آزاد نہ ہو سکے۔

رفعت اور عذرا کی نسبت کا اعلان ہو چکا تھا۔ رفعت کو شنگھائی جانے کا حکم ملا۔ روانگی سے قبل کی رات وہ عذرا سے ملنے گیا۔ عذرا انگریزی لباس شب خوابی پہنے اپنے باغ میں ٹہل رہی تھی، چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ ذرا اس وقت کا منظر ملاحظہ کیجیے:

"رفعت نے اسے اپنی گود میں کھینچ لیا۔ وہ اس نیم بیہوشی میں لرز رہی تھی اور اس حدت کو محسوس کر کے جل رہی تھی جو رفعت کے جسم میں ساری تھی۔ رفعت اس کے ڈریسنگ گون کو بالکل اتار چکا تھا۔ صرف ریشم کی ہلکی تہ میں اس کا پورا جسم ملفوف تھا۔ اسے سردی معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے پورے جسم میں حرارت طاری تھی۔ وہ لرز رہی تھی اور پھر

بھی سردی معلوم ہو رہی تھی۔ جیسے کسی آتش کدے کو برف میں ملفوف کر دیا جائے۔

رفعت کے شانوں پر اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ رفعت اس کے لبوں کو رخساروں کو، آنکھوں کو چوم رہا تھا۔ اس کے ہاتھ کبھی اس کے شانوں پر جم جاتے اور ریشم کی تہ کے باوجود معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہوا کی سردی کے جھونکے اس کے جسم میں پیوست ہوئے جاتے ہیں۔ کبھی اس کے ہاتھ اس کے سینے تک پہنچ کر ٹھہر جاتے اور ان کے دباؤ سے وہ پھر وہی بے قابو کر دینے والا جذبہ محسوس کرنے لگتی۔

جذبات کا تلاطم انتہا کو پہنچ گیا۔ رفعت نے عذرا کے جسم سے ریشمی حجاب بالکل دور کر دیا۔ اب وہ اس کی گود میں چاند کی شفاف روشنی میں بالکل عریاں تھی اور اس کے لب کانپ رہے تھے، اس کے جسم کا ریشہ ریشہ کانپ رہا تھا۔ رفعت اسے گود میں لیے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ پھر اس کو زمین پر اتار کے بیچ پر اس کا ڈریسنگ گون بچھا دیا۔ اس ڈریسنگ گون پر عذرا کو پھر لٹا دیا اور اس کے بالوں کو اس کے چہرے کو اس کے سینے کو اس کی انگلیوں کو اس کے پیروں کو چومنا شروع کیا۔''[11]

اس بیان میں جو کمی ہے وہ صرف یہ ہے کہ باتصویر نہیں ہے۔

طلعت کی خادمہ زینت نے ان دونوں کو اس حالت میں دیکھ لیا تھا۔ رفعت کے بھائی طلعت نے بھی زینب کے ساتھ یہی سلوک کیا۔ زینب شاید اسی لیے راضی ہو گئی تھی کہ اس کی بیگم صاحب بھی اس منزل سے گزر چکی تھیں اور جب یہ کام بڑے لوگوں کے لیے باعثِ شرم نہیں ہوتا تو غریبوں کے لیے کیوں ہو؟''

طلعت اور زینب کے واقعے کو بیان کرنے میں مصنف نے یہ تفصیلات نہیں دیں بلکہ کافی پردہ داری برتی ہے۔

مولوی صاحب نے اس قسم کے بیانات کے بارے میں لکھا تھا:

''نفسیاتی اور خاص کر جذباتی کیفیتوں کو بعض موقعوں پر بڑی خوبی اور دلکشی سے بیان کیا ہے جس میں استادانہ کمال نظر آتا ہے۔''[12]

ظاہر ہے کہ مولوی صاحب یہاں صرف ہمت افزائی فرما رہے ہیں۔ یہ بیانات کسی طرح بھی قابل تعریف نہیں ہو سکتے۔ میں گذشتہ صفحات میں لکھ چکا ہوں کہ اگر کسی کردار کی خصوصیات کو اجاگر

کرنے کے لیے 'معاشرت' کا تذکرہ ناگزیر ہو تو اس کا ذکر ضرور کیا جائے مگر مزے لے لے کر اس کی تفصیلات بیان کرنا درست نہیں۔ تفصیلات کے بعد اس کا دائرہ ادب سے خارج ہو جاتا ہے۔ اگر کسی کو تفصیلات ہی عزیز ہیں تو وہ جنسیات پر کتاب لکھے۔ خود عزیز احمد نے عصمت چغتائی کی عریاں نگاری کی کافی مذمت کی ہے حالانکہ عصمت کی عریاں سے عریاں مثال بھی اس سے بہت پیچھے رہ جاتی ہے۔

مصنف کا تیسرا ناول 'گریز' ہے جس پر انھوں نے کافی توجہ صرف کی ہے۔ یہ تکمیلی صورت کو کئی سال میں پہنچا ہے۔ اس کے متعلق عزیز احمد لکھتے ہیں:

''یہ پہلا ناول ہے جس کو اپنا کہتے ہوئے مجھے شرم نہیں آتی۔ کئی لحاظ سے اس کو اپنا سب سے کامیاب ناول سمجھتا ہوں۔ اس پر عام اعتراض جو کیا جاتا ہے، یعنی عریانی کا، وہ خالص مشرقی ہے۔۔۔ مجھے حیرت ہے کہ پڑھنے والوں کی نظر صرف عریانی پر کیوں پڑتی ہے اور یورپ کے جدید ادب کا کون سا بڑا ناول ہے جس میں عریانی نہیں ہے۔

بہت سے نقادوں نے فوراً میرا سلسلہ ڈی ایچ لارنس سے ملا دیا۔ میں نے لارنس کی سب کہانیاں پڑھی ہیں مگر 'لیڈی چیٹرلی کے عاشق' کے سوا اس کا کوئی ناول، اتفاق سے نہیں پڑھا۔ جس زمانے میں میں پڑھ رہا تھا ڈی ایچ لارنس کا فیشن ختم ہو چکا تھا۔''[13]

نقاد ڈی ایچ لارنس سے ان کا رشتہ ملانے میں حق بجانب ہیں۔ انھوں نے لارنس کا جو ناول پڑھا ہے اس کا اثر 'مرمر اور خون' کی محولہ بالا مثال میں صاف نظر آتا ہے۔ معاشرت کی اس میں جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں وہ اسی قبیل کی ہیں جو کہ لیڈی چیٹرلی اور باغبان کی معاشرت کے سلسلے میں درج کی گئی ہیں۔

عزیز احمد نے اپنے دونوں ابتدائی ناولوں کی چوں کہ خود مذمت کر دی ہے اور انھیں زمانہ جاہلیت کی پیداوار بتایا ہے اس لیے آئندہ سطور میں ان کے فن سے بحث کرتے وقت صرف ان کے بقیہ ناولوں کو پیش نظر رکھا جائے گا۔

'گریز' کی کافی تعریف کی گئی ہے۔ ترقی پسندوں نے اسے اپنی تحریک کا بہترین ناول تسلیم کیا ہے۔ اس سلسلے کی ایک کڑی کنہیالال کپور کی رائے ہے جو اس کتاب کے فلیپ (Flap) پر درج ہے۔

اس کتاب کو ناپسند کرنے والوں نے سخت ترین اعتراض اس کی عریانی پر کیا ہے۔

ڈاکٹر احسن فاروقی ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ:

''گریز میں عریاں نگاری پر تل گئے ہیں اور یورپ کے عظیم قحبہ خانے کا نقشہ اس لذت کے ساتھ کھینچا ہے کہ جنسیاتی زندگی میں بے راہ روی بہت بڑا وصف نظر آتا ہے اور ان کا نمائندہ یعنی ان کا ہیرو نعیم ہر جگہ بندر کی اولاد دکھائی دیتا ہے۔''[14]

علی عباس حسینی نے 'گریز' کے بارے میں لکھا تھا کہ وہ جدید بھی ہے اور لذیذ بھی۔

کشن پرشاد کول نے اس عبارت کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ:

''اس میں وہی لذت ہے جو ہمیں رنڈیوں کے کوٹھوں، کسبیوں کے چکلوں، شراب خانوں اور تاڑی خانوں میں یا نام نہاد شریف گنڈوں کے ٹھیکوں اور اڈوں میں۔ یہاں لندن اور پیرس کے قہوہ خانوں، ڈانسنگ ہال اور نائٹ کلبز میں ملتی ہے۔''

سہیل بخاری نے ذرا نرم لہجہ اختیار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''عزیز احمد کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ جنسی حقائق بڑی تفصیل اور بے باکی سے بیان کرتے ہیں اور اس میں کبھی کبھی وہ حد اعتدال سے بڑھ بھی جاتے ہیں۔ ان کے ہیرو کی نظر سے عورت کے سینے پر ضرور پڑتی ہے۔''[15]

برتھا کو بھی اسی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ لکھتے ہیں:

''ایک گلاس اس نے برتھا کو دیا، برتھا کو پھر اپنی گود میں کھینچ کر بٹھایا، برتھا کے پستان بڑے بڑے تھے اور نرم نہیں تھے۔

برتھا نیم دراز حالت میں اس کی گود میں بیٹھی ہوئی تھی اور اس کا سنہرے بالوں سے بھرا ہوا جسم نعیم کے شانے کا سہارا لیے ہوئے بڑا خوبصورت معلوم ہوتا تھا۔ نعیم نے اس کا بوسہ لینا چاہا تو اس نے اپنے لب اوپر اٹھائے، نعیم نے اسی حالت میں اسے اور اچھی طرح اپنی آغوش کی گرفت میں لے لے اور اس کے سینے پر پنجہ گاڑ کے اس کا بوسہ لیا۔ نعیم کے دانت اس کے دانت سے ٹکرائے اور وہ نعیم کی زبان کو چوسنے لگی۔ پل اوور کے نیچے وہ زیر جامہ پہنے تھی۔

بیدردی سے گویا میری کا انتقام لینے کے لیے نعیم نے اپنے دانتوں سے اس کے

ہونٹوں کو کاٹا لیکن برتھا اس کو انتقام کہاں سمجھ رہی تھی۔ اس کے نزدیک تو یہ استوائی جوش محبت تھا۔''[16]

یہ بیان ترکیب استعمال کا حق بھی ادا کر دیتا ہے۔ پھر انتقام لینے کا بھی مصنف نے کیا نیا طریقہ تراشا ہے۔

تاج پوشی کے زمانے میں لندن میں جگہ نہ ملنے کی بنا پر نعیم کے عزیز دوست مسٹر کراکسلے کی بہن مارگریٹ نعیم کے کمرے میں رات گزارتی ہے۔ ان دونوں کے تعلقات مصنف کی زبان سے سنیے:

''جب نعیم کراکسلے کے یہاں مہمان ہوتا تو مارگریٹ زیادہ تر وقت ان دونوں کے ساتھ گزارتی۔ اب جو ماں نے اسے ہر ہر قدم پر روکنا ٹوکنا چھوڑ دیا تھا۔ چوں کہ نعیم کے کوئی بھائی بہن نہ تھے۔ اس لیے یہ خواہرانہ اُنس اس کے لیے ایک نئی چیز تھی اور وہ بھی مارگریٹ کے لیے ایک طرح کا برادرانہ خلوص اور شفقت محسوس کرنے لگا۔

مارگریٹ خود نعیم کو ترغیب دلاتی ہے۔ نعیم اس سے کہتا ہے کہ ''تم میرے دوست کی بہن ہو تمھارا جسم میرے لیے مقدس ہے۔''[17]

مارگریٹ خواہش ظاہر کرتی ہے کہ نعیم اسے شب بخیر کہنے کا بوسہ دے:

''نعیم نے اس کی پیشانی کو چومنا چاہا مگر سرکشی کر کے اس کے لب نعیم کے اور سامنے آ گئے۔ سرخ نوجوان لب، نعیم کی سراسیمگی پر مارگریٹ کی نوجوان آنکھیں شوخی سے مسکرانے لگیں اور اس کے لب نعیم کے اور قریب آ گئے اس قدر قریب کہ ایک لحظہ کے اندر دونوں کے لب ایک طلسمی قوت سے ایک دوسرے کے لبوں سے پیوست ہو گئے۔ لحظہ بھر کے بعد نعیم نے محسوس کیا کہ مارگریٹ اس کی آغوش میں ہے۔ اس کے سینے کے مقابل مارگریٹ کا جواں سال سینہ تھا اور مارگریٹ کی گرم گرم سانس اس نے اپنے چہرے پر محسوس کی۔''[18]

نعیم نے دفعتاً اپنے آپ کو چھڑا لیا۔ مارگریٹ بے تاب ہو رہی تھی۔ نعیم کہتا ہے 'تم خفا کیوں ہوتی ہو، مگر مارگریٹ تم کو کہیں نقصان نہ پہنچ جائے، ابھی تم بہت کم سن ہو۔'' اس میں کس قدر عریاں پہلو جھلکتا ہے۔

دونوں الگ الگ پلنگ پر سوئے مگر نعیم کے جسم میں ناقابل برداشت جنسی ہیجان برپا ہوا اور وہ مارگریٹ کے پلنگ پر چلا گیا۔ 'نعیم بلانکٹ کے اندر آ گیا۔ بیتابی سے اس نے مارگریٹ کا بوسہ لیا۔ اس نے اپنے جسم کو مارگریٹ کے جسم سے لپٹتے محسوس کیا۔ مارگریٹ کا پستان چھوٹی چھوٹی اور فولاد کی سی سخت

ناشپاتیوں کے سے تھے۔ اس کا ہاتھ ادھر ادھر پھرتا رہا اور تھوڑی دیر کے بعد اس نے اپنے جسم پر بھی مارگریٹ کی انگلیوں اور لانبے نوکدار ناخنوں کی سرسراہٹ محسوس کی۔'' نعیم اپنے اوپر اس قدر قابو برقرار رکھتا ہے کہ مارگریٹ کا کنوارپن ختم نہیں ہوتا۔ اسے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ وہ امتحان میں کامیاب ثابت ہوا۔ یہ ہے نعیم کا سلوک اس لڑکی کے ساتھ جس کے لیے اپنے دل میں وہ برادرانہ خلوص اور شفقت محسوس کرتا تھا اور جس کا جسم اس کے نزدیک مقدس تھا۔ اظہار تقدیس کا یہ انداز کس قدر لطیف ہے۔

لذت اندوزی اور لذت انگیزی کا یہ انداز بعد کے ناولوں میں بہت کم ہوتا ہے۔ مثلاً 'آگ' میں سکندر جو اور فلپی کی مباشرت کے بیان میں کافی پردہ داری برتی گئی ہے۔ لکھتے ہیں:

''سکندر جو اس کے پیچھے کھانے کے کمرے میں پہنچا اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کے کہا ''فلپی ڈرائنگ امیں چائے تو ابھی پی چکا ہوں۔ مجھے چائے نہیں چاہیے اور اس کا ہاتھ جو فلپی کی کمر میں حائل تھا فلپی کو اور آگے لے گیا۔ ڈریسنگ روم کے آگے اور اس کے بعد نیلے پردوں نے شیشے کی کھڑکیوں کی آنکھیں بند کر دیں۔''[19]

بدنما عریاں اشارہ اس ناول میں ایک ہی جگہ نظر آتا ہے۔ رجاپان بائی کی بیوی زون 'خواجہ غضنفر بخو' کے ساتھ رات گزار کر علی الصبح اپنے گھر آئی اور دو اشخاص نے اسے آتے ہوئے دیکھ لیا۔ اس کے بعد جب وہ دریا پر ہاتھ منھ دھو رہی تھی ان دونوں نے فقرہ چست کیا۔''[20] زون تو منھ کیا دھو رہی ہے اپنے جسم کا کوئی اور حصہ دھو۔''

انتظار حسین نے عزیز احمد کے ناول 'شبنم' کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا:

''عزیز احمد صاحب ان کرداروں میں بوس و کنار سے پھونک بھرتے ہیں۔ چنانچہ یہ کردار ہر چار قدم کے بعد پاؤں توڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ مصنف انھیں آٹھ دس بوسے دلواتا ہے تب کہیں جا کر ان میں گرمی آتی ہے مگر تھوڑی دور چل کر وہ ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں پھر مصنف انھیں ہم بستری کی رشوت دیتا ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ 'گریز' کے ہیرو کو بوس و کنار اور ہم بستری کی مسلسل رشوت نہ دی جاتی تو وہ پونے چار سو صفحات کی کٹھن مسافت ہرگز طے نہ کر پاتا۔ جہاں یہ رشوت کرداروں کو نہیں ملتی وہ بستر بوریا باندھ گول ہو جاتے ہیں۔ 'ایسی بلندی ایسی پستی' میں بھی یہی حادثہ گزر رہا ہے۔''[21]

انتظار حسین کا لہجہ معاندانہ ضرور ہے مگر یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ عزیز احمد کے کرداروں کی

اہم ترین خصوصیت ان کا جنسی میلان ہے۔ ان کا یہ رجحان طبع فرائڈ سے یقیناً متاثر ہے۔ جنسی جذبے کی اہمیت سے کسے انکار ہو سکتا ہے مگر دنیا میں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ عزیز احمد کے بیشتر مرد چاہے وہ کسی بھی عمر کے کیوں نہ ہوں عورتوں کے پیچھے بھاگتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کی عورتوں سے دلچسپی مرض کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔ جس ہیرو پر انھوں نے سب سے زیادہ توجہ صرف کی ہے وہ 'گریز' کا ہیرو نعیم ہے جس کے بارے میں کنہیا لال کپور لکھتے ہیں:

''گریز' کا ہیرو مستقبل کا انسان ہے، جس کی آنکھیں نہ مغرب کو دیکھتی ہیں نہ مشرق کو بلکہ اس نئے افق پر مرکوز ہیں، جہاں صبح کاذب کے دھندلکوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔

فلیپ (Flap) کی اسی عبارت میں کنہیا لال کپور کا یہ جملہ بھی ملتا ہے 'تکنیک، پلاٹ اور کردار سازی کے اعتبار سے بہت کم جدید اردو ناول 'گریز' سے ٹکر لیتے ہیں۔''

جہاں تک کردار نگاری کی صلاحیت کا تعلق ہے اس کا ثبوت ہمیں ان کے ابتدائی ناولوں سے ہی ملنے لگتا ہے۔ بلاشبہ انھوں نے یوروپ کے تمام اچھے ناولوں اور ناول کے فن پر لکھی ہوئی کتابوں کا مطالعہ کیا ہوگا۔ انھیں ناول کی تکنیک پر بھی عبور نظر آتا ہے۔ ناول نگاری کا جس قدر اعلیٰ شعور ان کے یہاں نظر آتا ہے، اردو کے تمام ناول نگاروں میں اس کی مثال اور کہیں نہیں ملتی۔ ان کے ناولوں کو پڑھنے کے بعد ہم ڈاکٹر احسن فاروقی کی اس رائے سے اتفاق نہیں کر سکتے:

''انگریزی ناول سے واقفیت کی اعلیٰ سندیں ہی ان کے گلے میں لٹک رہی ہیں۔ سند لینے کے لیے انھوں نے اعلیٰ شہ پارے ضرور پڑھے ہوں گے مگر ان کے فن تک پہنچنے کے وہ اہل نہیں تھے، ان سے انھوں نے ویسا ہی اثر لیا جیسا کہ کوئی نادان اور بے وقوف شخص لے گا۔''[22]

ڈاکٹر صاحب کے اس مضمون کا عنوان ہے 'سب سے بڑا ناول نگار' — ساقی میں ۱۹۵۲ء کے دوران عزیز احمد کے خلاف متعدد مضامین شائع ہوئے، ڈاکٹر فاروقی اور انتظار حسین کے مضامین اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ انتظار حسین نے دسمبر ۱۹۴۹ء کے 'ساقی' میں 'ایسی بلندی ایسی پستی' پر جو مضمون لکھا تھا اس کا انداز اس سے مختلف ہے۔ انھوں نے زندگی کی پیش کش کی تعریف کی تھی اور کرداروں کے متعلق لکھا تھا:

''نور جہاں اور سلطان حسین کے کردار دوسرے کرداروں سے واضح طور پر ابھرے

ہوئے ہیں۔ نورجہاں کے کردار کی تعمیر میں عزیز احمد نے بہت سلیقے سے کام لیا
ہے۔''[۲۳]

'شبنم' پر ایک اور صاحب نے 'ع' کے نام سے ساقی میں تبصرہ کیا ہے۔ انھوں نے عیب جوئی بڑے فن کارانہ انداز سے کی ہے۔ مثلاً 'تکنیک کے لحاظ سے شبنم یقیناً اچھا خاصہ ناول ہے۔ ذہنی عیاشی کی راحت بخش چیز ہے۔''

آگے چل کر لکھتے ہیں:

''کردار نگاری اکثر کامیاب ہے خصوصاً ارشد علی خاں اس ناول کے ہیرو مانے جاتے ہیں۔ ان کے کردار کا یہ پہلو کہ وہ نہایت شکی مزاج، وہمی اور انتہا درجے کے جذباتی عاشق واقع ہوئے ہیں، ہر جگہ نمایاں ہے اور شروع سے آخر تک مصنف کے بے باک قلم نے ارشد کی اس کیفیت کو خوبی سے پائیدار بنا دیا ہے لیکن بعض جگہ کردار نگاری پایہ ثبوت سے گریزاں نظر آتی ہے۔''[۲۴]

مذمت کے اس انداز کو قواعد کی اصطلاح میں 'تاکید الذم بما یشبہ المدح' کے نام سے پکارتے ہیں۔

عزیز احمد کردار نگاری پر اس قدر توجہ صرف کرتے ہیں کہ ان کے بیشتر ناول کرداری ناول نظر آتے ہیں۔ علی عباس حسینی نے بھی یہ تسلیم کیا ہے کہ 'گریز' کی کامیابی نعیم کے کردار کی سچی نقشہ کشی میں ہے۔ جلال الدین احمد 'ایسی بلندی ایسی پستی' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جہاں تک کردار نگاری کا تعلق ہے، عزیز احمد ایک پختہ فن کار ہیں۔۔۔۔ ان کی اپنے کرداروں پر بے مثل گرفت ہے جس نے ایک محدود طبقاتی ناول کو بلا کی ہمہ گیری بخش دی ہے۔''[۲۵]

عزیز احمد نے اپنے اہم کرداروں کی فطرت کو بظاہر بڑی تفصیل و تشریح کے ساتھ پیش کیا ہے۔ انھوں نے نعیم، سلطان حسین، نورجہاں، شبنم اور 'خواجہ سکندر بخت' کے کرداروں کو صرف خارجی طور پر ہی نہیں بلکہ داخلی طور پر بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے ان کرداروں کی فطرت کا تجزیہ کیا ہے اور ان عناصر کی نشان دہی کی ہے جو ان کی شخصیت کی تشکیل میں مدد دیتے ہیں مگر خرابی اس بات سے پیدا ہوتی ہے کہ وہ انسان کو فرائڈ کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کا نعیم آئی سی ایس میں منتخب ہو کر مزید تعلیم کے لیے یورپ جاتا ہے۔ اسے ہندوستان میں آکر نہایت اعلیٰ افسر کی حیثیت سے خدمات انجام دینی

تھیں۔ اسے پورے ضلعے کا حاکم بننا تھا۔ اس زمانے میں آئی سی ایس میں منتخب ہونا بہت بڑی بات تھی۔ اس میں ایسے لوگ ہی منتخب ہوتے تھے جو غیر معمولی طور پر ذہین ہوتے تھے۔ ایسے ذہین انسان سے ہم یہ توقع کر سکتے تھے کہ وہ یورپ کی معاشرتی، تعلیمی اور سیاسی صورت حال کا بغور مطالعہ کرتا مگر وہ بھانت بھانت کی عورتوں کو آزماتا پھرتا ہے۔ 'آگ' کے 'خواجہ سکندر بخت' کی طرح وہ بھی سفید فام عورت کا عاشق ہے۔ نوجوان لڑکی نظر آتے ہی وہ کوشش کرتا ہے اس کے ساتھ شب باش ہو۔ اسے اشتراکیت سے تھوڑی بہت دلچسپی تھی۔ ایک دن وہ فرانس کے مشہور اشتراکی لیڈر موسیو تھورے کی تقریر سننے گیا۔ اس کے بائیں ہاتھ پر ہر دوشا بیٹھا تھا مگر اس کی نظر اپنی دائیں طرف جا رہی تھی جہاں:

''اس کی دائیں ٹانگ سے چوبیس پچیس سال کی ایک گداز جسم کی عورت کی ٹانگ برابر مس کر رہی تھی۔''[۲۶]

وہ جس عورت پر بھی کچھ خرچ کرتا ہے اس کی قیمت وصول کرنے کی فکر میں رہتا ہے۔ ایک دن وہ پیرس میں ایک پناہ گزین یہودن کو سینما دکھانے لے گیا، اس کا ٹکٹ بھی نعیم نے ہی لیا تھا۔[27] سینما میں نعیم نے دست درازی کی تو وہ اسے ٹکٹ کی قیمت سمجھ کر خاموش رہی۔''

وہ جرمنی کی سیر کے لیے جاتا ہے تو وہاں بھی اسی فکر میں رہتا ہے۔

میونک کے اسٹیشن پر اسے لینے کے لیے ہلڈا آئی۔ بعد میں اس کی بہن فریڈا اسے سیر کرانے لے گئی۔ ایلس کی جدائی کا غم منانے کے لیے وہ فریڈا کے بوسے لیتا ہے اس وقت بارش ہو رہی تھی۔ وہ برساتی کے اندر اس کی چھاتیوں پر ہاتھ ڈالتا ہے اور خوب بوسے لیتا ہے۔''[۲۸]

اشتٹ گارٹ میں اسے ڈوروتھیا نے چائے پر بلایا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ فریڈا کی طرح ڈوروتھیا سے بھی چھیڑ چھاڑ کرے مگر اس نے اپنے مصور دوست کو بھی بلایا تھا۔ اس لیے نعیم کی یہ تمنا پوری نہ ہو سکی۔

عورتوں کے بارے میں اس کا تجربہ یہ تھا کہ:

''ہر نئے مکتب میں پہلا دن بڑا قیمتی ہوجاتا ہے۔''[۲۹]

ایلس کو اس نے اسی طرح گانٹھ لیا تھا۔ ایک دن وہ ایلس کے ساتھ خوب ناچا۔ واپسی میں ٹیکسی میں خوب بوس و کنار ہوا۔ وہ اسے اپنے کمرے میں لے جانا چاہتا تھا مگر وہ راضی نہ ہوئی۔ چنانچہ اسے اس کے بورڈنگ ہاؤس پر پہنچانا پڑا۔ نعیم کمرے پر جا کر سوچتا ہے:

''اگر ایلس آجاتی تو اس کا کیا بگڑ جاتا؟ بجز آخری بات کے وہ اس کے ساتھ اور سب

تو کر ہی چکا تھا۔ اس بوس و کنار کی بنا پر جنسی ہیجان اس پر اس قدر غالب آ جاتا ہے کہ اسے
اس آخری بات کے لیے اسفائکس جانا پڑتا ہے۔"[30]

"کیونکہ پیرس کے قحبہ خانوں میں صرف اس کے متعلق اس کا خیال تھا کہ یہاں بیماریوں کا
زیادہ اندیشہ نہیں اور یہاں کی چند لڑکیاں اسے پسند تھیں۔"[31]

شاید اپنے ہم وطن بھائیوں کی بہتری کے لیے نعیم نے اس محفوظ قحبہ خانے کا نام بھی بتا دیا ہے۔
ممکن ہے مستفید ہونے والوں نے اسے دعائیں بھی دی ہوں۔

نعیم ایلس سے بوس و کنارا کثر کرتا رہتا تھا۔

منگنی ہو جانے کے بعد "اس مرتبہ اس کے ہاتھوں نے ایلس کے سخت سخت سینے کو چھوا تو اس کے ہاتھ، اس کی تحقیر ہی نہیں کر رہے تھے، ان کا لمس انھیں پیار کر رہا تھا۔" لمس کے اس نئے تجربے سے آشنا ہونے کے بعد نعیم کو یہ فکر ہوئی کہ معلوم نہیں ایلس کنواری بھی ہے یا نہیں یا صرف اسے بے وقوف بنا رہی ہے۔"

"کہیں اس کا حال مسز چند کا سا تو نہیں ہوگا۔ اس کے دوست شجاعت نے بھی اسے یہی مشورہ دیا کہ وہ اس کے کنوارپن کی آزمائش کرے۔ چنانچہ ایک دن اس نے بڑی مہارت کے ساتھ اس کے لیے زمین ہموار کی۔ پہلے وہ اسے ایسے نائٹ کلب میں لے گیا جہاں تقریباً بالکل برہنہ لڑکیاں ناچ رہی تھی اور ایک شخص شہوت انگیز گیت گا رہا تھا۔ واپسی کے وقت دو بج چکے تھے۔ ایلس کے جذبات میں کافی ہیجان پیدا ہو چکا تھا۔ وہ اسے اپنے کمرے پر لایا۔ ایلس نے واپس جانا چاہا۔ نعیم نے پیش کش کی کہ ایلس اس کے پلنگ پر سو جائے وہ فرش پر سو جائے گا۔"[32] یہ وہ نسخہ تھا جسے یوروپ بھر میں لاکھوں بار دہرایا جا چکا ہے اور جو ہزاروں بار کامیاب ہو چکا تھا۔ اس فن کاری اور مہارت کی بدولت وہ ایلس کے کنوارپن کی آزمائش میں کامیاب ہو گیا۔ حالانکہ ایلس یہ کہتی رہی "[33] پیارے شادی سے پہلے نہیں۔ میں تمھاری خوشامد کرتی ہوں۔ ابھی نہیں، شادی سے پہلے نہیں۔"[34]

بلقیس کے بعد اس کے ذہن پر سب سے زیادہ اثر ایلس ہی کا رہا مگر یہاں بھی ہمیں عشق نظر نہیں

آتا۔ دراصل نعیم میں عشق کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ وہ تو میری پاول کی طرح محبت کو محض ایک 'حیاتی اور حیوانی' چیز سمجھتا ہے۔

ایلس سے اسے کس قدر وابستگی تھی مگر اس کے امریکہ چلے جانے اور اس کی یاد سرد پڑ جانے کے بعد وہ سوچتا ہے کہ "ایلس کے ساتھ اس کا معاشقہ گویا کلاسیکی طرز کا ایک ڈراما تھا۔ وحدتِ مکان، وحدتِ زمان، وحدتِ عمل سب کچھ اس ڈرامے میں تھا۔ اس کی روئداد مکمل تھی۔ ایک ہی سال کے اندر آغاز وارتقا اور انجام۔"[35]

ہندوستان آنے کے بعد جب وہ ڈپٹی کمشنر بن جاتا ہے تو وہ جذباتی اضطراب اور کاوش جو یورپ میں تھی وہ یہاں مفقود تھی۔ اس نوکری میں جنس بھی ایک خوراک کی سی چیز تھی پیسے سے اچھی اچھی دیہاتی لڑکیاں آ جاتیں تیرہ چودہ سال کی کچھ میمیں کلکتہ یا دارجلنگ میں مل جاتیں۔"[36]

میری پاول جنس کے بارے میں آزاد خیال تھی مگر اس کی سیاسی خدمات کی بنا پر لوگ اس کی عزت کرتے تھے مگر نعیم صرف اس کا جسم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ میری اور کرا کسلے کی دوستی کے طفیل انگلستان کے نوجوان ادیبوں سے بھی اس کی دوستی ہونے لگی تھی۔ وہ اشتراکیت کی طرف قدم بھی بڑھانے لگا تھا مگر ان تمام باتوں کا اس کی زندگی میں کوئی اثر نظر نہیں آتا تھا۔ اس کی زندگی تو بوسے لینے اور سینے ٹٹولنے سے تعلق رکھتی ہے۔

ڈاکٹر احسن فاروقی نے اسی لیے اسے "بندر کی اولاد"[37] کہہ کر پکارا ہے۔ ارسطو نے انسان کی جو تعریف کی ہے نعیم پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اس کے بجائے وہ 'جنسی حیوان' نظر آتا ہے۔

یہ جنس زدگی نعیم میں یورپ میں جا کر پیدا نہیں ہوئی بلکہ یورپ جانے سے پہلے بھی یہ جذبہ اس میں بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ وہ جب بلقیس کے گھر جایا کرتا تھا راستے میں اسے ایسی عیسائی لڑکیاں نظر آتی تھیں جو کبھی گہرے نیلے رنگ یا گہرے آسمانی رنگ کی فراکیں پہن کے نکلتی تھیں۔ نعیم ان کی طرف بڑی حسرت کی نظروں سے دیکھا کرتا تھا۔[38]

ایک دن سہ پہر کے وقت بلقیس سو گئی تھی۔ خانم دالان میں تخت ہی پر لیٹے لیٹے اونگھ رہی تھیں اور بے خیالی میں ان کے پیر گھٹنوں تک کھلے ہوئے تھے۔ نعیم ایک آرام کرسی پر لیٹا ہوا پڑھ رہا تھا۔ اس کی نظر خانم کے پیروں پر پڑی پھر خانم کے چہرے پر جو نیند میں اور بھی بھلا معلوم ہو رہا تھا اور اس کے ذہن

میں برنارڈ شا کے ان ڈراموں کا خیال آیا جن میں کم عمر نوجوان تیس سالہ عورتوں کے عشق میں مبتلا ہوتے ہیں۔"[39]

گرمیوں میں دن کے وقت نعیم اپنی آرام کرسی پر لیٹ جاتا تھا۔ اس کا تصور مصروف عمل ہو جاتا۔
وہ عشرت منزل پہنچ جاتا جہاں "بہت سی تصویریں تھیں۔ بہت سے مجسمے تھے اور بہت سی جان دار چلتی پھرتی عورتیں تھیں۔۔۔ عشرت منزل کے ساتھ عموماً کوئی نہ کوئی کہانی وابستہ ہوتی۔ عشرت منزل ایک محل سرا تھی، جس کی ہر رہنے والی اور نعیم میں ایک معاشقہ ہو چکا تھا اور معاشقہ بھی وہ جو داستان کی شکل رکھتا تھا۔"[40]

ایک دن نعیم بیٹھا ہوا تھا۔ اتفاق سے بلقیس کی قمیص کا ایک بٹن کھل گیا اس پر نعیم کی یہ حالت ہوئی
"گردن کے نیچے سینے کی ذرا سی جھلک نظر آئی۔ معلوم ہوتا تھا بدن کا سارا خون کھنچ کر میرے سر میں پہنچ گیا۔"[41]

یورپ جانے سے پہلے نعیم جو نیت کرتا ہے وہ بھی اسی قسم کی ہے:
"میں سوچتا ہوں کہ یورپ جا کر حسین سے حسین لڑکیوں سے ملوں گا۔"[42]
اس قسم کے کردار کو جنسی مریض کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ اس کے اعصاب پر ہر وقت عورت سوار رہتی ہے۔

پنڈت کشن پرشاد کول نے عزیز احمد کو بڑا دلچسپ مشورہ دیا ہے کہ انھیں چاہیے تو یہ تھا کہ وہ اپنے ہیرو کو کسی نفسیاتی معالج کے مطب میں لے جا کر "صحت مند نشاط کا عادی بنواتے لیکن انھوں نے غضب یہ کیا ہے کہ اس کو ننگا ناچا کر کے ہمارے سامنے لا کھڑا کیا ہے اور ہم سے توقع کی جاتی ہے کہ ہم اس کو مریض نہیں بلکہ ہیرو قرار دیں۔"[43]
نعیم کی عیاشیوں کا تذکرہ پڑھنے کے بعد جب ہم اس کی مالی حالت پر نظر ڈالتے ہیں تو اس کے یہ اخراجات خلاف قیاس نظر آتے ہیں۔ حکومت کا وظیفہ ان اخراجات کی کفالت نہیں کر سکتا تھا۔ ہندوستان میں اس کا کوئی قریبی عزیز ایسا نہیں تھا جس سے اسے کچھ امداد مل سکتی۔ انگلستان روانہ ہونے سے پہلے اسے نہایت خستہ حال ظاہر کیا گیا ہے۔ نعیم سے ہمارا تعارف اس طرح ہوتا ہے:
"اس نے کپڑے بدلنے کا ارادہ کیا۔ دالان کے اندر ایک چھوٹی سی کوٹھری میں اس کے کپڑوں اور کتابوں کے صندوق تھے۔ اس نے سب قمیصوں کا جائزہ لیا کوئی ٹھیک

حالت میں نہ تھی۔ کسی کے کف پھٹ گئے تھے۔ کوئی کالر کے قریب کسی قدر پھٹی ہوئی تھی۔ غرض ان میں ایک قمیص کسی قدر بہتر حالت میں تھی وہ نکالی۔ اسی طرح ایک پاجامہ اور شیروانی انتخاب کی۔"[44]
اس کے بعد وہ بازار سے ایک آنے والی چائے منگواتا ہے جس پر نصف انچ موٹی بالائی کی تہ ہوتی ہے۔ چائے کی پیالی کے ساتھ ٹین کا ایک میلا سا چمچہ بھی آتا ہے جو نعیم کو چائے سے بھی زیادہ ناگوار تھا۔ اس کے دالان کی حالت یہ تھی:
"اس نے دالان کی سرخ مٹی کو دیکھا جس پر کسی قسم کا فرش نہیں تھا اور اس سے گرد اڑ اڑ کر بہت مدت تک اس کے اس پلنگ پر اور بچھونے پر پڑتی رہی تھی۔"[45]
وہ خدا سے دعا کرتا ہے کہ یا تو اسے اس دالان سے کہیں باہر رہنا نصیب ہو یا اس دالان کو فرش نصیب ہو جائے۔
یورپ جاتے ہی اسے معلوم نہیں کہاں سے اتنی دولت مل جاتی ہے کہ وہ روزانہ کسی نہ کسی لڑکی کو اچھے ریسٹورنٹ میں چائے پلاتا ہے، گاہے بگاہے سنیما بھی دکھاتا ہے۔ ناچ گھروں میں بھی لے جاتا ہے۔ ٹیکسیوں میں انھیں چھوڑنے جاتا ہے۔ پیرس میں وہ ایک معیاری ریسٹورنٹ میں چائے پیتا ہے۔ اس کے علاوہ یولی سیز کی طرح سفر کے پرچم بھی کھولتا رہتا ہے۔ مصنف ہمیں کچھ نہیں بتاتا کہ یہ پیسہ کہاں سے آتا ہے، اس مالی حالت کو مدنظر رکھنے کے بعد عزیز احمد کا نیچرل ازم کا دعویٰ زمین پر آ رہتا ہے۔
'آگ' کے خواجہ سکندر جو بھی نعیم کا مثنیٰ نظر آتے ہیں۔ وہ ملک التجار خواجہ غضنفر کے لڑکے ہیں۔ اس مالی حالت کی بنا پر عیاشی انھیں زیب دیتی ہے۔ خواجہ غضنفر جو کے زون کے علاوہ اور سے بھی تعلقات رہ چکے ہیں مگر سکندر جو اس معاملے اپنے باپ سے بہت بڑھ جاتے ہیں۔ وہ ابتدا زون کی لڑکی سے کرتے ہیں جو زون سے بھی زیادہ خوبصورت ہے مگر وہ انھیں اس قدر نچواتی ہے کہ ان میں اپنی جنسی قوت کے بارے میں احساسِ کمتری سا پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ ان کے بارے میں کہتی ہے:
"اس زنخے نامرد مونچھ منڈے لڑکے میں عاشقی کی ہمت بھی ہے۔"[46]
اس زمانے میں ایک میم صاحب 'خواجہ غضنفر جو' کی دکان پر سامان خریدنے آئی۔ وہ 'سکندر جو' پر عاشق ہو گئی۔ دونوں میں بوسہ بازی ہوئی۔ اس میم نے سکندر جو میں خود اعتمادی پیدا کر دی۔ اس کے بعد وہ آخر کار زون کی لڑکی فضلی کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ وہ دیسی لڑکیوں سے بھی دل

بہلاتے رہتے ہیں مگر بعد میں انھیں زیادہ دلچسپی سفید عورت سے ہوجاتی ہے۔ وہ میجر صاحب سے فخریہ کہتے ہیں:

> ''میجر صاحب! لڑکی چھوکری وغیرہ کا تو ہم کو بہت شوق ہے۔ یہ تو ہمارا ہابی ہے اور سفید عورت۔ اُف فوامارڈالا ظالم۔ سفید عورت پر تو ہم مرتا ہے۔''[47]

سفید عورت کو ترجیح دینے کے سلسلے میں بھی 'سکندر جو' میں نعیم کی جھلک نظر آتی ہے۔ 'سکندر جو' میں قومی شعور اس صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے کہ وہ سفید عورتوں سے مباشرت اس لیے کرتے ہیں کہ اس طرح اس قوم سے انتقام لیتے ہیں۔''[48]

مسز اشلے، فیمی لائیڈ، جنجر، نی تی واسلوف وغیرہ کئی سفید عورتوں سے اس کے تعلقات رہتے ہیں۔ زیادہ راہ و رسم ان کی فیمی لائیڈ اور جنجر سے تھی۔

وہ آتش دان کے پاس سیدھے ہاتھ سے فیمی لائیڈ کو اور بائیں ہاتھ سے جنجر کو لپٹائے گیارہ بجے رات تک وہیں بیٹھا رہتا۔ اس حالت تک تو یہ اپنی یکجائی برداشت کر لیتی تھیں مگر ایک دن 'سکندر جو' نے انتہا کر دی۔ جس طرح 'سکندر جو' آتشدان کے پاس سیدھے ہاتھ سے فیمی لائیڈ کو اور بائیں سے جنجر کو لپٹائے بیٹھا رہتا۔ اس نے چاہا کہ بستر پر بھی دونوں ایک ساتھ۔۔۔۔ 'سکندر جو' کے اس ارادے کی بنا پر جنجر کو اس سے اور فیمی سے اس قدر نفرت ہوئی کہ اس کے اگلے دن اس نے دہلی جانے کی تیاری شروع کر دی۔

نی تی واسلوف کی عمر پینتیس سے متجاوز ہو چکی تھی۔ وہ ایک کیبرے ڈانسر تھی۔ 'سکندر جو' اس کے پاس صرف اس غرض سے جاتا تھا کہ اس کے ذریعے کیبرے کی دوسری نوجوان لڑکیوں سے ذرا واقفیت پیدا کر سکے۔''[49] عمر ڈھل جانے کی بنا پر اسے اس قدر کم پیسے ملتے تھے کہ اکثر ہاؤس بوٹ کا کرایہ خود ادا نہ کر سکتی تھی۔

> ''اس ہاؤس بوٹ کا مالک ہانجی رحمانا تھا اور جب دو تین مہینے کا کرایہ چڑھ گیا تو ایک دن رحمانا نے اس کے جسم سے کرایہ وصول کر لیا۔''[50]

یہ تمام انگریز عورتیں تو پیشہ ور جسم فروش تھیں۔ ایک مرتبہ 'سکندر جو' بُرے پھنسے، کشمیر کی ایک تعلیم یافتہ لڑکی مردولا چھاگل سے عشق کر بیٹھے۔ اس کی عمر بیس پچیس سال تھی۔ 'بال بھورے بھورے اور اینگلو

انڈین لڑکیوں جیسا صاف رنگ تھا مگر خدوخال ایسے تیکھے تھے جو صرف کشمیری پنڈتانیوں کے ہوتے ہیں۔''[51]

مردولا بھی غیر محتاط تھی مگر صرف اپنی ہی عمر کے نوجوانوں کے ساتھ۔ اس کے شوہر ہردے ناتھ چھاگل کی تنخواہ سوا تین سو روپے تھی اور وہ چاہتی تھی کہ کوئی ساڑی مہینے میں ایک مرتبہ سے زیادہ پہن کر کاسموپولیٹن کلب نہ آئے۔ اسے جواہرات بھی پسند تھے۔ وہ خود لطف ذت پر عاشق تھی۔ خواجہ صاحب سے وہ صرف روپے اینٹھنا چاہتی تھی۔ وہ خواجہ صاحب کو اپنے جسم پر وہ حقوق نہیں دینا چاہتی تھی جو اس کے چہیتے لطف ذت کو حاصل تھے۔ وہ سکندر کو خواجہ صاحب کہتی ہے تو وہ اصرار کر کے اس سے خود کو 'سکندر' کہلواتے ہیں۔ مردولا 'سکندر جو' کو خوب نچاتی ہے۔ یہ ہزاروں خرچ کرتے ہیں ان کی بدنامی بھی ہوتی ہے اور سبکی بھی ہوتی ہے مگر ان کا عشق ہے کہ کسی طرح کم نہیں ہوتا؟

سکندر جو کی زندگی کا کارنامہ صرف عورت بازی ہے۔ عیاشی ان کے کاروبار کو متاثر کرتی ہے مگر وہ پرواہ نہیں کرتے۔ پوتا پوتی ہو جانے کے بعد بھی ان کا یہ مشغلہ دھیما نہیں پڑتا۔ کشمیر کے حالات سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں۔ انھیں سیاست سے اور کشمیریوں کی سیاسی جدوجہد سے کوئی واسطہ نہیں۔ سکندر جو کی فطرت کی مزید تشریح مصنف کی زبان سے سنیے:

> ''میرا ہیرو ایک امیر تاجر ہے۔ اس کے جذبات میں گہرائی نہیں اس کے دل میں سچے عشق کی آگ یا تو بھڑکی ہی نہیں، یا اگر زون کی لڑکی فضلی کے لیے بھڑکی بھی تو جھوٹی آگ تھی۔ جہنم کی آگ نہیں۔ لاوے کی آگ نہیں۔ پھلجھڑی کی آگ، پٹاخے کی آگ، اس کا دماغ زیادہ سے زیادہ پیسے کمانے اور زیادہ سے زیادہ عورتوں کو پھانسنے کے علاوہ اور کسی فکر سے آشنا نہیں۔ اس نے کبھی ابن خلکان کا نام نہیں سنا اور اپنے ہم چشم کشمیری تاجروں یا بمبئی کے سیٹھوں اور فلم کے ستاروں کے عشق کی داستان کے علاوہ کسی اور تاریخی واقعے سے واقف نہیں۔ اسی لیے ان کا لڑکا 'انور جوان' سے شدید نفرت کرتا ہے۔''[52]

''شبنم' کے ہیرو، ارشد علی خان جو 'دکن آبزرور' کے ایڈیٹر ہیں اسی قماش کے آدمی۔ وہ فارسی کا بڑا اچھا مذاق رکھتے ہیں۔ اردو میں اچھی خاصی غزلیں اور نظمیں کہہ لیتے ہیں۔ دکن کے ایک مشہور اخبار کے ایڈیٹر ہیں مگر جنس کے بارے میں ان کا بھی رجحان تقریباً وہی ہے جو نعیم اور 'خواجہ سکندر جو' کے یہاں نظر

آتا ہے۔ان کے کئی لڑکیوں سے تعلقات رہ چکے ہیں۔ آخر میں وہ شبنم پر عاشق ہو جاتے ہیں۔ وہ ان کی علمیت اور شہرت سے مرعوب ہو جاتی ہے۔ شبنم کی شخصیت کے گرد جو افواہوں اور بدنامیوں کا ہالہ بنا ہوا ہے اس سے بھی انھیں دلچسپی ہو جاتی ہے مگر ہر وقت انھیں بھی یہی کرید رہتی ہے کہ شبنم کنواری ہے یا نہیں۔ اس فن میں ان کی مہارت کا یہ عالم ہے کہ شبنم کے بوسے دینے اور لپٹنے کے انداز سے انھیں پتہ چل جاتا ہے کہ وہ اس سے پہلے بھی دوسروں کو بوسے دے چکی ہے اور ان سے لپٹ چکی ہے حالانکہ محض اس انداز سے نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی تک نہیں ہے۔ ایسے طور طریقے تو امریکن فلمیں دیکھنے سے بھی آجاتے ہیں۔

شبنم کے بارے میں ان کی تحقیق پولیس کی تفتیش کا انداز اختیار کر لیتی ہے۔ اس تفتیش میں ان کے دوست پروفیسر اعجاز بھی مدد دیتے ہیں جو انگریزی کے پروفیسر ہیں۔ جنسی اور عریاں ناول لکھنے میں انھیں ید طولیٰ حاصل ہے، ان پروفیسر صاحب میں خود مصنف کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان دونوں کی مشترک تفتیش آخر تک جاری رہتی ہے اور ناول ختم ہو جاتا ہے۔ اس ناول کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ اس سے ہمیں پتہ چل جاتا ہے کہ عزیز احمد اچھے خاصے شعر بھی کہہ لیتے ہیں اور ان کا فارسی کا مذاق کس قدر بلند ہے۔ انھوں نے بھی——اس ناول میں اپنی فطرت کے اس پہلو کی تسکین کی ہے، جس کی کہ مرزا رسوا نے امراؤ جان ادا میں کی تھی۔

اب ان کے بہترین ناول "ایسی بلندی ایسی پستی' کے ہیرو سلطان حسین کو لیجیے۔ اس کی زندگی کی بھی سب سے نمایاں چیز اس کا جنسی جذبہ ہی ہے۔ اس ناول میں جتنے بھی نوجوان مردوں کا ذکر کیا گیا وہ سب اسی قسم کے ہیں سوائے سنجر بیگ کے۔ تقریباً یہی حال عورتوں کا ہے۔ صرف خورشید زمانی بیگم اور سرتاج کے کسی اسکنڈل کا پتہ نہیں چلتا۔ حیدرآباد کے جس زوال آمادہ طبقے کی زندگی اس میں پیش کی گئی ہے اس میں یہ کردار قرین قیاس نظر آتے ہیں۔

جنسی جذبے کے لحاظ سے سلطان حسین، محمود، شوکت، نیازی، اصغر اور اطہر سب ایک جیسے نظر آتے ہیں۔ مگر مصنف کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ہر کردار کو الگ الگ ابھارا ہے۔ سلطان حسین پر زیادہ توجہ صرف کی گئی ہے۔ اس کا کردار بھی عجیب وغریب ساخت کا نظر آتا ہے۔ عورتوں کے پیچھے وہ بھی اسی طرح بھاگتا نظر آتا ہے جیسے 'گریز' کا نعیم۔ وہ مسوری پر سیر کے لیے نہیں بلکہ صرف عورت بازی کے لیے جاتا ہے، جہاں سیوائے کے لان کے آگے فیشن ایبل بیویاں، دوسروں کے مال دار شوہروں سے

اندھیارے میں لپٹی رہتی تھیں۔ کئی کاروباریوں نے دوسروں کی بیویاں اڑا لیں۔ کئی نے اپنی بیویوں کو طلاق دی۔

"سلطان حسین پرانا مسورین تھا۔ اسے اس قدر عورتیں مل جاتی تھیں کہ وہ شادی کی ضرورت محسوس نہیں کرتا تھا مگر جب اس کی جوانی ڈھلنے لگی تو جوان لڑکیوں نے اس کی طرف ملتفت ہونا بند کر دیا۔ مسوری میں صرف کملا پریش برابر حق رفاقت ادا کیے جا رہی تھی۔ ایک دن سلطان حسین بمبئی سے آئی ہوئی ایک پارسی لڑکی کی طرف ملتفت ہوا۔ اس نے بڑے طنزیہ انداز میں اس کی باتوں کا جواب دیا۔ اس نے بتا دیا کہ "یہ سب ڈبلیو۔ٹی ہے۔" سلطان حسین سمجھ جاتا ہے کہ اس کے معنی 'ویسٹ آف ٹائم' ہے۔ [53] لہٰذا وہ شادی کر لیتا ہے۔ گویا شادی اس نے ازدواجی لطف کی خاطر نہیں بلکہ اس لیے کی کہ اس کی مارکیٹ ویلو گر چکی تھی۔ شادی کے بعد وہ اپنی بیوی کے سامنے دوسری عورتوں سے عشق کرتا پھرتا ہے۔ اسے دھوکا دے کر کملا پریش سے ملتا ہے۔ دوسری عورتوں کے ساتھ وہ بڑی آزاد خیالی کے ساتھ پیش آتا ہے مگر اپنی بیوی کے ساتھ وہ بہت تنگ نظر بن جاتا ہے۔

شادی کے بعد جب وہ ہنی مون کے لیے مسوری جا رہا تھا۔ آگرے کے اسٹیشن پر ایک مرد اس کی بیوی نور جہاں کی طرف گھور رہا تھا۔ اس نے فوراً کھڑکی بند کر دی۔ ایک دن پارٹی میں دیکھا کہ دو ایک مرتبہ اطہر اور نور جہاں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ اس نے غصے سے پوچھا:

"کس کو گھور رہی ہو؟"

"کسی کو نہیں۔" نور جہاں نے غصے سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تم برابر گھور رہی تھیں۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"میری جان مت کھاؤ۔" نور جہاں نے آہستہ سے اسی غصے کے انداز میں کہا۔

"حرافہ رنڈی۔" سلطان حسین نے بہت ہی آہستہ سے کہا۔

وہ، معمولی کپڑا بیچنے والوں کو بھی اس کا یار کہہ کر پکارتا۔ جو بھی اس سے ملتا وہ اسے اس کا یار کہہ کر پکارتا۔ ذرا سا بھی غصہ آ جاتا تو اسے حرافہ۔ رنڈی کہہ کر پکارتا ہے۔ بیوی کے ساتھ اس کا انداز گفتگو بہت ہی عامیانہ ہوتا ہے مگر غیر عورتوں سے وہ بڑے اخلاق سے پیش آتا ہے۔ بیوی بھی جب تنگ آ کر اس سے اسی لہجے میں گفتگو کرتی ہے تو یہ اس سے برداشت نہیں ہوتا اور وہ اپنی بیوی کی پٹائی کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔

"سلطان حسین یہ چاہتا تھا کہ وہ جب گھر میں داخل ہو تو نور جہاں ہنس کے اس کا استقبال کرے۔ اس کا موڈ دیکھ کر بات کرے اس کی خدمت کے لیے اپنے آپ کو اس مستعدی سے پیش کرے جیسے کوئی خادمہ اور بجائے اس کے کہ بیوی زیادہ اچھے کپڑے پہنتی ہے، زیادہ سلیقے سے بات کرتی ہے برابر بیٹھ کر کھانا کھاتی ہے اس میں اور نوکروں میں فرق ہی کیا ہے۔"[54]

وہ بیوی پر حق ملکیت کا قائل تھا۔ امریکہ کے تعلیم یافتہ انجینئر اور مہذب سوسائٹی میں اٹھنے بیٹھنے والے شخص کی فطرت میں یہ رجحان بڑا عجیب سا لگتا ہے۔ جاہل کی فطرت میں یہ بات عجیب نہیں لگتی مگر سلطان حسین جیسے شخص میں —— بقول ڈاکٹر احسن فاروقی اسے صرف کمینہ پن ہی کہا جاسکتا ہے۔

نور جہاں کے خلع لے لینے کے بعد وہ خدیجہ سے شادی کر لیتا ہے۔ خدیجہ گو، نور جہاں سے زیادہ تعلیم یافتہ تھی لیکن وہ غریب ماں باپ کی بیٹی تھی۔[55] معاشی بندھن کچھ ایسا تھا کہ اسے دنیا بھر میں ہر طرف سلطان حسین ہی سلطان حسین نظر آتا تھا۔ "نور جہاں پر اس کا حق ملکیت قائم نہ ہو سکا تھا۔ خدیجہ اس کے اس حق کو بخوشی تسلیم کر لیتی ہے۔"[56] "وہ ایک انسان کے جسم اور روح کا مالک بننا چاہتا تھا اور بن چکا تھا۔ نور جہاں کے ساتھ کے زمانے اور نور جہاں کے خلع کے زمانے میں اس نے محسوس کیا تھا کہ ازدواجی تعلق کے باوجود نور جہاں اس طرح اس کی ملکیت نہیں تھی جیسے اس کا مکان، اس کی زمین، اس کی سمجھ سے یہ حقیقت بالاتر تھی کہ نسوانی حسن جسم کا ایک روحانی جوہر ہوتا ہے جس کی تسخیر حکومت سے نہیں ہو سکتی بلکہ ایسے والہانہ جذبے اور عقیدت سے جس میں محبت کرنے والے کو اپنی اغراض کا ہوش نہ رہے۔"[57]

عشق کے لیے جس ذہنی اور اخلاقی ایثار کی ضرورت ہے وہ اس سے محروم تھا۔ نعیم کی طرح اس میں بھی عشق کی صلاحیت ہی نہ تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ عورت کو صرف اپنی حیوانیت کی تسکین کا ذریعہ سمجھتے ہیں نہ کہ رفیق زندگی۔

جاگیر دار طبقے کے نوجوانوں کے عشق کے بارے میں مصنف نے جو کچھ لکھا ہے وہ ان کے تمام ہیروؤں پر صادق آتا ہے۔

لکھتے ہیں کہ ان لوگوں کے نزدیک عشق کا مفہوم مختلف تھا۔ مقطع وہی شادی سہی لیکن محمود شوکت، نیازی، اصغران سب کے نزدیک، عشق ہی نہیں تھا۔ جب تک اس میں بدمعاشی کی شان نہ ہو۔ وہ

عشق عشق ہی نہیں تھا، جس میں ڈینگیں نہ ماری جائیں اور خواہ انجام شادی ہی کیوں نہ ہو، پینگیں بڑھا کر لڑکی کو خراب کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ یہ وہ عشق تھا جس کا وسکی کے گلاسوں سے گہرا تعلق تھا۔"[58]

انتظار حسین نے ٹھیک لکھا تھا کہ:

"اس ناول میں معاشقوں کی داستانیں ہیں عشق کی کوئی کہانی نہیں ہے۔ عشق میں تو جنسی جذبے کو تھوڑا (Sublimate) کرنا پڑتا ہے اور وہ جنسی افراتفری کے ماحول میں ممکن نہیں۔"

عزیز احمد کے تمام ہیروؤں سے بحث کرتے وقت ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ بنیادی فطرت کے اعتبار سے یہ سب یکساں ہیں۔ عورت کے بارے میں یہ بڑے تنگ نظر ہیں۔ ہمیشہ اس کے سینے پر نظر رکھتے ہیں۔ یہ جاننے کی فکر میں رہتے ہیں کہ وہ دوشیزہ ہے یا نہیں۔ پھر دوشیزگی کا اندازہ لگانے کے گر بھی جانتے ہیں۔ اس یکسانیت کی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ شاید ان کا خالق بھی عورت کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔

عزیز احمد زندگی کی پیش کش کے بارے میں نیچرل ازم کے قائل ہیں۔ شاید وہ یہ کہیں کہ جن لوگوں کی تصویریں انھوں نے پیش کی ہیں وہ اسی قسم کے ہیں مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا دنیا میں صرف اسی قسم کے انسان بستے ہیں؟ ایسے انسان پیش کرنے سے ان کی نیت کیا ہے؟ وہ اپنے قارئین کو کیا دینا چاہتے ہیں؟

ڈاکٹر احسن فاروقی نے ان کے متعلق لکھا تھا کہ "سب ناولوں سے ایک بات یہ واضح ہوتی ہے کہ عزیز احمد زندگی کو دیکھنے اور اس کا عکس اتارنے کے اہل ضرور ہیں مگر انھیں زندگی سے کوئی ہمدردی نہیں۔ انھیں برائی سے خاص دلچسپی تھی اور انسانیت کا کوئی تصور ان کے یہاں چھو بھی نہیں گیا ہے۔ برائی برائے برائی ان کا مسلک ہے۔"

عزیز احمد کے یہاں نسوانی کرداروں پر زیادہ توجہ صرف نہیں کی جاتی۔ صرف 'شبنم' میں انھوں نے شبنم کے کردار کو اس تفصیل کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے جیسے کہ 'گریز' میں نعیم یا 'آگ' میں خواجہ سکندر جو۔

'ایسی بلندی ایسی پستی' میں زیادہ تر توجہ زندگی کی پیش کش پر ہے۔ وہ زندگی جو بہت سے کرداروں کا مجموعہ ہے۔ اس لیے اس میں کئی کرداروں کو ابھارا گیا ہے۔ اس ناول میں عزیز احمد کا مقصد

حیدرآباد کے جاگیرداروں اور دولت مندوں کی گھناؤنی زندگی اور ان کی اخلاقی پستی کی تصویر پیش کرتا تھا۔ مختلف قسم کے نشیب و فراز دکھانے کے لیے انھوں نے مختلف کردار وضع کیے ہیں۔

''گریز'' میں کوئی نسوانی کردار زیادہ اہم نہیں ہے۔ بلقیس کی اہمیت صرف اس قدر ہے کہ اس کا تصور خالی اوقات میں نعیم کی نگاہوں کے سامنے گھومتا رہتا ہے۔ اور وہ اس سے گاہے بہ گاہے ذہنی وصل کا لطف حاصل کرتا رہتا ہے۔ مارگریٹ، ایلس، برتھا، یھودن اور فریڈا صرف ہیرو کے جنسی تجربات کو نمایاں کرنے کا کام انجام دیتی ہیں۔ ان عورتوں میں جو انفرادیت ہے ان کے سینے، لب اور جسم کی ہے۔ کسی کا سینہ سخت ہے کسی کا ڈھلکا ہوا۔ کسی کا جسم بھاری ہے تو کسی کا سڈول۔ صرف میری پاول کے کردار کو ذرا تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے جس کی بنا پر اسے گلِ سرخ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ جنس کے معاملے میں وہ آزاد خیال نظر آتی ہے مگر دوسرے لوگ اس سے اس کی اس آزادہ روی کی بنا پر دلچسپی نہیں لیتے بلکہ اس کی اشتراکی خدمات کی بنا پر۔ اسے اپنا سماجی کام عشق بازی سے زیادہ عزیز ہے۔

کراکسلے جو کافی ذہین اور وسیع الخیال نظر آتا ہے۔ اسے اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ دونوں کی شادی ہو جاتی ہے پھر دونوں کے تعلقات کشیدہ ہو جاتے ہیں۔ تعلقات کی اس کشیدگی سے اس ناول میں صرف یہی مقصد حاصل ہوتا ہے کہ نعیم کو اس کے ڈھلکے ہوئے پستانوں کو محسوس کرنے اور اس کے بوسے لینے کا موقع مل جاتا ہے۔ پھر آخر میں نعیم سے اس کی ملاقات ہندوستان میں کروائی گئی ہے۔ یہ ملاقات بھی بھرتی کی چیز نظر آتی ہے۔ اسی طرح کراکسلے کی موت کا بھی بظاہر کوئی مفہوم نظر نہیں آتا۔

'آگ' میں بھی کوئی نسوانی کردار اہم نہیں ہے۔ صرف مردولا چھاگل کے کردار میں تھوڑی سی دلکشی نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ زون اس کی لڑکی فضلی، لیلی، لائیڈ، جنجر اور نی تی و اسلوف وغیرہ صرف جسم فروش ہیں۔ ان کے کرداروں میں کوئی خاص بات نہیں پائی جاتی۔

جس نسوانی کردار پر عزیز احمد نے سب سے زیادہ توجہ صرف کی ہے وہ 'شبنم' ہے۔ انھوں نے شبنم کی شخصیت کے تمام عناصر کو نہایت تفصیل کے ساتھ واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں انھوں نے یہ بھی دکھایا ہے کہ شخصیت کی تعمیر میں وراثت کا عنصر کس حد تک ہوتا ہے۔ اس کے متعلق مشہور تھا کہ اس کی دادی طوائف تھی۔ ارشد علی خاں کا خیال تھا کہ شبنم کی رومانی شخصیت کی ساری شیرینی اور سارا رس اسی سے ماخوذ ہے۔ اس کے نانا شاداب جنگ کے یہاں فراش تھے۔

ارشد علی خان پہلی ہی ملاقات میں شبنم پر عاشق ہو جاتا ہے۔ اس کے کئی لڑکیوں سے تعلقات رہ

چکے تھے مگر شبنم نے اسے اس لیے متاثر کیا کہ اس کے متعلق عجیب و غریب قصے مشہور تھے۔ اس کے کردار کی پُراسراریت اس کے لیے دل کشی کا باعث بنی۔ بدنامی کی وجہ سے شبنم ارشد کو ذرا آسان معلوم ہوتی تھی۔"[60]

شبنم میں شہرت پسندی کا جذبہ تھا۔ اسی جذبے کی بدولت نوازش کو اس کی قربت نصیب ہو سکی۔ اسی جذبے کے تحت وہ ارشد علی خاں تک پہنچی اور اسی جذبے کے تحت اس نے اقوام متحدہ پر منظور حسین کا مضمون اپنے نام سے چھپوانا قبول کر لیا۔ یہ جذبہ اس کی شخصیت کی ساخت میں اس قدر اہم تھا کہ پروفیسر اعجاز حسین بھی شبنم کے سلسلے میں اس بات کو اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیتے ہیں۔

شبنم کو نوازش سے دلچسپی اس وقت ہوئی جب وہ میٹرک کی طالبہ تھی۔ نوازش کو بھی اس سے والہانہ محبت تھی۔ شبنم ارشد علی خاں کے سامنے بھی یہ تسلیم کر لیتی ہے کہ اسے نوازش سے محبت تھی مگر وہ قسم کھا کر یہ بھی واضح کر دیتی ہے کہ نوازش سے جسمانی قرب کی نوبت کبھی نہیں آئی بلکہ دو بدو بیٹھ کر بات کرنے کا بھی موقع نہیں ملا"[61] مگر ارشد کے دل کا کانٹا نہیں نکلتا۔ ارشد کو مسلسل شک تھا کہ شبنم ایک عورت نہیں دو عورتیں ہیں۔ ایک دل والی شبنم ایک جسم والی شبنم، ایک نوازش کی شبنم، ایک منظور کی شبنم۔ یہ دونوں شبنمیں صرف اس کے دل ——— اور اس کے آغوش میں ایک ہو سکتی تھیں۔

شبنم کی بدنامی کی ابتدا نوازش کے قصے سے ہو جاتی ہے۔ دراصل اسے بدنام کرنے کا ذمے دار نوازش ہے۔ وہ لوگوں کو شبنم کے خط دکھا دکھا کر بدنام کرتا پھرا کہ وہ تو اب بھی اسے چاہتی ہے:

> ''جس رازداری کا اس نے وعدہ کیا، دعویٰ کیا اسے کبھی پورا نہ کر سکا۔ ایک ایک کا ہاتھ پکڑ کے وہ کہتا رہا۔ ''ہائے میں کیا کروں، شبنم مجھے چاہتی ہے اور میری شادی زبردستی کسی اور سے کر دی گئی۔''[62]

پروفیسر اعجاز حسین جنھیں ارشد علی خاں نے شبنم کے کردار کی تفتیش کے لیے مقرر کیا تھا، نوازش سے ملتے ہی نوازش ان سے کہتا ہے:

> ''کئی گواہ نکل آئے کہ انھوں نے مجھ کو اور شبنم کو چاندنی راتوں میں ہاتھ میں ہاتھ دیے باغ میں ٹہلتے دیکھا۔ حالانکہ میں آپ سے قسمیہ کہتا ہوں کہ کبھی شبنم کے آنچل کا تار بھی میں نے ان ہاتھوں سے نہیں چھوا۔ بہر حال کئی نوکروں نے حلفیہ گواہیاں دیں۔''[63]

نوازش کے قصے کی حد تک یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ شبنم کو نوازش سے محبت ضرور تھی مگر اس محبت نے وہ صورت اختیار نہیں کی تھی کہ شبنم کو اس قدر بدنام کیا جاتا۔ یہاں شبنم ایک المیہ کردار نظر آنے لگتی ہے۔ جس کی معمولی سی غلطی اس کی تباہی کا باعث بنتی ہے۔

شبنم کے دو افسانوں کا بار بار ذکر کیا جاتا ہے۔ یہ ہیں دوراہا اور شکاری۔ ارشد علی خاں کا خیال ہے کہ دوراہا نوازش علی سے متعلق ہے اور شکاری منظور حسین سے متعلق۔ شکاری کو دیکھنے کے بعد نوازش کا بھی خیال یہی ہے۔ ''شبنم اس سے بچ نہیں سکتی، نوازش کا یہ بھی خیال ہے کہ ''میں اس سے نہ مل سکا تو وہ اس طرف بہک گئی۔''

جہاں تک نوازش کے واقعے کا تعلق ہے، تفتیش کے بعد ارشد اسے معاف کر دیتا ہے۔ وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ نوازش کی محبت میں ایسی شرافت تھی جس کی نظیر مشکل سے ملتی ہے۔ [۶۵]

منظور کے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ بہت گھاگ ہے۔ اس کی داشتاؤں کی فہرست خاصی طویل ہے۔ وہ جو کام بھی کرتا ہے بڑے سلیقے سے کرتا ہے۔ وہ شبنم کے گھر میں جب آمد و رفت شروع کرتا ہے تو پہلے وہاں اپنی بیوی کو لے جاتا ہے۔ شبنم کے ساتھ ادھر ادھر جاتا ہے تو بیوی کو بھی ساتھ لے جاتا ہے۔ ارشد کے دل میں زیادہ کھٹک اسی کی طرف سے ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ کاش اس کے ساتھ منظور والے قصے کا دھبہ نہ ہوتا۔ زیادہ تر تفتیش اسی سلسلے میں کی جاتی ہے، شبنم کی سہیلی امیر کہتی ہے:

> ''ارشد صاحب مجھے تو وہ لڑکی ایسی نہیں معلوم ہوتی کہ منظور حسین صاحب سے بچ
> بچ ـــــ'' [۶۶]

ارشد بار بار شبنم سے منظور کا ذکر چھیڑتا ہے۔ اسے اپنی تجربے کاری پر ناز ہے۔ وہ نوازش کے معاملے کو چھیڑ کر شبنم کے چہرے کے تاثرات دیکھنا چاہتا ہے مگر ''شبنم کے چہرے سے کبھی کچھ ظاہر نہ ہو سکا تھا۔ نہ غم نہ غصہ نہ شکایت نہ حکایت۔ وہ شرما جاتی یا پھر مسکراتی رہتی۔ ایک طرح کی نسوانی نقاب تھی جس کے اندر ارشد کی تجربے کار نگاہیں بھی کچھ نہ دیکھ سکتیں۔'' [۶۷]

شروع کی ملاقاتوں میں جب ذرا حجاب دور ہو گیا تھا ارشد نے شبنم کا جائزہ لینا چاہا:

> ''ارشد نے اسے نگاہ بھر کے دیکھا۔ سر کا ایک ایک بال بڑی محنت سے اپنی اپنی جگہ ٹھیک کیا گیا تھا۔ ادھر ادھر چہرے کے اطراف بالوں کے ہالے تھے اور معلوم نہیں

> حقیقت کیا تھی معصومیت یا تجربہ لیکن چہرے پر بڑا بھولا پن۔ ایک طرح کا سلونا پن ---- نرمی برس رہی تھی۔'' [۶۸]

ارشد کا بدگمان دل ہر سادہ بات میں گہرائی ڈھونڈتا ہے۔ بہلا پھسلا کر جب وہ اسے سنیما لے جانے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور وہاں اسے بوس و کنار کی حد تک لے آتا ہے اس وقت ارشد کی نگاہوں کو محسوس ہوتا ہے کہ:

> ''اس کے چہرے پر جنس ہی جنس تھی حسن غائب ہو چکا تھا۔ اس کے چہرے پر بجائے شگفتگی کے ایک طرح کی کہر تھی ایک طرح کی دھند۔ جب ارشد اسے پیار کرنے کو جھکا تو اس کے لب بڑی والہانہ سپردگی کے ساتھ پیوست ہو گئے۔ اس کا پورا جسم سپردگی کا شکار تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ اپنے ریشمی لفافے سمیت ارشد کے جسم میں پیوست ہو جائے گا۔ بوسہ اور آغوش دونوں کی سپردگی تجربے کے آثار تھے اور دفعتاً ارشد کے دل میں بھی زور کی کھٹک پیدا ہوئی کہ یہ دوشیزگی کا بوسہ نہیں۔ اگر کسی طرح باس کے کمرے کے دروازے میں چٹخنی ہوتی اور وہ دروازے کو بند کر سکتا تو وہ شبنم کی دوشیزگی کا امتحان کر لیتا۔'' [۶۹]

عزیز احمد کے کرداروں کو اپنی تجربے کاری پر ناز ہوتا ہے۔ دوشیزگی کا اندازہ لگانے کا ان کا جو معیار ہوتا ہے وہ سخت ناقابل اعتماد ہے۔ پھر دوشیزگی کا امتحان لینے کا تذکرہ کس قدر عامیانہ معلوم ہوتا ہے۔ 'گریز' میں بھی بیان کیا گیا ہے کہ خانم شادی سے پہلے کافی بدنام تھی۔ شب عروسی میں عاقل خان اپنی بدحواسی کی بنا پر اس کی دوشیزگی کا امتحان لینا بھول گئے تھے ورنہ انھیں پتہ چل جاتا کہ وہ کنواری تھی یا نہیں۔

شبنم ہر طرح ارشد کا شبہ دور کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ آخر میں وہ کہتی ہے کہ:

> ''اگر اس پر بھی آپ کو یقین نہ آئے تو میں بے حیائی سے ایک بات کہوں۔ جب میں قانونی طور پر آپ کی ہو جاؤں تو پہلی ہی رات کو اگر مجھے اپنے قابل نہ پائیں تو اسی وقت مجھے چھوڑ دیں۔'' [۷۰]

اس گفتگو کے بعد جب وہ جانے لگی تو:

> ''ارشد نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور جب اپنی بازوؤں کی گرفت میں اسے آخری

بار لیا تو اس کی سپردگی میں اتنا تجربہ نہ تھا کہ پھر اس نے شک کی ایک لہر محسوس کی۔''[۱۷]

کس قدر پھوہڑپن ہے کہ وہ اپنے اس شک کا اظہار خود شبنم سے بھی کر دیتا ہے۔ کہتا ہے:

''مجھے کچھ ایسا اندازہ ہوا کہ اس سے پہلے بھی تمھیں اوروں کو پیار کرنے کا تجربہ ہے۔
گویا یہ تمھارے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے۔''[۲۰]

ارشد کی سابقہ محبوبہ زیبا نے پہلے شبنم کی حمایت کی تھی مگر آخر میں وہ ارشد سے کہتی ہے:

''مگر اب مجھے خود یقین آچلا ہے کہ لوگ جو کہتے ہیں سچ ہے، دیکھو اس کے چہرے پر اتنی سختی ہے جیسے بیاہی ہوئی لڑکیوں کے چہرے پر ہوتی ہے، دوشیزگی کی نرمی نہیں۔''[۲۱]

شبنم کے بارے میں خود ارشد کا تاثر یہی تھا کہ ''یہ چہرہ، یہ ہونٹ، یہ رخسار، یہ سب بیتے ہوئے ہیں۔'' یہ خیال ارشد کے دل میں اس وقت پیدا ہوا تھا جب شبنم پہلی مرتبہ اس سے اخبار کے دفتر میں ملی تھی۔ اس موقع پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر یہ ساری تفتیش کیا محض تفتیش کی خاطر تھی۔ ان کے دل میں یہ شبہ ہے کہ شبنم آوارہ ہے اور منظور سے پھنسی ہوئی ہے۔ شبنم اس شبہے کو دور کرنے کے لیے قسمیں کھاتی ہے اور ہر قسم کی دلیل پیش کرتی ہے مگر اس کی رائے نہیں بدلتی۔ وہ شبنم سے بغیر شادی کیے محض تعلقات قائم رکھنا چاہتا ہے۔ ویسے تعلقات جیسے کہ اس کے دوست اعجاز حسین کے خیال کے مطابق فرانس میں ٹوٹی مونڈین لڑکیوں سے رکھے جاتے ہیں۔ شبنم اس کے لیے تیار نہیں ہوتی۔ شبنم کے آخری خط پر کتاب ختم ہو جاتی ہے۔ اس کی آخری سطریں ہیں:

''مجھے امید ہے کہ آپ میرے نام کی تشہیر کر کے ایک ایسی ہستی کو جس کا گناہ بجز آپ کے ساتھ خلوص کے اور کچھ نہیں تھا۔ سخت سزا نہیں دیں گے۔''[۲۲]

اس طرح ارشد کے لیے تو شبنم کا کردار پہیلی ہی بنا رہتا ہے اور کتاب ختم ہو جاتی ہے۔ جن نفسیاتی عوامل کے ساتھ مصنف نے اس کردار کو پیش کرنے کی کوشش کی تھی اس میں وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ البتہ 'شبنم' کے ساتھ ہلکی سی ہمدردی کا جذبہ ضرور ابھرتا ہے مگر وہ پورے طور پر المیہ ہیروئن کی حیثیت سے بھی نہیں ابھر پاتی ہے۔ اس لیے کہ یہ بات مصنف کی منشا ہی کے خلاف ہے۔ انتظار حسین نے اسی کردار کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا:

''ڈپٹی نذیر احمد، سرشار اور رسوا نے خیالی پیکر تراشے اور ان میں جان ڈالی۔ عزیز احمد

صاحب ایک جاندار مخلوق کو اپنے ناول میں لائے اور اس کی روح قبض کر لی۔''[۲۵]

ڈاکٹر احسن فاروقی نے لکھا تھا:

''شبنم کے کردار پر انھوں نے بڑی توجہ صرف کی ہے اور یہی کردار ان میں فن کارانہ نگاہ کے فقدان کا پورا ثبوت دیتا ہے۔ اس کردار کی کہیں بھی نبض چلتی ہوئی محسوس نہیں ہوتی۔''[۲۶]

ناول لکھنے کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ اگر شبنم معصوم ثابت ہو تو ارشد اپنے دوست اعجاز حسین سے اس کے متعلق کچھ لکھوائیں جواب تک 'جنس وتن' پر بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔[۲۳] گویا یہ ناول اسی لیے لکھا گیا ہے کہ ارشد کی نظر میں شبنم معصوم ثابت ہو چکی تھی۔ حالانکہ یہ بات ثابت نہیں ہو پاتی۔ کتاب ختم کرنے کے بعد صرف یہی رائے قائم ہوتی ہے کہ بحیثیت ناول یہ کتاب ناکام رہی ہے۔

دوسرا نسوانی کردار جس پر کچھ توجہ صرف کی گئی ہے وہ 'ایسی بلندی ایسی پستی'' کی نور جہاں ہے۔ اس کردار کی تشکیل میں انھوں نے وراثت اور ماحول کے اثر کو ملحوظ رکھا ہے۔ اس ناول میں انھوں نے وراثت کے مختلف عناصر کے مختلف اثرات کو بھی نمایاں کیا ہے۔ نور جہاں، مشہور النسا اور سرتاج تینوں بہنیں ہیں۔ ان تینوں نے ایک ہی انداز کی تعلیم پائی۔ ایک ہی ماحول میں پلیں بڑھیں۔ ان کے دادا مشہور الملک تھے اور نانا قابل جنگ۔ مشہور الملک اور قابل جنگ کی جھلک ان تینوں بہنوں میں مختلف درجوں میں نظر آتی ہے۔ ان تینوں بہنوں کی شخصیت کو مصنف نے بڑی فن کاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مشہور النسا کے مقابلے میں سرتاج کے کردار پر زیادہ توجہ اس لیے دی گئی ہے کہ اس کی اور نور جہاں کی فطرت میں تضاد سا نظر آتا ہے۔ سرتاج کا کردار نور جہاں کے کردار کو واضح تر کر دیتا ہے۔ نور جہاں کے بارے میں لکھا ہے:

''ایک طرف اسے اپنے اندر مشہور الملک کی میراث ملی تھی ضبط، وقار، عزت و عصمت کا اشرافیہ تصور اور دوسری طرف قابل جنگ کی میراث، ذرا سا تکبر (مشہور النسا سے زیادہ مگر سرتاج سے بہت کم) ذرا سا تلذذ، آزادی، تبدیلی، کھلی ہوا کی خواہش، جنسی آزادی کی سختی سے دبائی ہوئی خواہش اور مشہور الملک کی پوتی قابل جنگ کی نواسی سے زیادہ مضبوط اور ثابت قدم تھی اس لیے اطہر کی جو کشش اس کے لیے تھی اس کو ہر مرتبہ وہ گناہ کا خیال سمجھ کے اپنے دل سے نکال دینا چاہتی تھی۔ اس نے احتیاط کی ہر مرتبہ

ضرورت سے زیادہ کوشش کی تھی مگر اس کا کیا علاج کہ اطہر پر جنون سوار ہو رہا تھا۔''

نور جہاں کی فطرت میں مضبوطی اور ثابت قدمی پائی جاتی ہے۔ اس کے تمام کام اس کی شخصیت کے فطری مظاہر ہیں۔ ممتاز شیریں نے اس کی فطرت کو سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ لکھتی ہیں کہ:

''اس ناول کا مرکزی کردار نور جہاں کچی مٹی ہے جس طرح اسے ڈھالا جائے ڈھل سکتی ہے۔ نور جہاں کی زندگی خام مواد ہے جو ایک طرف وراثت اور دوسری طرف خارجی ماحول کے زیر اثر تشکیل پاتا ہے۔۔۔ نور جہاں کی زندگی اس کے کردار سے نہیں بنتی۔ یہاں تک کہ اس کی سلطان حسین کے ساتھ ازدواجی زندگی کے چھوٹے سے المیے کی بھی وہ خود ذمے دار نہیں تھی۔ بڑے قد کے کرداروں کا المیہ خود ان کے کردار سے پیدا ہوتا ہے یعنی ان کے کردار کے کسی خاص نقص سے۔ یہاں وہ نقص جس سے المیہ پیدا ہوتا ہے فرد کے کردار میں نہیں معاشرے میں ہے۔''[۸]

نور جہاں کے واقعے کو المیہ سمجھنا بھی غلطی ہے۔ ممتاز شیریں نے اس واقعے کی ذمے داری معاشرے پر رکھی ہے۔ یہاں معاشرے کے زیادہ اہم نظر آنے کی وجہ یہ ہے کہ اس ناول کا موضوع ہی اس مخصوص معاشرے کی تصویر پیش کرنا ہے کردار صرف ذریعے ہیں غایت نہیں۔ اس ناول کے مختلف کردار اس معاشرے کی مختلف خصوصیات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس لیے دیگر کرداروں کا تذکرہ فی الحال ترک کیا جاتا ہے۔

عزیز احمد نے زندگی پر تبصرہ پیش کرنے کا انوکھا طریقہ اپنایا ہے جو اردو ناول میں نئی چیز ہے۔ اپنے اس کردار کے بارے میں لکھتے ہیں:

''سربندر کا کردار پیش کر کے اس پوری روئیداد پر جا بجا تبصرہ کیا گیا ہے اور تبصرے کی تکنیک ذرا طنز میں ڈوبے ہوئے شعور کی رو کی ہے اور اندرونی خود کلامی کی جو ابھی تک فرسودہ نہیں ہو پائی۔ اس طرح سربندر اس ناول میں وہی کام انجام دیتا ہے جو یونانی ڈرامے میں کورس انجام دیتا تھا۔ روئیداد کے عمل پر تبصرے کا۔''[۹]

مصنف نے صرف 'ایسی بلندی ایسی پستی' میں اس قسم کے کردار کے وجود کا ذکر کیا ہے۔ حقیقت یہ

ہے کہ ان کے آخری چاروں ناولوں میں اس قسم کا کردار موجود ہے۔ البتہ اتنا نمایاں نہیں ہے جتنا کہ اس ناول میں۔ 'گریز' میں ہیرو شاید یہ کام انجام دیتا ہے۔ وہ جگہ جگہ نمایاں ہو کر پوری زندگی کے کھوکھلے پن پر تبصرہ کرتا ہے۔ وہ ہر معاملے میں ایک فلسفیانہ قسم کا رویہ اختیار کرتا ہے۔ ہیرو کو اس کی غلط روی پر متنبہ کرتا رہتا ہے۔

کچھ اسی قسم کا مقام 'آگ' میں میجر صاحب کو حاصل ہے۔ وہ عالمِ ہمہ دان ہیں۔ تاریخ، فلسفہ، ادب۔ انھیں ہر علم پر عبور حاصل ہے۔ ان میں نہایت اعلیٰ درجے کی سیاسی بصیرت پائی جاتی ہے۔ وہ نہایت بااصول اور دیانت دار انسان ہیں، کسی قسم کی زیادتی کو برداشت نہیں کر سکتے۔ کشمیر کی زندگی اور وہاں کے سیاسی حالات پر تبصرہ کرنے کا کام وہی انجام دیتے ہیں۔ مشہور کشمیری لیڈر عبدالکریم خواجہ کی گفتگو سن کر وہ سوچتے ہیں:

''کہ اگر پاکستان ایسے لوگوں کے ذریعے ملا، ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں رہا تو کیا تاریخ اپنے آپ کو دہرائے گی۔ دیلمی اور سامانی اور غزنوی اور خلجی وہی شراب اور حرام۔''[۱۰]

وہ انور جو کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ تقریر بازی چھوڑ کر کاریگروں کی ٹریڈ یونین بنائے۔ مزدوروں، کسانوں اور ہانجیوں کو منظم کرے۔

ان میں اور سربندر میں فرق یہ ہے کہ سربندر کا تبصرہ بیشتر خود کلامی میں ہوتا ہے اور میجر صاحب کا بیشتر گفتگو کے ذریعے۔

'شبنم' میں بھی پروفیسر اعجاز حسین کسی حد تک یہی کام انجام دیتے ہیں۔ یہ تمام کردار اصل قصے سے الگ ہیں۔ اصل قصے سے ان کا تعلق خارجی سا ہوتا ہے۔ مصنف نے دراصل اپنی رائیں پیش کرنے کے لیے یہ کردار تراشے ہیں۔ براہ راست رائیں پیش کرنا بدنما معلوم ہوتا ہے۔ اس تکنیک سے یہ بدنمائی چھپ جاتی ہے۔ اس قسم کے کردار کی بس یہی افادیت ہے، اسے ہم کوئی اعلیٰ درجے کی DEVICE نہیں کہہ سکتے۔

مصنف نے سربندر کی خود کلامی کو شعور کی رو سے تعبیر کیا ہے۔ مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔ اردو ناول میں شعور کی رَو کے وجود سے قرۃ العین حیدر کی ناول نگاری کے سلسلے میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

جیسا کہ میں نے کہا تھا زندگی کی پیش کش کے بارے میں عزیز احمد نیچرل ازم کے قائل ہیں۔
انھوں نے 'ایسی بلندی ایسی پستی' میں ایک جگہ جملہ معترضہ کے طور پر لکھا ہے:

''گریز — کو پڑھ کر کرشن چندر نے مجھ سے کہا تھا 'مجھے ڈر تھا کہ کہیں تم آخر میں نعیم الحسن اور بلقیس کی شادی نہ کرا دو۔ میں نے جواب میں کہا تھا کہ نعیم اور بلقیس کی شادی ناول میں اس لیے نہیں ہو سکی کہ زندگی میں بھی نہیں ہوئی تھی۔ یہ تو مصنف کے اختیار کی بات نہیں ماحول اور ہیرو اور ہیروئین کے اختیار کی بات ہے۔ اپنی حد تک تو مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ میں نے حقیقت نگاری کو ہمیشہ فوٹوگرافی سمجھا ہے، ممکن ہے کبھی کبھی شیشہ دھندلا ہو، فلم خراب ہو یا فلم لیتے وقت روشنی ٹھیک نہ ہو یا میری اپنی بصارت یا بصیرت میں فرق ہو لیکن میں نے زندگی کی تنقید ہمیشہ زندگی کی عکاسی کے اندر سے کی ہے اور میں اصلی اور حقیقی کے فرق کا قائل نہیں۔''[۸۱]

نیچرل ازم پر عقیدہ رکھنے والا اصولی طور پر زندگی میں کسی قطع برید کا قائل نہیں ہوتا۔ وہ قصے کے لیے ڈھانچہ تیار نہیں کرتا، کوئی خاکہ مرتب نہیں کرتا۔ بہ الفاظ دیگر اس قسم کے ناولوں میں کوئی پلاٹ نہیں ہوتا۔ مصنف اصولی طور پر ترتیب و انتخاب کا قائل نہیں ہوتا مگر عملی طور پر جب ہم ان دعووں کے تحت لکھے ہوئے ناولوں کو دیکھتے ہیں تو ہمیں اس پائے کی فطرت نگاری (Naturalism) کہیں بھی نظر نہیں آتی۔ اچھا ہوا کہ عزیز احمد بھی اپنے اس نقطۂ نظر سے انحراف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اگر کوئی بدنصیب ناول نگار خالص قسم کی اور عکسی فطرت نگاری (Photographic Naturalism) پیش کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتا تو وہ کتاب چاہے سب کچھ بن جاتی ناول ہرگز نہ بن پاتی۔ حقیقی زندگی میں قطع و برید، تشکیل جدید اور ترتیب و انتخاب کے بغیر ادب وجود میں آ ہی نہیں سکتا۔ عزیز احمد زیادہ سے زیادہ حقیقت نگاری کی کوشش ضرور کرتے ہیں مگر بہ الفاظ دیگر تخیل کے عمل کو نظر انداز نہیں کرتے۔ وہ مواد یقیناً زندگی سے حاصل کرتے ہیں۔ ان کے قریبی دوست اور ان کے عزیز بھی اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ ان کے ناولوں میں پیش کی ہوئی زندگی حقیقی ہے۔ حقیقت نگاری اس قدر نمایاں ہے کہ لوگ ان کے کرداروں کی نشان دہی بھی کر سکتے ہیں مگر وہ ان افراد کو جان کر پیش کرتے ہیں محض افراد زندگی کی حیثیت سے پیش نہیں کرتے۔ اس میں ان کا کمال اور ان کی فن کاری پوشیدہ ہے۔

جس نیچرل ازم کے دعوے کی بنا پر بعض لوگوں کو مغالطہ ہوا ہے، ریاض احمد چودھری 'ایسی بلندی ایسی پستی' کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عزیز احمد کے دوسرے ناولوں کی طرح یہ بھی پلاٹ کا ناول نہیں۔ اس میں مروجہ معنوں میں نہ آغاز ہے نہ کلائمکس اور نہ ہی اختتام۔ اس میں کردار اہم ہیں اور انھیں کے ساتھ ناول حرکت کرتا ہے۔''[۸۲]

عزیز احمد نے 'ایسی بلندی ایسی پستی' میں دعویٰ کیا تھا کہ وہ زندگی کی فوٹوگرافی کے قائل ہیں۔ اصل اور فوٹو میں اگر کوئی فرق رہ جائے تو اس کی وجہ ان کے نزدیک شیشے کی دھندلاہٹ، روشنی کی کمی یا زیادتی یا فلم کی خرابی ہوگی نہ کہ ان کی ترتیب و انتخاب مگر وہ اسی ناول کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایسی بلندی ایسی پستی' مسلسل نہیں لکھا گیا اور نہ پہلے سے (کاغذ پر) اس کا کوئی خاکہ تیار کیا گیا۔ ایک خاکہ ذہن میں محفوظ تھا۔ جس بات کے لیے طبیعت موزوں ہوئی پہلے اسی کو لکھ ڈالا۔ اس تجرباتی ناول میں وقت کے فریب کو بھی توڑنا تھا اور صرف سریندر کی خودکلامیوں میں نہیں، ناول کی بنیادی تکنیک میں کیوں کہ ڈرامائی لمحے وقت کی ہموار اور غیر دلچسپ سطح پر یوں ابھرتے ہیں جیسے دھند کے اوپر کی برفانی چوٹیاں۔ ان ڈرامائی لمحوں کی علیت ثانوی چیز ہے۔''[۸۳]

ذہن میں خاکہ محفوظ ہونا اور قصے کا ابواب میں منقسم ہونا پلاٹ نہیں تو کیا ہے۔ پلاٹ کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ خاکہ کاغذ پر مرتب کیا جائے بس خاکے کا مرتب ہونا ضروری ہے۔ میں اسے مصنف کی خامی یا فروگذاشت نہیں سمجھتا بلکہ خوبی سمجھتا ہوں۔ اس اقتباس میں یہ بھی دعویٰ کیا گیا ہے کہ انھوں نے وقت کے فریب کو بھی توڑا ہے مگر یہ بات صرف سریندر کی خودکلامی میں نظر آتی ہے۔ یہ خودکلامی شعور کی رو تو نہیں ہے مگر اس کے کافی قریب پہنچ جاتی ہے پھر بھی صحیح معنوں میں ڈرامائی یا نفسیاتی وقت (Psychological time) کا تصور اس میں نہیں ابھر پایا ہے اس Time Sequence وہی پلاٹ والے روایتی ناول (Traditional novel) جیسا ہے — عزیز احمد نے یوروپین ناول کا مطالعہ محض طالب علمانہ یا عالمانہ نظر سے نہیں کیا ہے بلکہ انھوں نے ادیبانہ نظر سے کیا ہے۔ ناول نگاری کا شعور ان کی فطرت کا جزو بن گیا ہے۔ تکنیک کے جو تجربے انھوں نے پیش کیے ہیں وہ محض تقلیدی نظر نہیں آتے ان کی شخصیت میں ہو کر گزرے ہیں اور خود مصنف کا نقطۂ نظر بن گئے ہیں۔ ان کے آخری چاروں ناولوں

میں سے ہر ایک میں الگ الگ تکنیک برتی گئی ہے۔ 'گریز' میں پیش کی ہوئی زندگی کو زیادہ سے زیادہ فطری رنگ دینے کے لیے انھوں نے خطوط اور ڈائری کا بھی سہارا لیا ہے، بعض صاحبان کے نزدیک اس ناول میں 'دو بر اعظموں کی فرسودہ تہذیب' کی تصویر آ گئی ہے مگر یہ محض حسن ظن ہے، اس ناول میں زور زندگی پر نہیں کردار پر ہے۔ اس قسم کا زور جیسا کہ پرانی داستانوں میں ہوتا تھا— 'فسانۂ عجائب' کا ہیرو راستہ بھٹک کر انجانے دیس میں جا پہنچتا ہے۔ نعیم اپنی مرضی سے دیس دیس گھومتا ہے۔ دونوں کی غرض و غایت عورت ہے۔ جانِ عالم ایک مخصوص عورت کی تلاش میں جاتا ہے۔ یہ نیا نیا مزا چکھنے کی فکر میں گھومتا ہے گویا 'گریز' صرف کرداری ناول ہے جس میں نعیم کی زندگی کی مکمل تصویر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ 'شبنم' میں بھی زور زندگی پر نہیں بلکہ کردار پر ہے۔ نعیم کی طرح شبنم بھی معاشرے کی لازمی پیداوار نہیں بلکہ انفرادی کردار ہے۔ شبنم جو شروع میں پُر اسراری نظر آتی ہے آخر تک ایسی ہی رہتی ہے۔ مصنف تمام تر کوشش Devices کے باوجود اس ناول میں ناکام رہے ہیں۔

'آگ' اور 'ایسی بلندی ایسی پستی' میں زور زندگی پر ہے۔ ان کے کردار محض انفرادی ہستیاں نہیں وہ اپنے معاشرے کے نمائندے ہیں۔ سکندر جو محض ایک عیاش نہیں ہے بلکہ کشمیر کے ملک التجار کا لڑکا ہے اس کشمیر کا جس کے اندر باہر چاروں طرف آگ لگی ہے۔ سلطان حسین محض ایک بدفطرت عیاش اور راشی انجینئر نہیں ہے بلکہ حیدر آباد کے جاگیردار طبقے میں شامل ہو جانے والے ایک عام مرد کی تصویر پیش کرتا ہے۔

'آگ' کے متعلق خود لکھتے ہیں:

''آگ سے میں مطمئن نہیں ہوں۔ کشمیر کی وادیوں کے مسلمانوں کی زندگی کو میں نے باہر سے دیکھا ہے۔۔۔۔ آگ میں کشمیری مسلمان گھرانوں کا بیان بڑا خارجی سا ہو گیا ہے اور ناول کے ابتدائی حصے میں بیانیہ عنصر قصے پر بھاری ہو گیا ہے۔ اس کا آخری حصہ بڑی عجلت میں لکھا گیا ہے۔''[84]

عزیز احمد کہتے تو یہ ہیں کہ وہ انکسار کے قائل نہیں ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ یہاں صرف انکسار برت رہے ہیں۔ 'آگ' میں کشمیری زندگی جیسی بھی پیش کی گئی ہے ویسی ہمیں کسی بھی اردو ناول میں نظر نہیں آتی۔ اس زندگی کی پیش کش کے بارے میں جو خامی رہ گئی ہے اس کا ذکر مصنف اس طرح کرتے ہیں:

''میں واحد متکلم بڑے شش و پنج میں ہوں۔ کسی ایسی قوم کا افسانہ لکھنا جس سے لکھنے والا محض خارجی ظاہری طور پر واقف ہو بہت مشکل ہے اور شنیدہ سے دیدہ کی طرف آتے ہوئے بھی میں واحد متکلم محض ناظر رہ جاتا ہوں اور بقول 'انور جو فرزند' سکندر جو' 'جناب آپ نے میرا اجلا سوٹ دیکھا ہے مگر آپ نے میری بنیان تو نہیں دیکھی ہے کہ وہ کس قدر گندی ہے۔'' ظاہر کے اندر کی زندگی مجھ واحد متکلم نے کم دیکھی ہے اور اس لیے میں واحد متکلم ناظر ہوں تماشائی ہوں۔''[85]

انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ کشمیر میں شرفا کی عورتیں سخت پردے میں رکھی جاتی ہیں ان کے اور غریب عورتوں کے رہن سہن میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا۔ نہ انھیں کوئی حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ اسی لیے انھوں نے صرف ہیرو پیش کیا ہے ہیروئین نہ کر سکے۔ کشمیر میں صرف غریب عورت نظر آتی ہے جن میں سے اکثر کو جسم فروشی کرنی پڑتی ہے۔

غریب ہانجیوں کی زندگی کو عزیز احمد نے بڑی عمدگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ہانجی رحمانا، شعبانا، اس کا لڑکا، بیوی، جہال دار گوجر اور اس کی بیوی کے جو حالات بیان کیے گئے ہیں ان کا حلیہ اور ان کے رہن سہن کی جو تصویر پیش کی گئی ہے وہ انتہائی کامیاب ہے۔ ان کی زبانی یہ بھی بیان کر دیا گیا ہے کہ ریاست میں ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے۔

کشمیر کی زندگی کا دوسرا رخ وہ ہے جس کی بنا پر اسے جنت نظیر کہا جاتا ہے، اس کشمیر کا تعلق وہاں کے دولت مند تاجروں، حکام اور سیاحوں سے ہے۔ سیاحوں کے ساتھ ساتھ جسم فروشوں کا جمع ہو جانا بھی قدرتی امر ہے۔ ان جسم فروشوں میں کشمیر کی غریب مسلمان عورتوں سے لے کر یورپین عورتیں تک شامل ہوتی ہیں۔ مصنف نے زیادہ تفصیل سے کشمیر کے اسی رخ کو بیان کیا ہے۔

عنوان سے تو یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ ان کا مقصد اس آگ کی تصویر پیش کرنا ہے جو کشمیر اور اس کے گرد و نواح میں لگی ہوئی تھی۔ کشمیر کے پہاڑوں نے کشمیر کے شمال اور جنوب کی آگ کو وہاں پہنچنے سے دس بارہ سال تک روکے رکھا۔ ادھر سیاسی جدوجہد جاری تھی ادھر 'خواجہ غضنفر جو' کی دولت مندی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ 'سکندر جو' جو اب تک صرف فضلی اور اس کی بہنوں کو خریدنے کی سکت رکھتا تھا، اب میموں اور فیشن ایبل لڑکیوں کو خریدنے کے قابل ہو گیا:

''اور شمال میں آگ لہک لہک کے پھیلتی گئی۔ بخارا اور سمرقند اور اندجان سے قالین اور

سور آنا بند ہو گئے۔ تاشقند سے بھڑکتی ہوئی آگ بخارا پہنچی۔ مرو پہنچی، دوشنبہ پہنچی۔۔۔۔ سنہ ۱۹۱۸ء میں بخارا کی اشتمالی جماعت کی پہلی کانگریس نے مسلم مزدوروں پر پورے اعتماد کا ریزولیشن پاس کیا اور سرخ فوج کے دروازے ترکستان کے مزدوروں کے لیے کھول دیے۔۔۔۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں بخارا کی اشتمالی جمہوریت قائم ہوئی۔۔۔ جنگ بلقان نے اردو صحافت اور سیاست اور علی گڑھ میں آگ لگادی۔۔۔۔ جنوب میں دوسری قسم کی آگ پھیلتی جا رہی تھی۔ جلیانوالہ باغ میں انسان گھٹنوں اور کہنیوں پر رینگے اور ان پر آگ برسی اور پھر ہوتے ہوتے ملک بھر میں آگ لگتی گئی اور بجھتی گئی اور اس لگتی اور بجھتی ہوئی آگ کے خاکستر میں اپنوں نے اپنوں کو بھون بھون کر کھانا شروع کیا اور اسی آگ کی چنگاریاں پیر پنچال کی سفید مانگ پر بھی پڑیں اور صدیوں کی سردی پگھلنے لگی اور تب 'غضنفر جو' اور 'سکندر جو' نے اپنے اطراف زندگی کی ہلچل محسوس کی۔"۸۶

کشمیر کی زندگی میں جو ہلچل پیدا ہوئی تھی مصنف اس کا صرف سرسری طور پر ذکر کرتے ہیں۔ انھیں جنسی تعلقات بیان کرنے میں اتنا لطف آتا ہے کہ ان ہنگاموں کے درمیان بھی انھیں یہی نظر آتا ہے:

"صرف سری نگر کی چاندی فضلی اور اس کی بہنوں کی آبرو اور خدوخال پر نثار ہوتی رہی۔
سمرقند و بخارا کی کف خاک نے کئی سو سال کے بعد پھر انگڑائی لی۔"۸۷

کشمیری حکومت میں مسلم عوام پر جو ظلم ڈھائے جا رہے تھے اس کا ذکر ضرور کیا جاتا ہے۔ چند لیڈروں کا بھی ذکر کیا جاتا ہے جو ان غریبوں کے حقوق کی خاطر جنگ کر رہے تھے مگر اس سیاسی جدوجہد کا بیان اس قدر سرسری ہے کہ یہ سب لوگ مضحکہ خیز بن کر رہ جاتے ہیں۔ پہلا شخص جو حالات سے بیزار دکھائی دیتا ہے وہ علی گڑھ کے ایک گریجویٹ ظہری صاحب ہیں، وہ بات بات میں یہ کہتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ کشمیر کی خرابیوں کا واحد علاج جمہوری حکومت ہے۔ 'غضنفر جو' سے کہتے ہیں:

"باخدا خواجہ صاحب اپنے ملک کی حالت دیکھ کے میری آنکھوں میں خون اتر آیا ہے۔ ہم لوگوں سے بھیڑ بکریاں گھوڑے خچر اچھے ہیں وہ مار کھاتے ہیں تو کبھی کبھی سرکشی بھی کرتے ہوں گے، ہم کو تو کسی چیز کا احساس ہی نہیں۔ یہ بھوک دیکھیے۔ یہ غربت

دیکھیے۔ یہ افلاس دیکھ کر میرا خون کھولتا ہے۔"۸۸

انھی ظہری صاحب کے مشورے سے سکندر جو کو علی گڑھ بھیجا جاتا ہے۔ یہ جمہوریت کے نعروں کے ساتھ انقلابی نظمیں بھی لکھتے تھے۔ مگر پھر مہتاب جنگ کے مشورے سے سرکاری ملازمت کر لیتے ہیں اور ان کا جمہوری حکومت کا نعرہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا ہے۔ سکندر جو ان کے لیے کہتا ہے کہ 'یہ بھی ہماری طرح غدار نکل گیا۔'

کشمیر کے ایک اور لیڈر کا ذکر بڑے آب و تاب کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ ان کا نام شیخ محمد عبدالرحمن ہے۔ انھیں مصنف نے 'پلنگ کشمیر' کے نام سے یاد کیا ہے۔ مہتاب جنگ 'خواجہ سکندر جو' کے ذریعہ شیخ محمد عبدالرحمن کو بھی خریدنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ مہتاب جنگ سے صاف کہہ دیتا ہے کہ:

"شیخ محمد عبدالرحمن کو کوئی نہیں خرید سکتا۔ ان میں اور ظہری صاحب میں بہت فرق ہے۔"۸۹

کشمیر کی سیاست میں یہ مہتاب جنگ بڑا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اجمیر مارواڑ میں ان کی بہت بڑی جاگیر تھی۔ انھوں نے ایٹن میں تعلیم پائی تھی۔ یہیں اکثر مہاراجاؤں سے ان کی دوستی ہوئی۔ "قدرت نے انھیں ہر طرح کے آداب مجلس کے لیے کامل بنایا تھا۔ خوبصورت خدوخال، شہابی رنگ، پتلا چہرہ، سر پر کالے ہلکے ہلکے بال پیچھے کی طرف پلٹے ہوئے، پتلی پتلی بھوری مونچھیں، جن کی دلکشی کوئی مہارانیوں کے دل سے پوچھے۔"

یہ پہلے ظہری صاحب کو خرید واتے ہیں پھر شیخ محمد عبدالرحمن کو بھی تقریباً ناکارہ بنا دیتے ہیں۔ ان کے سیاسی خیالات میں اعتدال پیدا کر دیتے ہیں اور وہ حکومت سے ساز باز کر لیتے ہیں۔ یہ مہتاب جنگ جہاں سیاسی جوڑ توڑ کی اعلیٰ صلاحیت رکھتے ہیں وہاں عزیز احمد کے پسندیدہ کرداروں کی نمایاں خصوصیت بھی ان میں پائی جاتی ہے۔ جب وہ سکندر جو کے ذریعہ شیخ محمد عبدالرحمن کو خریدنے کی کوشش کر رہے ہیں اس وقت بھی ان کے پاس راجیشوری لہری بیٹھی ہوئی ہے۔ ان کے کئی مہارانیوں سے مراسم ہیں۔ اس قسم کا انسان دوسروں کو خریدنے کے بجائے خود آسانی سے بک جایا کرتا ہے۔

تحریک پاکستان کی گونج بھی کشمیر میں سنائی دیتی ہے۔ 'سکندر جو' کا لڑکا 'انور جو' اس تحریک سے بڑی دلچسپی رکھتا ہے۔ وہ کشمیر کے طاقتور لیڈر شیخ محمد عبدالرحمن سے مقابلے کے لیے نکل آتا ہے۔ اسے قائداعظم سے بڑی عقیدت ہے۔ نظریہ پاکستان پر کچھ دلچسپ گفتگو بھی پیش کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ

ہمیں اور کچھ نظر نہیں آتا۔ کشمیر کی سیاسی جدوجہد کے روحِ رواں اور دو اشخاص رہے ہیں۔ شیخ عبداللہ اور چودھری غلام عباس۔ اس ناول میں ان کا اور ان کی جدوجہد کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ ان دونوں کے ذکر کے بغیر کشمیر کی سیاسی صورت حال کا بیان مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔

'آگ' اور 'گریز' کو دیکھ کر ایک احساس اور ہوتا ہے۔ ان کے بیانات میں کہیں کہیں سفرنامے کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان دونوں ناولوں کے موضوع عزیز احمد کو ان مقامات کے سفر کے ذریعہ حاصل ہوئے۔ عزیز احمد نے اپنی معلومات سے کافی فائدہ اٹھایا ہے۔ اصل میں بنیادی چیز یہی معلومات ہیں جنھیں مصنف نے ناول کا رنگ دے کر پیش کیا ہے۔

'گریز' میں بھی ایسے مقامات کافی ہیں۔ نعیم ایلس کو بوادبولون یعنی بولوں کا باغ لے کر جاتا ہے۔ یہاں اس باغ کا، اس کے خوبصورت چشمے کا سبزے اور درختوں کے جھنڈ کا بیان پیش کیا جاتا ہے۔

ایلس کے چلے جانے کے بعد اس کی جدائی کا غم غلط کرنے کے لیے نعیم جرمنی کا سفر کرتا ہے۔ جرمنی کا بیان مصنف نے کافی تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جرمن عورتوں کی شکل و شباہت، ان کا رہن سہن، جرمنوں کا عام کردار، جرمنی کے خوبصورت مناظر وہاں کی سیاسی، فضا، ہٹلر کی جرمنی میں یہودیوں کی حالت، ان تمام باتوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ جرمنوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''یہ بھاری بھدے جرمن بالعموم بے ضرر ہوتے ہیں۔ جب تک یہ بیئر پیتے رہتے ہیں۔ یہ بالکل محفوظ ہیں لیکن جہاں انھوں نے سوچنا شروع کیا تو ہوا میں اڑتے ہیں اور ان کی مابعد الطبیعات کسی کی سمجھ میں نہیں آتی۔ یا زمین پر کھیلنے لگتے ہیں اور اسی لیے ہتھیار اور سیاسی اسکیمیں بناتے ہیں یا سمندر میں غوطہ لگاتے ہیں اور یو بوٹ بناتے ہیں لیکن صلح کے ایام میں یہ قوم بالکل بے ضرر ہے۔''

جرمنی کے قدرتی مناظر کا بیان مثلاً لورے لائی کی چٹان، ہائیڈل برگ، دریائے نیکر، اشٹٹ گارٹ وغیرہ کا حال عزیز احمد کی بیانیہ قوت کا اچھا نمونہ پیش کرتے ہیں۔

مارگریٹ سے لطف اندوز ہونے کے بعد عزیز احمد کا 'یولی سیز' پھر سفر کا پرچم کھول دیتا ہے۔ وہ ناروے کا سفر کرتا ہے۔ ناروے کے خوب صورت شہروں اور وہاں کے قدرتی مناظر کا حال بیان کیا جاتا ہے۔ واپسی میں نعیم بلجیم کا سفر بھی کرتا ہے مگر یہاں اسے کوئی خاص بات نظر نہیں آتی۔ پھر وہ ہالینڈ کی طرف رخ کرتا ہے۔ بون، دریائے رہائن، بارن بارن فرائی برگ، ٹی ٹی زی، لنڈوکس ہافن، بوڈن زی،

ہوین شاون اور لائیزگ وغیرہ کے بیانات بالکل اس قسم کے ہیں جیسے سفرناموں میں ملتے ہیں۔ یہ اچھے اچھی بیانیہ نثر کے نمونے ضرور پیش کرتے ہیں مگر ساتھ ہی ناول میں سفرنامے کا رنگ بھی پیدا کر دیتے ہیں۔

'آگ' میں سیاحانہ بیانات زیادہ ہیں۔ اس کی ابتدا ہی 'زوجی لا' کی منظر کشی سے ہوتی ہے۔ ایک قافلہ گیارہ ہزار پانچ سو اٹھتر فٹ کی اونچائی پر سے گزرتا ہے۔ اس میں خواجہ 'غضنفر جو' کے آدمی اور سروے آف انڈیا کا ایک بنگالی بابو شامل ہیں۔ غریب بنگالی بابو کو اس قافلہ میں زبردستی گھسیٹ لائے ہیں اس کی شمولیت سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ ممکن ہے اسے مزاحیہ عنصر کی خاطر لایا گیا ہو۔ اس پہاڑ کا اور اس انتہائی دشوار گزار علاقے سے اس مختصر سے قافلے کے گزرنے کا منظر مصنف نے بڑی عمدگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہ منظر کشی کا بھی نہایت کامیاب نمونہ پیش کرتا ہے۔ یہ بیان صفحہ سات سے لے کر صفحہ

بیس تک پھیلا ہوا ہے۔ اولانش گرنے کا منظر اپنی پوری ہیبت ناکی کے ساتھ ہماری نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔

اس کے بعد مصنف ہمیں کشمیر میں لے آتا ہے۔ یہاں کی مشہور جھیل 'ڈل' اور مشہور تاریخی باغ شالامار کا منظر پیش کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بیانات 'شنیدہ' سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے بعد مصنف اپنے دوست میجر صاحب کی معیت میں کشمیر روانہ ہوتے ہیں۔ میجر صاحب راستے کے پہاڑوں پر اور ان کی جغرافیائی حیثیت پر تبصرہ کرتے ہیں۔ آگے چل کر جہلم کی خوبصورتی اور غلاظت کا تذکرہ کیا جاتا ہے پھر پیر پنجال، اونتی پورے اور بیج بہارا کے کھنڈروں کا حال، لدر کی وادی اور نشاط باغ کا بیان پیش کیا جاتا ہے۔ ان تمام مناظر میں سیاحانہ بیانات کا انداز نظر آتا ہے۔ ان کی نوعیت کا اندازہ لگانے کے لیے لدر کی وادی کا بیان ملاحظہ کیجیے:

''نیچے لدر بہ رہی تھی جیسے جیسے موٹر آگے بڑھتی گئی وادی تنگ ہوتی گئی۔ ندی کا شور بڑھتا گیا اور پہاڑوں پر دیودار اور زیادہ نظر آنے لگتے۔ دور دور کسی چوٹی پر برف کی مانگ سی نظر آجاتی۔ یہاں تک کہ ایک چھوٹے سے لکڑی کے پل سے آگے کچھ آبادی نظر آئی۔ وادی دفعتاً بڑی حسین معلوم ہونے لگی۔ ایک طرف دیوداروں کے ہجوم پر ابر کا ایک ٹکڑا اپنا سر ٹکرا رہا تھا۔ سامنے سے بے حد زور و شور سے بہتی ہوئی پتھروں سے سر دھنتی ہوئی

ندی، دو ندیاں بن گئیں۔ دو ندیاں جو مل کر ایک ندی بن جاتی ہیں اور بیچ میں ایک خوبصورت سا جزیرہ نما تھا جس پر دو تین مکان تھے اور پہل گام کی بڑی چوڑی سی سڑک چھوٹی چھوٹی گندی دوکانوں کے درمیان کچھ عجیب ہی معلوم ہو رہی تھی۔''۹۱

عزیز احمد کی منظر کشی اور بیانیہ قوت کی تعریف کشن پرشاد کول، سہیل بخاری، حسرت کاسگنجوی، ڈاکٹر احسن فاروقی اور انتظار حسین سب ہی نے بجا طور پر کی ہے۔

جہاں تک زندگی کی تصویر کشی کا تعلق ہے عزیز احمد کا شاہکار 'ایسی بلندی ایسی پستی' ہے۔ یہاں عزیز احمد کا موضوع حیدر آباد کا ایک مخصوص معاشرہ ہے۔ عزیز احمد نے حیدر آباد کے اس طبقے کو اپنی مکمل تہذیبی اور معاشرتی قدروں کے ساتھ زندہ جاوید کر دیا ہے۔ اس میں وہی فن کاری پائی جاتی ہے جو لکھنؤ کی تہذیب کے سلسلے میں 'امراؤ جان' میں نظر آتی ہے۔ 'امراؤ جان ادا' کی طرح یہ ناول بھی توازن کی اعلیٰ مثال پیش کرتا ہے۔ اس میں زندگی اور کردار ہم آہنگ ہو گئے ہیں۔ کردار زندگی سے ابھرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو کردار ذرا سی دیر کے لیے بھی نمودار ہوتا ہے اپنا نقش چھوڑ جاتا ہے۔ اصل قصہ کی ابتدا نور جہاں کے نانا قابل جنگ کے حالات سے ہوتی ہے۔ یہ اس زمانے کے آدمی تھے:

''جب سرسید سینے پر تمغے اور ستارے لگاتے تھے، حالی نثر میں بے تکلف انگریزی الفاظ استعمال کرتے تھے اور نذیر احمد کا ابن الوقت آکس ٹنگ کھاتا اور ابھی تائب نہیں ہوا تھا۔''۹۲

حیدر آباد میں مغربیت کس طرح درجہ بہ درجہ آ گئی اس کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ سلطان حسین اور نور جہاں کے زمانے تک یہ طبقہ مغربیت اور مشرقیت کا عجیب و غریب امتزاج بن چکا تھا۔ مدار المہام کا اور نظام کا قرب حاصل کرنے کے لیے کیسی کیسی ریشہ دوانیاں چل رہی تھیں۔ آپس میں کیسی کیسی رقابتیں تھیں اور ان رقابتوں کا ان کے خاندانوں پر کیا اثر پڑ رہا تھا۔ اعلیٰ کوثر نواز جنگ اور ذی جاہ جنگ کی رقابت کا نقشہ بڑی عمدگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ذی جاہ جنگ کے پاس دہری جاگیریں تھیں۔ اعلیٰ کوثر نواز جنگ اپنی محنت سے آگے بڑھے تھے۔

''ذی جاہ جنگ چھ فٹ لمبے بڑے گورے چٹے بارعب آدمی اور خاندانی جاگیردار تھے۔ ذی جاہ جنگ خان حضرت کے سوا کسی اور کے سامنے ہاتھ جوڑ کے بات نہ کرتے تھے۔''۹۳

ذی جاہ جنگ اس رقابت میں اس قدر الجھے رہے کہ وہ اپنی اولاد کی طرف توجہ نہ دے سکے۔ ان کی بدترین اولاد جو ان کی بدنامی کا باعث ہوئی وہ سروری تھی جو نور جہاں کے بھائی خاقان کو بیاہی گئی تھی:

''خاقان کا تقریباً ہر دوست اور کئی عزیز دعوے کرتے تھے کہ ان سے اور سروری سے تعلقات ہیں، فرخندہ نگر میں شولری کے اصول مغرب سے بہت مختلف ہیں۔ کسی عورت کی محبت کا راز فاش کرنا یا اس سے اپنے تعلقات کی غلط یا صحیح دعووں کا کھلم کھلا اعلان اپنی مردی مقبولیت مردانہ حسن اپنے استغنا کا اعلان اور اشتہار سمجھا جاتا ہے یہاں تک کہ سروری بے چاری اتنی بدنام ہوئی کہ لوگوں نے مشہور کیا کہ وہ آرڈرلیوں تک سے پھنسی ہوئی ہے۔ ایک رات جب وہ سیندھی پی کے ایک آرڈرلی سے اختلاط کر رہی تھی خاقان نے اسے خوب مارا۔ چیخ و پکار کی آواز سن کے ذی جاہ جنگ آئے اور انھوں نے بیٹی اور داماد دونوں کو راتوں رات گھر سے نکال دیا دونوں پھر الگ گھر لے کے رہنے لگے۔''۹۴

ان جاگیرداروں میں غیرت مندی کا یہ معیار تھا۔ انگریز عورتوں سے ان کی جو اولاد پیدا ہوتی تھی وہ دو آتشہ ہوتی تھی۔ قابل جنگ کے لڑکے محمود شوکت اور نیاز جو مس اسکرو کے بطن سے پیدا ہوئے تھے، دونوں چھٹے ہوئے بدمعاش تھے:

''اور خصوصاً نیازی کے نام سے تو سب واقف تھے۔ فرخندہ نگر کے باہر اپنے گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے یہ دونوں بھائی جوان وڑر اور کسان عورتوں کو اٹھا لے جاتے اور وڑر اور مزدور ان کے پیچھے دوڑتے پتھر مارتے اور تھک ہار کر خاموش ہو جاتے، یہاں تک کہ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد وہی عورتیں روتی اور اپنے کپڑے ٹھیک کرتی ہوئیں اپنے شوہروں اور بھائیوں کے پاس واپس آ جاتیں۔ شہر کی سڑکوں تک چلتے چلتے کسی ماما یا دھیڑنی یا لمباڑنی کے سینے پر ہاتھ پھیر دینا تو ان دونوں بھائیوں کا بڑا عام مشغلہ تھا۔''۹۵

اسی نیازی کی بیوی اپنے فیشن کے اخراجات کے لیے کسی اور سے پھنسی ہوئی تھی۔ نیازی اس سے واقف تھا اور دوسرے لوگ بھی واقف تھے۔ حیدر آباد میں جاسوسی کا جال بھی پھیلا ہوا تھا:

''اس زمانے کا یہ دستور تھا کہ خان حضرت کے جاسوس صاحب علی شان بہادر کے

یہاں اور صاحب عالی شان بہادر کے جاسوس خان حضرت کے یہاں عموماً متعین رہتے۔"[96]

اس حمام میں سب ہی ننگے تھے مگر پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کو برا کہنا؟ یہاں کی ایک عام روایت تھی۔ غیبت کی وبا عورتوں ہی میں نہیں بلکہ مردوں میں بھی پھیلی ہوئی تھی۔ اس طبقے کے مرد ہی انگریز عورتوں سے شادی نہیں کرتے تھے بلکہ ان کی عورتیں بھی انگریز مردوں سے شادی کر لیتی تھیں۔ اس قسم کی ایک عورت زینت رکاب جنگ ہے جو رکاب جنگ کی زندگی ہی میں فلرٹ کرتی تھی۔ اس کی موت کے بعد اس نے ایک انگریز لیوس سے شادی کر لی۔ شادی سے پہلے وہ اس کا پاندان اٹھائے اٹھائے پھرتا تھا۔ فرخندہ نگر میں زینت کو 'گندی بھینس' کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ وہ جنس کے معاملے میں بڑی آزاد خیال تھی۔ مردوں کو قابو میں کرنے کا گر اسے خوب آتا ہے۔ شادی کی وہ صرف اس لیے قائل ہے کہ "شادی دراصل ایک طرح کی کنوینیئنس کے لیے ہے۔"

اس جاگیردار طبقے میں ایسے مرد بھی ہیں جو اعتدال کے قائل ہیں۔ ان کی زندگیاں کامیاب ہیں۔ البتہ ایسے لوگ نسبتاً کم ہیں۔ حیدر محی الدین عرف جی آئی پی کا انجن جس کی رنگت اس کے عرف سے ظاہر ہو رہی ہے اسی قسم کا انسان ہے۔ اسے اپنی بیوی سر تاج سے بڑی محبت ہے۔ سر تاج بھی حیدر محی الدین کی بڑی وفادار ہے۔ حالانکہ یہ وفادار زیادہ تر اس کی جاگیر کی بنا پر ہے۔ سر تاج اور نور جہاں کا باپ سنجر بیگ انتہائی نیک انسان ہے جس کے بارے میں کوئی اسکینڈل مشہور نہیں تھا۔

اس طبقے کے بعض افراد گرمیوں میں مسوری بھی جاتے ہیں۔ خصوصاً سلطان حسین تو بڑا پرانا مسوریَن ہے۔ اس سلسلے میں مسوری کی زندگی بھی پیش کی جاتی ہے۔ یہاں ہمیں ایک عجیب خاندان بھی نظر آتا ہے۔ یہ بیگم مشہدی ہیں جو جج کی لڑکی اور جج کی بیوی تھیں۔ یہ خود سے آدھی عمر کے نوجوانوں کے ساتھ ناچتی تھیں اور اپنی لڑکیوں کو بھی نچواتی تھیں۔ اردو نہ یہ بول سکتی تھی نہ ان کی لڑکیاں۔ ان کی لڑکی جلیس کو کلمہ تک یاد نہ تھا۔ یہ ایک عیسائی سیموئیل سے محبت کرتی تھی مگر اس کی غیر موجودگی میں دوسروں کی گود میں بھی بیٹھ لیتی تھی۔

اب فرخندہ نگر کی زندگی کی ایک نہایت ہی اہم رکن کا حال بھی سن لیجیے یہ ہیں راجۂ راجایان شمشیر جنگ۔ یہ درحقیقت وہاں کے مدار المہام سر کشن پرشاد شاد ہیں۔ ان کی ایک تصنیف 'طلسم مقناطیس وکہربا' کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ اس میں کشن پلی کا منظر بالکل فسانۂ عجائب کی زبان میں بیان کیا گیا ہے۔

بہت ممکن ہے اس سے مراد 'چنچل نار' یا کوئی اور کتاب ہو جو انھوں نے اپنے نام سے کسی اور سے لکھوائی ہو۔ اس وقت ان کی عمر اسی سال کے قریب تھی۔ ذرا ان کا حال ملاحظہ ہو:

"خدا جانے ان آنکھوں کے پپوٹوں کے پیچھے اس دماغ کے خلیوں اور خانوں کے اندر کیا تھا۔ خان حضرت سے بے انتہا خلوص اور وفاداری غریبوں کی پرورش اور فیاضی امیروں سے اخلاق، مصاحبین سے مروت اور دنیا کی ہر عورت کے لیے محبت، چھوٹی رانی کی ترچھی راجپوتی آنکھوں کے لیے محبت۔ بیگم کی بڑی بڑی شرتی آنکھوں کے لیے میموں کے لیے محبت۔ دھیڑنیوں کے لیے محبت، دوسروں کی بہو بیٹیوں کے لیے محبت ماماؤں اور لونڈیوں کی ملگجی ساڑھیوں اور اوڑھنیوں کے لیے محبت۔"[97]

سر کشن پرشاد اور علامہ اقبال میں بڑے مراسم تھے۔ جوش ملیح آبادی علامہ اقبال کا خط لے کر ان کی خدمت میں پہنچے ہیں۔ وہ اس خط کی بنا پر اچھی طرح پیش آتے ہیں۔ جوش کا مختصر حلیہ بھی کس قدر دل کش ہے۔ یہ اس زمانہ کے جوش کا بڑا اچھا نقشہ پیش کرتا ہے۔

"نو وارد جو ذرا لاابالی سا آدمی تھا۔ اول جلول کپڑے آنکھیں چڑھی ہوئیں، صورت شراب خوروں کی سی مگر رندی کے ساتھ جلال اور وقار، اس نے اپنا نام بتایا شبیر حسین خاں جوش ملیح آبادی۔"[98]

انتظار حسین نے اس ناول کے متعلق ٹھیک لکھا تھا کہ:

"عزیز احمد نے اس طبقہ کی بلند و پست کو بہت سلیقہ اور نفاست سے پیش کیا ہے۔ ان کی باہمی رقابتیں اور رشک و حسد ایک دوسرے کے خلاف ریشہ دوانیاں، غرض وہ تمام باتیں، وہ تمام حرکتیں جن میں ان کی زوال آمادہ ذہنیت کا مظاہرہ ہوتا ہے بڑی پرکاری سے پیش کی گئی ہیں اور اس طرح کسی ایک فرد کی نہیں بلکہ ایک پورے طبقہ کی تصویر ہماری نگاہوں کے سامنے ابھر آتی ہے۔"[99]

محمد حسن عسکری نے اسے اردو کا پہلا اجتماعی ناول کہہ کر پکارا ہے۔ سہیل بخاری نے اس رائے میں تھوڑی سی معقول ترمیم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ "اس دور کا پہلا اجتماعی ناول ہے۔" خود عزیز احمد نے اسے تجرباتی ناول کہہ کر پکارا ہے۔ یہ ناول چاہے بقول 'عزیز احمد گالزوردی کے 'صاحب جائیداد' سے متاثر ہو یا احسن کے 'گڑیا کے گھر' سے مگر یہ مشابہت محض فارم کی حد تک ہے اور اس میں بھی عزیز احمد نے

کچھ ترمیم و اضافہ کرلیا ہے۔ اصل چیز وہ زندگی ہے جس کی پیش کش مصنف کے عمیق مشاہدے اور فن کاری کا ثبوت پیش کررہی ہے۔ اس اعتبار سے صرف 'امراؤ جان ادا' کو ہی اس ناول پر فضلیت دی جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ اردو کا کوئی ناول اس سے ٹکر نہیں لے سکتا۔

موضوع اور تکنیک سے بحث کرنے کے بعد ان کے ناولوں کے وسیلۂ اظہار (MEDIUM) کے بارے میں بھی گفتگو کرنا ضروری ہے۔ ریاض احمد چودھری نے اپنے مقالے میں 'ہوس' کے ابتدائی صفحات ہی سے زبان کی پندرہ غلطیاں نکالی ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ناول کا پہلا فقرہ ہی غلط ہے کہ ''اس رات کو چاندنی تھی'' مگر انھوں نے 'گریز' کی زبان اور انداز بیان کی تعریف کی ہے۔ انتظار حسین نے ''ایسی بلندی ایسی پستی'' کی بعض خوبیوں کو تسلیم کرنے کے بعد لکھا تھا کہ 'جہاں تک زبان و بیان کا معاملہ ہے تو یہ ناول بیان ہی بیان ہے اس میں زبان نہیں ہے۔ قوت بیان کا مظاہرہ جا بجا نظر آتا ہے لیکن ساتھ میں زبان کی خامیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔'' انتظار حسین کی یہ رائے بالکل درست تھی مگر عزیز احمد سے خفا ہوجانے کے بعد اس بات کو انھوں نے اس طرح بیان کیا ہے کہ ''عزیز احمد صاحب کے سلسلے میں ایک بات اور ہے وہ ناول نگری اردو میں لکھتے ہیں۔''

علی عباس حسینی کی متوازن رائے پر اس مضمون کو ختم کیا جاتا ہے۔ لکھتے ہیں:

''ان کی زبان بھی کسی حد تک نیم پختہ ہے۔ جنسیات کے بیان میں نامناسب افراط سے کام لیتے ہیں لیکن انھوں نے اس ناول میں انشا کے بیسوں ایسے جواہر پارے بھی پیش کیے ہیں جو ساری عمر کی پرستاری قلم کے بعد بھی کم ہی کو نصیب ہوتے ہیں۔''۲۲

✓

حواشی:

1. The Concise Oxford Dictionary of English Literature" Edition 1954, Page 567.
2. Longman's English Larousse, First Edition 1968, page 776.
3. Dictionary of World Literature, edited by Joseph T. Shipley, Published by The Philosophical Library, New York, Edition 1953, page 287
4. The Novel in France, Published by Hamish Hamilton, London, First Edition 1950, page ix.

5 افتتاحیہ 'ہوس' بعنوان 'بدتر از گناہ' شائع کردہ مکتبہ جدید لاہور بار سوم ۱۹۵۱ء، صفحہ ۱۵۶

6 ایضاً

7 ایضاً

8 مقالہ برائے ایم اے اردو، مملوکہ پنجاب یونی ورسٹی لائبریری، صفحہ ۳۷

9 افتتاحیہ ہوس بعنوان 'بدتر از گناہ' ص ۱۶۲

10 'مرمر اور خون' شائع کردہ مکتبہ جدید لاہور، بار دوم جولائی ۱۹۵۱ء، ص ۸۳

11 مقدمہ مرمر اور خون، ص ۷

12 افتتاحیہ 'ہوس' ص ۱۶۲

13 مضمون بعنوان 'اردو ناول کے پچیس سال' مشمولہ ساقی جوبلی نمبر ۱۹۵۵ء ص ۴۵

14 ناول کی تاریخ اور تنقید، شائع کردہ لاہور اکیڈمی لاہور، ایڈیشن ۱۹۶۴ء، ص ۳۱۹

15 نیا ادب، شائع کردہ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی بار اول، ۱۹۴۹ء، ص ۲۹۹

16 اردو ناول نگاری، ص ۱۹۹

17 'گریز' شائع کردہ مکتبہ جدید، لاہور، ایڈیشن ۱۹۶۱ء، ص ۲۷۷

18 ایضاً، ص ۲۴۳

19 گریز، ص ۲۸۹

20 ایضاً، ص ۲۰۷

21 آگ، ص ۲۰۷

۲۲ ایضاً، ص ۳۶

۲۳ ماہنامہ ساقی، کراچی بابت مئی ۱۹۵۲ء، ص ۵۰

۲۴ ایضاً

۲۵ ایضاً، دسمبر ۱۹۴۹ء، ص ۲۸

۲۶ ایضاً، اپریل ۱۹۵۳ء، ص ۵۳

۲۷ ناول کی تاریخ اور تنقید، شائع کردہ لاہور اکیڈمی، لاہور ۱۹۶۴ء، ص ۴۹

۲۸ نقوش، لاہور، شمارہ ۲۲-۲۱، اپریل ۱۹۵۲ء، ص ۲۳۳

۲۹ گریز، شائع کردہ مکتبہ جدید لاہور، ایڈیشن ۱۹۶۲ء، ص ۹۱

۳۰ ایضاً، ص ۸۸

۳۱ ایضاً، ۲۳۳

۳۲ ایضاً، ص ۱۱۲

۳۳ گریز، ص ۱۰۲

۳۴ ایضاً، ص ۱۰۳

۳۵ ایضاً، ۱۶۴

۳۶ ایضاً، ص ۱۶۶

۳۷ ایضاً، ۱۶۲

۳۸ ایضاً

۳۹ ایضاً، ص ۲۴۸

۴۰ ماہنامہ ساقی، جوبلی نمبر ۱۹۵۵ء، ص ۴۵

۴۱ ایضاً، ص ۹

۴۲ ایضاً، ص ۱۱

۴۳ ایضاً، ص ۱۶

۴۴ ایضاً، ص ۳۳

۴۵ ایضاً، ص ۲۷

۴۶ نیا ادب، ص ۳۰۷

۴۷ ایضاً، ص ۸

۴۸ ایضاً

۴۹ آگ، ص ۱۱۳

۵۰ ایضاً، ص ۲۱۰

۵۱ ایضاً

۵۲ ایضاً، ص ۲۰۵

۵۳ ایضاً

۵۴ ایضاً، ص ۲۰۸

۵۵ ایضاً

۵۶ ایضاً، ص ۲۷۱

۵۷ ایضاً، ص ۲۶۰

۵۸ ایک بلندی ایک پستی، شائع کردہ جدید لاہور، بار اول ۱۹۴۸ء، ص ۱۳۰

۵۹ ایضاً، ص ۷۶

۶۰ ایضاً، ص ۱۶۹

۶۱ ایضاً، ص ۱۸۶

۶۲ ایضاً، ص ۲۳۹

۶۳ ایضاً، ص ۳۹-۲۳۸

۶۴ ایضاً، ص ۵۵

۶۵ ماہنامہ ساقی، کراچی، دسمبر ۱۹۴۱ء

۶۶ شبنم، ص ۱۸۷

۶۷ ایضاً، ص ۷۳

۶۸ ایضاً، ص ۱۳۸

۶۹ ایضاً، ص ۱۲۰

۷۰ ایضاً، ص ۲۱۵

۷۱ ایضاً، ص ۲۶۴

۷۲ ایضاً،ص۲۵۰
۷۳ ایضاً،ص۲۵۹
۷۴ ایضاً،ص۸۴
۷۵ ایضاً،ص۱۰۹
۷۶ ایضاً،ص۱۱۰
۷۷ ایضاً،ص۱۶۹
۷۸ ایضاً،ص ۲۷۳
۷۹ ایضاً،ص ۲۷۴
۸۰ ایضاً،ص۲۸۰
۸۱ ایضاً،ص ۲۹۳
۸۲ ماہنامہ ساقی، کراچی مئی ۱۹۵۲ء ،ص ۵۲
۸۳ ایضاً، جون،ص۸
۸۴ ایضاً
۸۵ معیار، شائع کردہ نیا ادارہ لاہور، بار اول ۱۹۶۳ء ،ص ۸۴-۱۸۳
۸۶ اختتامیہ، ہوس،ص۱۷۶
۸۷ ایسی بلندی ایسی پستی، مکتبہ جدید لاہور، بار اول ۱۹۴۸ء ،ص ۳۳۶،
۸۸ ایم اے اردو کا غیر مطبوعہ مقالہ،ص ۸۲
۸۹ اختتامیہ، ہوس،ص۱۶۶
۹۰ ایضاً،۱۹۵۱ء ،ص۶۵-۱۶۴
۹۱ آگ شائع کردہ، مکتبہ جدید لاہور، بار دوم،۱۹۵۶ء ،ص۱۶۷
۹۲ ایضاً،ص۱۳۶-۱۳۱
۹۳ ایضاً،ص ۱۳۳
۹۴ ایضاً،ص۵۶
۹۵ ایضاً،ص۱۳۶
۹۶ گریز، مکتبہ جدید لاہور، زندہ کتابیں، ایڈیشن ۱۹۶۲ء ،ص۲۱۶

۹۷ آگ، مکتبہ جدید لاہور، بار دوم،۱۹۵۶ء ،ص ۲۸۰
۹۸ نیا ادب،ص۲۸۹
۹۹ اردو ناول نگاری،ص۱۹۸
۱۰۰ پاکستان کے ممتاز ناول نگار، عزیز احمد، ماہنامہ کراچی، ستمبر ۱۹۶۵ء ،ص ۲۷
۱۰۱ اردو ناول کے پچیس سال، ماہنامہ ساقی، جوبلی نمبر ۱۹۵۵ء ،ص ۳۵
۱۰۲ ماہنامہ ساقی کراچی، دسمبر ۱۹۳۹ء ،ص ۲۸
۱۰۳ ایسی بلندی ایسی پستی،ص ۱۷
۱۰۴ ایضاً،ص ۱۳
۱۰۵ ایضاً،ص ۳۵
۱۰۶ ایضاً،ص ۳۶
۱۰۷ ایضاً،ص ۱۹۳
۱۰۸ ایضاً،ص۱۹۷
۱۰۹ ایضاً،ص۱۰
۱۱۰ ایضاً
111 ماہنامہ ساقی، کراچی، دسمبر ۱۹۶۹ء ،ص ۲۸
112 ایضاً " ستمبر ۱۹۶۵ء
113 اردو ناول نگاری،ص۱۹۵
۱۱۴ اختتامیہ، ہوس،ص۱۶۶
۱۱۵ ماہنامہ ساقی کراچی، دسمبر ۱۹۳۹ء ،ص ۲۹
۱۱۶ ایضاً،ص ۱۹۵۲ء ،ص۵۰
۱۱۷ ناول کی تاریخ اور تنقید،ص۳۹۱

(پروفیسر عبدالسلام صدیقی کی کتاب "اردو ناول بیسویں صدی میں" سے لیا گیا ہے)



چند تالیفات ڈاکٹر ارتضیٰ کریم



GUREZ (Novel)
By:AZIZ AHMAD



۹۷ آگ، مکتبہ جدید لاہور، بار دوم، ۱۹۵۶ء، ص ۲۸۰

۹۸ نیا ادب، ص ۲۸۹

۹۹ اردو ناول نگاری، ص ۱۹۸

۱۰۰ پاکستان کے ممتاز ناول نگار، عزیز احمد، ماہنامہ کراچی، ستمبر ۱۹۶۵ء، ص ۲۷

۱۰۱ اردو ناول کے پچیس سال، ماہنامہ ساقی، جوبلی نمبر ۱۹۵۵ء، ص ۴۵

۱۰۲ ماہنامہ ساقی کراچی، دسمبر ۱۹۳۹ء، ص ۲۸

۱۰۳ ایسی بلندی ایسی پستی، ص ۱۷

۱۰۴ ایضاً، ص ۱۳

۱۰۵ ایضاً، ص ۳۵

۱۰۶ ایضاً، ص ۳۶

۱۰۷ ایضاً، ص ۱۹۳

۱۰۸ ایضاً، ص ۱۹۷

۱۰۹ ایضاً، ص ۱۰

۱۱۰ ایضاً

111 ماہنامہ ساقی، کراچی، دسمبر ۱۹۶۹ء، ص ۲۸

112 ایضاً " ستمبر ۱۹۶۵ء

113 اردو ناول نگاری، ص ۱۹۵

۱۱۴ اختتامیہ، ہوس، ص ۱۶۶

۱۱۵ ماہنامہ ساقی کراچی، دسمبر ۱۹۳۹ء، ص ۲۹

۱۱۶ ایضاً، ص ۱۹۵۳ء، ص ۵۰

۱۱۷ ناول کی تاریخ اور تنقید، ص ۳۹۱

(پروفیسر عبدالسلام صدیقی کی کتاب "اردو ناول بیسویں صدی میں" سے لیا گیا ہے)

